بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی

مسیر گل نصیر

بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی

میر گل خان نصیر

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

جملہ حقوق بحق بلوچی اکیڈمی محفوظ ؛

بار اوّل ... . مئی ۱۹۷۶ء

تعداد ... . ایک ہزار

قیمت ... . پندرہ روپے

طابع ... . قلات پریس کوئٹہ

ناشر ... . بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

فہرست مندرجات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	پہلا باب (نقل مکانی)	
۱	براہوئی یا بروہی	۱
۲	ناروئی	۳
۳	رند	۳
۴	براہوئیوں کی آمد	۹
۵	رندو لاشار کی یلغار	۱۹
۶	گوہر کی اونٹنیوں کا قضیہ	۳۱
۷	میر چاکر اور میر گواہرام کی نوک جھونک	۵۸
	دوسرا باب (چار قول)	
۸	حیبتاں کی آزمائش	۷۷
۹	جاڑو جلب کی آزمائش	۸۱

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
۸۶	شے مُرید کی آزمائش	۱۰
۹۲	چاکر کی آزمائش	۱۱
۹۳	حانی شے مرید کی داستانِ عشق	۱۲
	تیسرا باب	
۱۳۷	بیبکر کے رومان	۱۳
۱۳۹	بیبکر و گراں ناز	۱۴
۱۵۵	بیبکر و سدو	۱۵
۱۶۱	بیبکر و ملی	۱۶
۱۶۹	بیبکر کے نصائح	۱۷
	شہداد چاکر کی روایات	
۱۷۵	تخلیق عالم	۱۸
۱۸۰	شہداد اور دہلی کی لڑائی	۱۹
۱۹۰	شہداد و ماہ ناز	۲۰

عنوان	صفحہ نمبر
چوتھا باب	
بالاچ منتقم کی رزم آرائیاں	۱۹۹
حمل جئیند کی داستان	۲۲۸
حمل اور شیر کی لڑائی	۲۳۱
میر حمل اور چاکر کہدائی کی نوک جھونک	۲۴۲
میر حمل اور پرتگیزوں کی لڑائی	۲۵۲
پانچواں باب	
سسی پنوں	۲۶۳
توکلی مست اور سمو	۲۸۶

تعارف

زیر مطالعہ کتاب کے مؤلف میر گل خان نصیر نہ صرف بلوچستان میں بلکہ ملک بھر میں جانی پہچانی شخصیت کے مالک ہیں۔ آج سے تقریباً تیس سال قبل ان کی پہلی اردو تصنیف "تاریخ بلوچستان" جلد اول منظر عام پر آئی۔ اس طرح انھوں نے اس موضوع پر لکھنے والے معاصرین پر سبقت حاصل کی۔ اگرچہ انکی یہ تصنیف اس سے تین چار سال پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی، لیکن مالی وسائل کی کمیابی کے سبب اشاعت سے طباعت سے محروم رہی۔ اسی سلسلے کی دوسری جلد بائیس تیئیس سال پہلے طبع ہو چکی ہے۔ اسی دوران میں ان کا پہلا بلوچی مجموعہ کلام "گلبانگ" کے نام سے شائع ہوا، جبکہ بلوچی زبان کی معیار حتیٰ املا کے آداب و قواعد بھی مکمل نہیں ہو پائے تھے کیوں کہ اس وقت تک بلوچی زبان وسیع ادبی ورثہ اور ذخیرۂ الفاظ سے مالا مال ہونے کے باوصف تحریر و املا کی تشکیل سے محروم تھی۔ اس طرح بلوچی تصنیف و تالیف کے سلسلے میں بھی انہیں اپنے معاصرین پر اولیت حاصل ہے۔

اس مختصر سے تعارف میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ میر گل خان نصیر اردو اور بلوچی کے علاوہ فارسی اور براہوی زبانوں پر بھی پورا عبور رکھتے

ہیں۔ اگرچہ وہ کالج کی تعلیم مکمل کر کے گریجویشن کی سند حاصل نہ کر سکے، کیونکہ بعض ناگزیر وجوہ کی بناء پر انہیں کالج کی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر لاہور سے واپس آنا پڑا، لیکن خداداد ذہانت اور کثرتِ مطالعہ کی بدولت انہیں انگریزی زبان پر بھی خاصی دسترس حاصل ہے۔

میر گل خان نصیرؔ سے مجھے ذاتی اور ذہنی رفاقت کا شرف ۱۹۳۵ء سے حاصل ہے۔ انہوں نے نثری اور شعری تخلیقات کا آغاز اردو میں کیا۔ فارسی میں انہوں نے چند معاصر اور چند پیشرو اساتذہ کے کلام پر نہایت خوبصورت تضمینیں لکھیں جو بلوچستان سے شائع ہونے والے اخبارات میں چھپتی رہیں۔ چونکہ اس دور میں سامراج دشمن تحریکیں اپنے عروج کو پہنچ چکی تھیں اور برصغیر کے بہت سے ترقی پسند شاعر اور ادیب ان تحریکوں سے متاثر ہو کر روایتی شاعری کے بجائے حریت پسندی اور قوم پرستی پر مبنی افکار و خیالات کو اپنی تخلیقات میں سمو کر شہرت و مقبولیت حاصل کر رہے تھے، اس لئے میر گل خان نصیرؔ نے بھی شاعری کے روائتی انداز میں موزونیٔ طبع دکھلانے کی بجائے براہ راست قوم پرستی اور سامراج دشمنی کو موضوعِ سخن بنایا، جس کی بدولت ایک مختصر سی مدت میں انہیں وہ مقبولیت حاصل ہوئی، جو بلوچستان کے کسی شاعر یا ادیب کے حصے میں نہیں آسکی۔

غلامی کے طویل دور کے خاتمے کے بعد سماجی شعور نے ان کی سوچ کے دھارے کا بہاؤ بڑی حد تک قوم پرستانہ جذبات کے

ساتھ ساتھ انسانیت اور آفاقیت کی طرف موڑ دیا۔ ان کے طبقاتی رجحان کی آئینہ دار مشہور اردو نظم مدراج کرے سردار" اسی دور کی تخلیق ہے جو آج تک زبان زدِ عام ہے۔ انہوں نے ابھی تجدد وارتقاء کی شاہراہ پر قدم رکھا ہی تھا کہ پاکستان کے تمام صوبوں میں لسانی تحریک کی داغ بیل پڑنے لگی جسے بہت جلد حکومت کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی۔ چونکہ اس میدان میں وہ شعوری طور پر پہلے سے تیار تھے اور حالات کا تقاضا بھی یہی تھا، اس لیے انہوں نے اپنی تمام شعری صلاحیتیں بلوچی زبان کی ترویج و ترقی پر مذکور کر دیں۔ چنانچہ "گلبانگ" کے بعد "شیریں دوستین" "شپ گروک" "حمل جیئند" "گرند" وغیرہ کے نام سے ان کے بلوچی کلام پر مشتمل کئی مجموعے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ البتہ اس اثناء میں ان کی ایک کتاب "کوچ و بلوچ" کے نام سے اردو میں بھی شائع ہوئی: جو ایک انگریز محقق مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز کی انگریزی تصنیف "بلوچ قبائل" کا ترجمہ ہے۔ جس پر میر گل خان نصیر نے بڑے تفصیلی اور معلوماتی حواشی تحریر کیے ہیں۔ یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ مذکورہ بالا کتاب کا ترجمہ جناب کامل القادری نے بھی کیا ہے جسے "بلوچی دنیا" ملتان کے ایک خصوصی شمارے کی صورت میں اور مابعد کتابی صورت میں شائع کیا جا چکا ہے اور اتفاق سے دونوں تراجم پر نظر ثانی کا شرف اس ناچیز کو حاصل ہے۔

لسانی تحریک سے متاثر ہونے کے تحت جہاں میر گل خان نصیر نے اپنی شعری تخلیقی صلاحیتوں کو بلوچی کی طرف منتقل کیا، وہاں انہوں نے قدیم و متوسط دور کے شعراء کی تخلیقات کا ایک گراں قدر ذخیرہ مختلف ذرائع سے اپنے پاس جمع کیا۔ یہی نہیں بلکہ بہت سی معروف رزمیہ اور عشقیہ نظموں کو اردو پڑھنے والوں سے ترجمے کی صورت میں متعارف کرایا، جو مختلف اوقات میں مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوتی رہیں۔

"بلوچستان کی کہانی، شاعروں کی زبانی" ان کی ان ہی کاوشوں کی ایک کڑی ہے۔ عنوان کی مناسبت سے مولف نے جن نظموں کا انتخاب کیا ہے، اس سے ان کی وسیع المشربی اور ذوقِ سلیم کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ کے موضوع پر ان کی تحقیق اور انداز تحریر پر اختلاف رائے کی گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن زیرِ نظر تالیف میں کسی قسم کے اختلاف یا تضاد کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ جہاں انہوں نے مختلف نظموں میں کارفرما کرداروں کی اچھائیوں کو اجاگر کیا ہے، وہاں بعض برائیوں اور خامیوں پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ جب کہ آج تک ان موضوعات پر لکھنے والے بیشتر اہل علم حضرات نے صرف مثبت اور روشن پہلو کو ہی نمایاں کرنے پر زورِ قلم صرف کیا ہے۔

اس طرح میر گل خان کی اس تالیف کے بارے میں، میں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے سیاسی کردار

ونظریات کے تضاد کے باوجود، یہ ایک ایسی کتاب ہے، جو ہر قسم کے ذہنی اور سیاسی تعصبات سے پاک ہے۔ اس میں جہاں کلاسیکی شاعری میں بیان کیئے گئے روایاتی پس منظر کے مثبت اور منفی، دونوں پہلوؤں کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی گئی ہے، وہاں پہلی بار اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے بلوچوں کی والہانہ عقیدت و ارادت کا سراغ شعری روایات کے حوالے سے پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بلوچ ظہور اسلام کے ابتدائی ایام ہی سے دین اور بانیٔ دین کے وفادار رہے ہیں۔ اور شروع ہی سے مجاہدانہ کردار انجام دیا ہے۔ ان نقلوں کے مندرجات کو تاریخی سند دینے پر نہ مؤلف کو اصرار ہے اور نہ مجھے۔ ان کی حیثیت کا تعین شاعروں کے پرواز تخیل اور عہد ماضی کے بلوچ معاشرے اور ان کی تہذیبی اقدار کی روشنی میں کرنا چاہیئے، جیسا کہ براہوئیوں کی آمد کے عنوان تلے خود مؤلف کا کہنا ہے کہ "تاریخی حقائق جو بھی ہوں، ہمیں ان سے یہاں بحث نہیں۔ ہم بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی بیان کرنے کا تہیہ کیئے ہوئے ہیں"۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ مختلف مقامات پر کیا ہے۔ گویا مؤلف تاریخی صداقتوں اور شاعرانہ تعلیوں کے فرق کو بخوبی سمجھتے ہیں۔

ذاتی دوستی اور محبت کے رشتے سے چونکہ مؤلف کا یہ

حکم ہے کہ میں ان کی اس کتاب پر مختصر سا تعارف لکھوں۔ اس لئے بطور امتثالِ امر یہ چند سطور سپردِ قلم کی گئیں۔

کوئٹہ ۲۷ مئی ۱۹۷۶ء

محمد بیاہ
وائس چیئرمین بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

پہلا باب

نقلِ مکانی:- بلوچ کی نسلی تاریخ اب تک منظرِ شہود پر نہیں آئی ہے کچھ مورخ بلوچ کو آرین نسل سے خیال کرتے ہیں اور کچھ اُسے کلدانی ٹھہرا کر سامیوں سے جا ملاتے ہیں۔ بہرحال بلوچ کی صحیح نسل کونسی ہے، یہاں اُس سے بحث کرنا ہمارا مدعا نہیں۔ اِس سلسلہ میں ہم جو بیان کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ اپنی نسلی تاریخ و روایات کے بارے میں ہمارے متقدمین و متاخرین بلوچ شعراء کی رائے کیا رہی ہے۔ اور انہوں نے شاعرانہ تعلی اور اسلوب سے کام لے کر اُسے بیان کیسے کیا ہے؟

اِس حقیقت کو غالباً سب مورخ تسلیم کرتے ہیں کہ بلوچ من حیث القوم تین بڑے بڑے حصوں یا طائفوں میں تقسیم ہے۔ اوّل براھوئی یا بروھی، دوئم ناروئی اور سوئم رند۔ اِن میں سے دو طائفوں، براھوئی اور رند سے متعلق قدیم بلوچ شعراء کا خیال ہے کہ یکے بعد دیگرے مختلف ادوار میں اس سرزمین پر آئے اور آباد ہوئے جہاں۔ ناروئی اُن سے بہت پہلے آباد تھے۔

براھوئی یا بروھی:- بلوچوں کے اس بہادر اور جنگجو طائفہ کو بعض مورخ دراوڑوں کی نسل سے سمجھتے ہیں۔ یہ رائے اُنھوں نے غالباً براھوئی زبان کی مناسبت سے قائم کی ہے، جس میں کہا جاتا ہے کہ جنوبی ہند کی

تلگو اور تامل وغیرہ دراوڑی زبانوں کے الفاظ ملتے ھیں لیکن آثارِ قدیمہ کے جدید انکشافات کی رُو سے یہ نقطۂ نظر اب تقریباً غلط ثابت ہو چکا ہے۔ افغانستان سے جو قدیم مسکوکات برآمد ہوئے ہیں ان سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ھے کہ براھوئی دراوڑ نہیں بلکہ ترکوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جو تاریخ میں کوشانی کے نام سے مشہور ہے۔ ان مسکوکات پر مندرج قدیم کوشانی زبان اور براھوئی زبان میں جو شابہت پائی گئی ہے وہ اس کے دراوڑی نسل سے ہونے کے معروضے کو کلیتاً رد کردیتی ھے۔ بہرحال یہ ایک اور موضوع ہے جو سردست ہمارے زیرِ بحث نہیں

ھم سمجھتے ہیں کہ اسم براھوئی یا بروھی دراصل بلوچی لفظ "برزکوھی" کی جس کے معنی ہیں "اونچے پہاڑوں کے رہنے والے" بگڑی ہوئی صورت ہے چنانچہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ براھوئی دراصل اُن کوشانیوں کی اولاد ہیں جو کوچ و بلوچ کہلاتے تھے اور جو ایران کے مشہور پہاڑ البرز کے گرد و نواح میں آباد تھے اور بقولِ فردوسی جن پر نوشیرواں بادشاہ نے فوج کشی کی اور اُن کا قتلِ عام کیا۔

کوہ البرز کی گھاٹیوں سے بھاگ بھاگ کر یہ لوگ رفتہ رفتہ وادیٔ قلات اور گرد و نواح کے پہاڑوں میں آکر پناہ گزین ہوئے اور بالآخر یہاں پر ہی مستقل بود و باش اختیار کرلی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس سرزمین پر "مش دارا" یعنی پہاڑوں والے دیوتا کے پرستاروں کی حکومت تھی۔ یہی "مش دارا" جو لعبد میں بگڑتے بگڑتے مشل اور پھر "شیوا" اور "سیوا" بنا کوشانیوں کا بھی دیوتا تھا۔ لعبض مورخ "مش دارا" کو "نمرود" کی شبیہہ سمجھتے ہیں۔ اُن کی رائے میں "نمرود بیلوس" اور "مشن دارا" ایک ہی دیوتا کے دو نام ہیں[1]۔

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "کوچ و بلوچ"

۲۔ ناروئی:۔ مورخوں نے ناروئی کے لفظی معنی "میدانی علاقوں کے رہنے والے لوگ" بتلائے ہیں۔ یہ لوگ "زابلستان، سیستان، گرم سیل اور ماشکیل کے میدانی علاقوں اور وادیوں میں ہر دور ایام سے آباد چلے آتے ہیں۔ ایشیا کی قدیم تواریخ میں سطح مرتفع ایران میں جن بلوچوں کا ذکر اکثر ملتا ہے وہ یہی ناروئی بلوچ ہیں جن کی جنگ جوئی اور جفاکشی کی داستانوں سے تاریخ ایران وسیستان کے صفحات رنگین ہیں۔ شاہنامہ کا عظیم پہلوان رستم بن زال جن کے متعلق فردوسی کہتا ہے کہ :۔

منش کردہ ام رستم داستان
وگرنہ یلے بود در سیستان

سیستان کے اسی ناروئی طائفہ کے ماسنی قبیلہ کا ایک فرد تھا

۳۔ رند:۔ یہ بلوچوں کا وہ مشہور و معروف طائفہ ہے جس کے معنی ہی بلوچ کے ہیں۔ یہ طائفہ بجا طور پر اپنے کو دوسرے تمام بلوچ طائفوں سے افضل اور اعلیٰ خیال کرتا ہے۔ کیونکہ اسی طائفہ نے بلوچوں کو وہ فصیح و بلیغ زبان دی ہے۔ جو ان کے علمی و ادبی سرمایہ کی بنیاد مانی جاتی ہے۔

رندوں کے متعلق عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خلیفہ یزید بن معاویہؓ کے عہد تک وردی حلب (عراق) میں بود و باش رکھتے تھے۔ جب یزید اور حضرت امام حسینؓ کے درمیان لڑائی چھڑی تو رندوں نے یزید کے خلاف حضرت امام حسینؓ کا ساتھ دیا۔ امام حسینؓ کی شہادت کے بعد وہاں سے ہجرت کر کے جگین کے علاقہ میں آئے۔ جو کرمان کے نواح میں واقعہ ہے، یہاں سے پھر انھوں نے مکران کی طرف ہجرت کی اور پھر وہاں سے سیوا کے دیس "بل اُک ستان"[1] یعنی شور بج دیوتا

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "کوچ و بلوچ"

کے وطن" میں آئے جو غالباً اس زمانہ میں موجودہ قلات کے اضلاع سراوان و جھلاوان پر مشتمل تھا۔ کچھ عرصہ یہاں پر رہنے کے بعد انھوں نے جام نندہ کے علاقہ کچھی کا رُخ کیا اور اس پر قابض ہو گئے۔

بہرحال بلوچوں کی ان روایات کی تاریخی حیثیت جو بھی ہو۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بلوچی شاعری کو رندوں نے ہی پروان چڑھایا اور ترقی دی یہ غالباً سولھویں صدی عیسوی کا وہ زمانہ تھا جب کہ رند و لاشار قبائل، گوہر نامی ایک جتنی حسینہ کی اونٹوں کے بہانے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے ممکن ہے کہ میر چاکر رند کے زمانے سے قبل بھی بلوچی زبان میں شعر و شاعری ہوئی ہو مگر اس وقت ہمارے ہاں سینہ بسینہ یاد چلے آنے والے اشعار کا جو سرمایہ ملتا ہے اس میں میر چاکر کے زمانے سے .... قبل کے کسی بلوچ شاعر کا کلام نہیں ملتا۔

مقامِ حیرت ہے کہ جو بلوچ گویئے میر چاکر رند اور میر گواہرام لاشاری کے زمانے کے اشعار، پشت در پشت سینہ بسینہ آج تک منتقل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ میر چاکر کے دور سے ماقبل کے اشعار کا سلسلہ اُن کے آباد اجداد جاری کیوں نہ رکھ سکے؟ اگر، یہ کہا جائے کہ بلوچی شاعری کی ابتدا ہی میر چاکر کے زمانے میں ہوئی تب بھی اس دور کی بلوچی شاعری میں زبان کی فصاحت و بلاغت اور سلاست و روانی کو جانچنے اور پرکھنے کے بعد اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ ایک ایسی فصیح و بلیغ زبان، دور و زمان کی کسوٹیوں سے گذرے بغیر اچانک بول روان ہوئی ہو۔ ہمیں مجبوراً یہ ماننا ہی پڑے گا کہ سیاہ ہوش اور الملش وغیرہ بلوچ مشاہیر کے قدیم زمانے سے لے کر میر جلال خان کے زمانے تک بلوچی کے شاعر ضرور ہوئے ہوں گے۔ انھوں نے اشعار بھی کہے ہوں گے لیکن بعض وجوہ کی

پر جن کی اس وقت ہم نشان دہی کرنے سے عاجز ہیں اُن شعراء کے اشعار ہم تک نہیں پہنچ سکے۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس وقت ہمارا مدّعا بلوچوں کی نسلی اور قومی تاریخ مرتّب کرنا نہیں اور نہ ہی بلوچی کے شعرا کا تذکرہ ہمارا مقصد ہے بلکہ ہمارا مدّعا بلوچ شاعروں کی صرف ان عشقیہ، رزمیہ اور تاریخی نظموں کے ذریعے بلوچوں کی اُن قومی روایات پر روشنی ڈالنا ہے جن کا ذکر سولھویں صدی عیسوی سے اب تک اُن کے اشعار میں ملتا ہے۔

بلوچ کے مذہبی عقائد کے بارے میں اگر ہم جرأت کر کے یہ کہدیں کہ بلوچ من حیث القوم عقیدے کے لحاظ سے نہ سُنّی ہے اور نہ شیعہ، صرف مسلمان ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ بلوچوں کا دعویٰ ہے کہ اُنھوں نے نہ صرف کربلا میں یزید کے خلاف حضرت امام حسینؓ کا ساتھ دیا۔ بلکہ اُن دنوں جب کہ محمدؐ الرّسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بے یار و مددگار تھے انھوں نے اپنے قبائل سے پانچ بہادر بلوچ منتخب کر کے رسول اللہ کی حفاظت کو مکہ بھیجے۔ ایک بلوچ شاعر کہتا ہے:۔

جکّتہ پنچ مرد بلوچین	پانچ بہادر بلوچ
گوں رسول ءِ شاملی ءَ	رسول اللہؐ کی خدمت میں کھڑے تھے
دوست نماز ءَ کہ پڑھگن	جب خدا کے دوست نماز پڑھتے
سر کنتی پانگی ءَ	تو وہ پہرہ دیا کرتے تھے
جنگ اڑِتہ گوں کفاراں	جب کفار کے ساتھ لڑائی چھڑی
شہ حساب ءَ زیادھی ءَ	کفار کا لشکر بے شمار تھا
ترو نکلی تیر ءِ شلیاں	تیر اولوں کی طرح برسے

در کپاں ڈالوڈ زمی ءَ	اور زمین سے دھواں اٹھنے لگا۔
جکبتش ایماں من ھند ءَ	مگر وہ (پانچوں بلوچ) ثابت قدم رہے اُن کا ایمان قائم رہا
ڈنمنگ ءَ نہ اِشتش وتی ءَ	دشمن ان کو مغلوب نہ کرسکا
تنگویں تمبے بلوچار	اس دن پاک نبیؐ نے
دا تہ آ رودچ ءَ نبیؐ ءَ	بلوچ کے سر پر طلائی تاج رکھا

شاعر آگے چل کر کہتا ہے کہ جب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہی کا زریں تاج بلوچ کے سر پر رکھا اس زمانے میں، بلوچستان پر کردوں کی حکومت تھی جن سے بلوچوں کے بہادر مری قبیلہ نے حکومت کا جھنڈا چھین لیا۔ شاعر کے الفاظ میں :۔

کیرد ءِ جھنڈا جکتی ئیں	کرد کا جھنڈا بلند تھا
جمبتہ پُلیں مری ءَ	جسے مری نے اُچک لیا
بیتہ دو دکھت من وتن ءَ	وطن پر دو دفعہ بلفتیوں
بُلفتی، گوں کلمتی ءَ	اور پھر کلمتیوں کی حکومت رہی ہے
شیدو پشت ءُ بیتہ کوپچین	اُن کے بعد کوپ چین[1] حاکم ہوئے
آئی نشکنت زاھری ءَ	اُن کے آثار اب بھی ظاہر ہیں۔

---

1 کوپ چین: کُچ : کفش : کوش، کوچ ۔ ملاحظہ ہو۔ مصنف کی کتاب "کوچ و بلوچ"

یہاں پر یہ امر واضح رہے کہ بلوچ کرد کو بھی اپنی ایک شاخ سمجھتے ہیں اور عراقی کرد براھوی طائفہ کو اپنا ایک قبیلہ شمار کرتے ھیں[1]۔ غالباً اسی مناسبت سے بلوچستان کے اکثر علاقوں کے باشندے براھوی زبان کو کُردی کہتے ھیں حالانکہ، براھوئی اور کردی زبانوں میں کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ اس کے برعکس بلوچی اور کُردی زبانیں ایک دوسرے سے بہت قریبی تعلق رکھتی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ھے کہ براھوئی، بلوچ اور کُرد دراصل ایک ھی نسل کے لوگ ہیں۔ اور ان کی زبانوں میں اختلاف کی وجہ نسلی نہیں بلکہ جغرافیائی ہے۔ چونکہ اس وقت یہ ہمارا موضوع بحث نہیں اس لئے ہم زیادہ تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔

بہر حال تلفتی، کلمتی اور مرّی بلوچوں کے مشہور و معروف قبائل ہیں البتہ کوپ چین سے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کون لوگ تھے بلوچستان کے قبائل ہیں اس نام کا کوئی قبیلہ اب موجود نہیں۔ غالباً کوپ چین وہی لوگ ہونگے جن کا فردوسی کے شاھنامہ میں کوچ کے نام سے ذکر آیا ھے۔ اگر ایسا ہو، تب ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوپ چین بھی بلوچ تھے، کیونکہ کوچ اور بلوچ دو ایسے ہم نسل قبائل تھے، جو ساتھ ساتھ بود و باش رکھتے تھے اور جن کی شجاعت و جنگجوئی کی "گردانِ کوچ و بلوچ" کے نام سے فردوسی نے ستائش کی ھے۔

آثار قدیمہ کے جیلے شواھد کی رُو سے جو موجودہ افغانستان کے بعض علاقوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ اور قدیم عرب مؤرخین مثلاً "اصطخری" ابن حوقل وغیرہ کے بیانات کی روشنی میں اگر ہم یہ کہیں کہ نام "کوچ" دراصل "کوش" ہے جسے بعض مورخین "گفش" اور بعض نے "کیچ" بھی لکھا ہے۔ تو ہم غلط نہ ھوں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ "کوچ" درحقیقت وہ کوشانی ترک ہیں۔ جن کا پہلا بادشاہ کجولا کدفیزا اور آخری بادشاہ دیری رام

[1] "تاریخ مردِ دانا" (؟)۔

یا بہرام تھا۔ جو تاریخ ایران میں بہرام گور کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کی حکومت کا ساسانیوں نے تختہ اُلٹ دیا تھا[1]۔ عرب مؤرخین کا اسماء نکرہ کو بگاڑ کر معرب کرنا ایک عام طریقہ رہا ہے۔ اسی لحاظ سے کوچ کا قفص بنا قرین قیاس ہے۔ ممکن ہے یہی نام ایرانی زبانوں میں آکر کپچ اور بلوچستان میں آکر کپ چین یا کوپ چین بنا ہو۔

بلوچستان کے بعض تاریخی آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوشانی جن کو بلوچ گنور بھی کہتے ہیں۔ یہاں کے قدیم باشندے تھے۔ ان کا آخری بادشاہ دیرلام یا بہرام بھی غالباً اسی مناسبت سے بہرام گنور مشہور تھا۔ یہ گنور ساسانی دور میں آکر غلط العام طور پر گور بنا اور فردوسی نے بھی کوشانیوں کے اس آخری بادشاہ کو دیری رام گنور کی بجائے بہرام گور کے نام سے یاد کیا۔ گنور بلوچی زبان میں ھندو کے لئے بھی مستعمل ہے۔ بہر حال کہا جاتا ہے کہ یہ گنور بڑی قدآور مضبوط البدن۔ جنگجو اور جفاکش لوگ تھے۔ مال مویشی پالتے اور کہیں کہیں زراعت کا بھی شغل کیا کرتے تھے۔ بلوچستان کے مختلف مقامات بالخصوص جھلاوان کی پہاڑی ندیوں پر ان محنت کش لوگوں نے پتھروں کے جو بڑے بڑے بند باندھے ہیں۔ اُن کے منتشر آثار اب تک باقی ہیں۔ جن کو یہاں کے مقامی باشندے اب بھی "گنور لبت" یعنی گنوروں کے باندھے ہوئے بند کہتے ہیں۔ بلوچستان سے متعلق آثار قدیمہ کی تحریروں میں ان گنور لبتوں کی تفصیلات ملتی ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "کوچ و بلوچ"۔

براھوئیوں کی آمد

تاریخی حقائق جو بھی ہوں ہیں اُن سے یہاں بحث نہیں - ہم بلوچستان کی کہانی بلوچ شاعروں کی زبانی بیان کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں کہ کوپ چین یا کوشانی گنگوروں کے بعد اس سرزمین پر جسے ہم بلوچستان کہتے ہیں پہلے پہلے بلوچوں کے براھوئی طائفہ نے اپنی حکومت کا سنگِ بُنیاد رکھا اور کوھنگ قلات کے پہاڑی قلعے کو جو "کلات سیوا" کے نام سے مشہور تھا بزورِ شمشیر سر کر کے اپنا صدر مقام ٹھہرایا - چنانچہ اسی مناسبت سے قلات کا مشہور و معروف خان - عبداللہ خان قہار کہتا ہے :-

کوھنگ ءِ لے کو ھیں کلات	کوہنگ کا یہ پہاڑی قلعہ
کَس ءِ پت ءِ میراث نہ اِنت	کسی کے باپ کی میراث نہیں
ما، گوں سگاراں گپتگوں	ہم نے اِسے بزورِ شمشیر حاصل کیا ہے

روائتی طور پر رندوں کی طرح براھوئی بھی اپنے کو امیر حمزہؓ کی اولاد اور قریش کہتے ہیں چنانچہ سردار (عومَر) میرواڑی کی مدح میں اس دَور کا ایک بلوچ شاعر کہتا ہے :-

عومرِ ھمار دچاں پہ مراگاہ ءُ ٹت	اُن دنوں عومَر کا دربار لگتا تھا
عومَر میرو ءِ جہاں ڈاہ ات	میرو کا بیٹا عومَر دُنیا میں مشہور تھا
راج ءُ سردار و عالم ءِ مُل بت	وہ نہ صرف اپنے قبیلے کا سردار
	اور سرداران جہان کا ہم پلہ تھا
کُلیں راجانی آھنیں پَل ءُ ٹت	بلکہ دوسرے تمام بلوچ قبائل کے لئے بھی
	ایک آھنی پناہ گاہ تھا -

چہ کُریشانی عادلیں وَلّ ُت	وُہ قریشیوں کی عادل نسل سے
حمزہؓ و عباسؓ ءِ جہاں لشکُت	اور حمزہؓ و عباسؓ کی اولاد سے تھا
لال براھیم ءِ دپتراں نُشکُت	اس کے دادا براہیم کا نام تواریخ میں درج ہے

تاریخ تو یہ کہتی ہے[1] کہ سردار میرؔ ہی وُہ پہلا برُزکوہی بلوچ سردار تھا جو برزکوہ (البرز) پر نوشیروان کے تباہ کن حملوں کے بعد اپنے قبیلے کے بچے کچھے افراد کو ساتھ لے کر قلات کی وادی میں آ پہنچا مگر شاعر کہتا ہے کہ یہ لوگ قریش یعنی عرب تھے اور اُن کے جدِّ امجد کا نام براہیم تھا جس سے یہ لوگ براھیمی اور پھر رفتہ رفتہ براوی اور براھوئی مشہور ہوئے۔ شاعر نے پندرھویں صدی عیسوی میں اپنے ممدوح سے یا اس کے خاندان والوں سے جیسا سُنا ویسا کہہ دیا۔ لیکن اُس دَور میں جب کہ ہر طرف عربوں کا طوطی بول رہا تھا۔ اُن کی سطوت و جبروت سے متاثر ہو کر ہر اُس عجمی نے جسے تھوڑا بہُت اقتدار حاصل ہوا، اپنا نسب نامہ اپنے اصل قبیلے سے کاٹ کر عربوں اور بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملایا۔ اسی طرح احمد شاہ ابدالی کے زمانہ میں بھی جب کہ افغان کچھ عرصہ کے لئے ایک فاتح قوم کی حیثیت سے ایشیا کی سرزمین پر اُبھرے تو بلوچستان کے کئی خالص بلوچ قبائل کے سرداروں نے اپنا نسب نامہ افغانوں سے ملا دیا۔

بہرحال جیسا کہ شاعر کہتا ہے براھوئیوں کو قلات کی وادی میں آباد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ کس بیلہ اور جہلاوان کے جنگالوں نے سردار مو جو نغاڑ[2] کے مقام پر تھا۔ اچانک حملہ کر دیا۔

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف کی تاریخ بلوچستان [2] تحصیل سوراب جہلاوان میں ایک گاؤں کا نام

شاعر کہتا ہے :-

	ایک بڑی فوج اور لشکر کیساتھ جاسوٹوں نے
ھیترہ دپوجے زرتہ جاموٹ ءُ	حملہ کر دیا۔
چہ حب و سارونہ اتکہ میر چھٹا	میر چھٹا۔ حب اور سارونہ سے آئے
لشکر و پوجے تن بیلہ ءِ گوٹ ءُ	اس کے لشکر میں بیلہ کے شہر تک کے لوگ شامل تھے
یار انت جلگال گوں کرار موٹ ءُ	بدبخت ہندو بھی جلگالوں کے ساتھ تھے
کچھی ءِ جلگالاں تنا پاچ ءُ	کچھی کے جلگال پاچھ سے لے کر
کرخ ۔ چکو تاں کہ مولہ بالاچہ	کرخ ۔ چکھو اور مولہ کے بالائی حصے تک
آ شکر جام زئی آتکہ مات پاچ ءُ	سب کے سب اُمڈ آئے ۔ شکر جام زئی
	مات ماپچ سے لشکر لے کر آیا ۔
بیلہ دکس تاں وڈھ وا اُود ناپچ ءُ	(غرضیکہ) بیلہ سے لیکر وڈھ اُود ناپچ تک
	جلگالوں نے مل کر ایکساتھ حملہ کر دیا
جابہ جابہ براھو کپتہ بر آپچ ءُ	براھوئی ۔ چاروں طرف سے آگ میں گھر گئے

جلگالوں کے ساتھ اس لڑائی میں سردار عوض میر واڑی مارا گیا اس کی بیوی ماھناز جو مستنگ کے خواجہ خیلوں سے تھی اپنے شیر خوار بیٹے بجار کو لے کر شاہ مردان خواجہ خیل کے پاس مستنگ چلی گئی ۔ اور کئی سالوں تک وہاں رہی ۔

شاعر کہتا ہے کہ جب میر بجار جوان ہوا، تب اس نے ایک دن اپنی ماں سے کہا کہ میرے باپ کو تو دشمنوں نے مار ڈالا ۔ براھوئی منتشر اور پراگندہ ہو گئے اپنے باپ کا انتقام لئے بغیر میں اب چین سے مستنگ میں کیسے بیٹھ سکتا ہوں ۔ اس نے کہا :-

نیں من ءُ آرام نہ بیت ھنند ءَ	اب گھر میں مجھے چین نہیں آئے گا
بہتر انت مرگ چہ عاجزیں زندءَ	عاجز اور دوسروں کا دست نگر رہنے سے موت میرے لئے بہتر ہے۔

تب ماں نے اُسے اجازت دیدی کہ جا کر دشمنوں سے اپنے باپ کا انتقام لے۔ اور ساتھ ہی اُسے ہدایت کر دی کہ پہلے یہاں سے خفیہ طور پر سوراب جلائے۔ اور اپنے باپ کے بوڑھے غلام گوشو سے ملے اور پھر گوشو کی ہدایت کے مطابق کام کرے۔ میر بجار نے گوشو کو دیکھا نہیں تھا لہذا اُسے پہچان نہیں سکتا تھا اس لئے ماں نے اُسے گوشو کو پہچاننے کی یہ نشانیاں بتلائیں۔

تو بجّرہ گوشو ءِ نشانی ءَ	(ملک بجار!) اب تو گوشو کا حلیہ سن لے
گوشی دراج ئنت چو کوہ پسانی ءَ	اس کے کان لمبے ہیں پہاڑی دنبوں کی طرح
مُودی بازنت چو کوہ بُزانی ءَ	اس کے جسم پر بال بہت ہیں پہاڑی بکریوں کی طرح
لنگی شش ئنت دست پہ دستی ءَ	اس کے ہر ہاتھ کی چھ انگلیاں ہیں۔
اے نشان انتی۔ پہ درستی ءَ	یہ اس کی نشانیاں ہیں پہچاننے کے لئے

ماں کی اجازت اور نیک دعاؤں کے ساتھ میر بجار اپنے باپ کا انتقام لینے بھیس بدل کر ستنگ سے روانہ ہوا۔ شاعر کہتا ہے:۔

رفت ملک بجار، حکم ستّار ءَ	خدا کے حکم سے میر بجار روانہ ہوا
ایوک دتنہا و کھبر دار ءَ	تنہا بغیر کسی ساتھی کے محتاط ہو کر
چو ھما جوگی کہ گرنت مار ءَ	اس نے بھیس بدلا تھا۔ ان جوگیوں کا جو سانپ پکڑتے ہیں۔
پنڈ پنڈان ءُ رفت بازار ءَ	گاؤں گاؤں بھیک مانگتا ہوا وہ چلتا رہا

بِسٹ وسِٹان ءُ بر لیش وناڑ ءُ — کانٹوں کو پھلانگتا اور پتھروں پرسے اچھلنا۔ کودتا - وہ چلا گیا۔

الغرض چھپتے چھپاتے میر بجار نفاڑ پہنچا ایک دن علی الصبح اس نے اپنے باپ کے وفادار غلام گوشو کو دیکھا جو کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ ماں کی بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق وہ گوشو کو پہچان گیا۔ گوشو نے بھی اس میں سردار عومر کی شباھت دیکھ کر اُسے پہچان لیا۔ اور پھر اُسے دور پہاڑوں میں لے جاکر کسی جگہ چھپا دیا۔ اسے کھانا پہنچانے اور اس کی حفاظت کرنے کے لئے اپنے معتمد آدمی مقرر کئے۔ اور خود براھوئی طائفہ کے مشہور افراد کو اس کی آمد کی اطلاع دینے اور قبائلی لشکر جمع کرنے کو گرد و نواح کے پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ جگہ جگہ پھر کر اس نے براھوئی قبائل کو میر بجار کی آمد اور اس کے ارادوں کی اطلاع دی براھو کا لشکر جمع ہونا شروع ہوا۔ اور بقول شاعر لوگ ایسی تندھی سے آنے لگے کہ: -

زالاں چوٹاوسی سراں گو پتہ — عورتوں نے نوعروسوں کی طرح اپنے بال گوندھے

کوھی چوپاناں۔ لٹ سوتی زرتہ — پہاڑی چرواھے اپنے لٹھ لے کر آئے۔

بگجتاں بگانی کھیال بُرتہ — ساربانوں نے اپنے اونٹوں کے گلوں کا خیال چھوڑ دیا۔

لیڑواں رنیشیناں مہار بستہ — مست سانڈ اونٹوں کی مانند مہار توڑ کر چلے آئے۔

دُیرگ و تبلاں شادِھے کُرتہ — شادیانے بجنے لگے اور طبل ودف گونج اُٹھے

براھو ءِ راج ءُ، جمَ حوال داتہ — رگوشو نے پھر پھر کر، تمام براھوی طائفہ کو اطلاع دی۔

آخر کار میر بجار میروارٹی نے براھوئی لشکر کے ساتھ حملہ کرکے نغاڑ کے قلعے پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد براھوئیوں اور جدگالوں میں لڑائی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ جو کئی سالوں تک جاری رہا۔ اب کے براھوئی چونکہ جوشِ انتقام سے سرشار تھے اور انہیں میر بجار جیسا ایک بہادر ہوشیار اور نوجوان رہنما بھی ملا تھا وہ جدگالوں کو پے در پے شکستیں دیتے رہے تاآنکہ انہیں جہلاوان کے علاقے سے باہر نکال دیا۔ تب براھوئی اور جدگالوں کے درمیان صلح ہوئی۔ پٹی ءِ ڈیدار، لس بیلہ کے جدگالوں اور براھیوں کے درمیان حدِ فاصل مقرر ہوئی جو غالباً اب تک قائم ہے، ان حدود کی تشریح کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے :۔

پٹی ءِ ڈیڈار براھوءِ سندانت	"پٹی ءِ ڈیدار" براھوئی کی حد ہے
اے گوڑءِ حدی بیلو ءِ لک انت	اسطرف سے بیلہ کی گھاٹی
زر گوڑءِ ھنگول ءِ سری ڈک انت	اور سمندر کیطرف سے ھنگول کی پہلی چڑھائی
در سری کولواہ حدی تیر تیج انت	کولواہ کیطرف سے تیر تیج کا علاقہ
دمب گوارانی سر ءِ ریج انت	اور دمب گواران کی سیراب زمین کا بالائی حصہ حد مقرر ہے

جہلاوان پر اپنا قبضہ مکمل کرلینے کے بعد میر بجار نے اُسے اپنے ان براھوئی قبائل میں جدی میراث کے طور پر تقسیم کردیا جنہوں نے جدگالوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ جہلاوان میں براھوئی قبائل اب تک ان حدود کے اندر آباد ہیں۔ یہاں پر واضح رہے کہ اس شاعرانہ روایت کی رُو سے مندرجہ قبائل براھوئی طائفہ میں شامل ہیں اور اُن میں بطریقِ ذیل علاقے تقسیم

ہوئے ہیں:-

۱:- مینگل:

دشتِ گوران تاحدِ کارچاپ ءُ	دشتِ گوران، کارچاپ کی حد تک
سرِمہ سنگ ءُ تاکوہِ ماراپ ءُ	سُرمہ سنگ کا علاقہ کوہِ ماراپ تک
پہ مینگل ءُ بجارَ بخشتہ زیاتی	میر بجار نے مینگل کو یہ مزید حصہ دیا
دگراں، توک کرتہ سیالی وبراتی	کیونکہ دگروں نے نئے سرے سے اُن سے بھائی چارہ اور رشتہ داری قائم کی تھی

۲- گرگناڑی:-

گیشتردغان ءُ تا خلکنا کھڈ ءُ	گیشتردغان کا تمام علاقہ خُلکنا کھڈ تک
حدِ لاکھوریاں تا سری چھڈ ءُ	لاکھوریان کی حد سے چھڈ کے بالائی حصہ تک۔
جیبری کاریز تا جوری ءُ وڈ ءُ	جیبری کاریز، درہ جوری تک
خیسُن دُون ءُ تا دشت آبڈ ءُ	خیسُن دون کا علاقہ دشت بُڈو تک
داتہ گرگین ءُ سردار زرک ءُ	سردار زرک اور گرگین کو عطا ہوئے

۳- کلندرانی (آلہ):-

نیمی توتک تا کوہ کھاری ءُ	توتک کا نصف حصہ کوہ کھاری تک
جوے وکھنے وکوہ گنداری ءُ	ایک چشمہ، ایک کاریز اور کوہ گنداری تک علاقہ
پہ آلہ ءُ شیرءُ داتہ ساری ءُ	شیر بجار نے آلہ کو پہلے دیا تھا
گونڈین ءُ زیانی داتہ آئی ءُ	اب گونڈین بھی مزید اُسے دے دیا

۴۔ قمبرانی (احمد) :۔

کھڈِ مستنگ ءِ و کھڈِ خضدار ءِ	کھڈ مستنگ سے کھڈ خضدار تک کا علاقہ
پہ احمدِ قمبر داتہ سردار ءِ	سردار بجار نے احمد قمبر کو عطا کیا ۔

۵۔ جملانی (جمل میر بجو) :۔

بجار ءِ بخش پہ جمل ءِ نال انت	بجار کی تقسیم میں جمل کو نال کا علاقہ ملا

۶۔ تمرانی (تمر) :۔

آ، تمیر بچ یوسفِ ھوتک	یوسف ھوتک کے بیٹے تمر کو
دانگی اُورناچ وھیر یک یک	اُورناچ اور وھیر کے علاقے یکے بعد دیگرے
حدّءِ درا کھالہ تا کھا سرلک	اور درا کھالہ سے سرلک تک کا علاقہ
	تمام عنایت کیا گیا ۔

۷۔ زرکزئی (زرک) :۔

پہ سلاھی ءِ بخشت گو نڈان ءِ	سلاھی کو گونڈان
مٹ ءِ پہ زرک داتہ نوجوان ءِ	اور زرک کو مٹ کا علاقہ
	(نوجوان) بجار نے عطا کیا

۸۔ زہری کائی (زہیرک)

دمب باراپ ءِ تا انار تر کی	دمب باراپ سے انار تر کی تک کا علاقہ
بخشتہ سردار بہرانت زہیر کی	سردار نے زہیرک کو دیا نہ زہیرک کا حصّہ ہے

٩۔ نوشیروانی (ملک دوستین)

وُڈھ ملک دوستین ءِ بُن دبہرانت	وُڈھ ملک دوستین کا حصّہ ہے
گریشگ پہ حون وگجرءِ شہرانت	گریشہ اور گجر کے علاقے اس کے بیٹے
	(دینار کے خون بہا میں اُسے دیئے گئے
بازیں بادینار ءَ دل ءُ کہرانت	وُہ دینارلہ کے لئے بہت غمزدہ ہے

١٠۔ ساسولی (سوپک) :۔

خاران تاگزی کاسگی لوپ ءَ	خاران کے علاقے میں گزی کاسگی لوپ تک
پہ حاجی سوپکءَ بکشت چمروک ءُ	نورِ دیدہ (بجار) نے حاجی سوپک کو بخش دیا

١١۔ میرواڑی (بجّار) :۔

	لس بیلہ کا مالیہ سردار بجّار
بیلوءِ مالی پہ حکم بجّار انت	کے حکم سے مقرر ہوا۔ جو اس
	کا حصہ ہے۔

براھوئی قبائل کی اس فہرست سے جو شاعر نے پیش کی ہے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف سمالاڑی (مینگل) قبیلہ میر بجار کی اس تقسیم سے محروم رہ گیا ہے، اس قبیلے کے پاس ابتک کوئی قبائلی زمین نہیں ہے۔

لہ : دینا جدگالوں کے خلاف لڑائی میں مارا گیا۔

شاعر کہتا ہے :۔

آ، سُمال آں پے بہر بُوتہ ایوک ءُ	صرف سمال کو حصہ نہیں ملا
گون نہ کپتہ پہ حملہ و وَکّ ءُ	کیونکہ، وہ حملہ و جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا

ان دنوں جب کہ میر بجار براھوئیوں کا لشکر لے کر جدگالوں کے خلاف لڑ رہا تھا میر سُمال جو سمالاڑی کا جدِ امجد ہے کوہ ماران پر ڈیرے ڈالے پڑا تھا، میر بجار کے بلاوے پر نہیں آیا۔

اس لئے شاعر کہتا ہے۔

چھوڑ دو اُس سُمال کو۔

بہل سُمال ءُ کہ نشتہ دِل تَرَکّ ءُ	ڈر سے جس کا دل پھٹ رہا ہے۔
کوہِ ماران ءُ گرد یت ایوک ءُ	کوہ ماران کی گھاٹیوں میں تنہا گھومتا پھرے

جدگالوں کو شکست دینے کے بعد، بلوچستان کی سرزمین پر براھوئیوں کے قدم جم گئے اور انہوں نے رفتہ رفتہ یہاں پر پہلی بار بلوچوں کی حکومت قائم کی جو تقریباً تین سو سال تک ہندوستان ایران اور افغانستان کی ہمسایہ مملکتوں کے درمیان اپنا وجود قائم رکھتی رہی۔ قلات کے خان عبداللہ خان قہار نے کیا خوب کہا ہے :۔

اے قلات کا زرفشاں پہاڑی قلعہ

جی، کلات کوھین و زر اپشانیں	تجھ پر میں قربان !
سُن دتی ہیری گوا تگرِ ہِ ساءُ	اپنے شاہی محل کی ٹھنڈی چھاؤں میں
پہ تُہ پلک چوشیں واجہے گندے	مجھ جیسا کوئی آقا۔ تم شاید ہی پھر کبھی دیکھ سکو !

۲- رند و لاشار کی یلغار

کہا جاتا ہے کہ رند لاشار ابتداء میں دو جُدا جُدا قبائل نہیں تھے بلکہ بلوچوں کا ایک ہی قبیلہ تھا جو سردار جلال خان کی سرکردگی میں ایران سے مکران میں داخل ہوا بعدازاں میر جاکر رند اور میر گواھرام لاشاری میں قبیلہ کی سرداری پر اختلاف پیدا ہونے کی وجہ سے دو حصّوں میں بٹ گیا۔

شاعر کہتا ہے :۔

رِند و لاشار، اَشِ یکّیں برات ئُنت	بنیادی طور پر، رِند اور لاشار دو بھائی ہیں
جگت سینگنت کہ حمزہؓ ھئیں ذات ئُنت	اور اسے بھی دُنیا جانتی ہے، کہ امیر حمزہؓ کی اولاد میں سے ہیں۔
جگت ءِ سرا دوستیں کسّہ یات ئُنت	اُن کے قصّے دُنیا میں مشہور ہیں
من دِھاں زوراک دمزن گوات ئُنت	وہ طاقتور ہیں، اور ہر مالک پر اُنکی دھاک بیٹھی ہوئی ہے

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے کہ حضرت امام حسینؓ کی محبت میں یزید کے خلاف لڑنے کے بعد بلوچوں کے اس طائفہ نے حلب سے ہجرت کی پہلے ایران میں جگیں کے مقام پر آ کر آباد ہوئے اور پھر وہاں سے نقل مکانی کر کے مکران میں آ گئے "نسب نامہ" جو بلوچی کی ایک قدیم نظم مانی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں مظہر ہے کہ :۔

اولاد میر حمزہؓ ھئیگوں	ہم رند و لاشار، امیر حمزہؓ کی اولاد ہیں
سوب درگاہ ءِ گوں انت	نصرت ایزدی ہمارے ساتھ ہے

اَش حلبَ ءَ پادکایوں	ہم حلب (عراق) سے اُٹھ کر آئے ہیں۔
گوں یزید ءَ جیڑو انت	یزید سے لڑنے کے بعد کربلا اور بمپور کو پیچھے
کلبلا، بمپور سُ نیام ءَ	چھوڑ کر۔
شہرِ سیستان، منزل انت	سیستان کے شہر میں۔ ہم نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ اس زمانے میں سیستان کے اس علاقے پر شمس الدین نامی ایک بادشاہ کی حکومت تھی بلوچوں کے ساتھ جس کے بڑے اچھے تعلقات تھے لیکن اُس کے مرنے کے بعد جب بدر دین اس علاقے کا بادشاہ ہُوا۔ تو بلوچوں کیساتھ اُس کے تعلقات بگڑ گئے اور اس نے جا و بے جا بلوچوں کو ستانا شروع کیا:-

بادشاہ مے شمس الدین اِنت	جب شمس الدین بادشاہ تھے
گوں بلوچاں ھاتر انت	وہ بلوچوں کی خاطر مدارات کیا کرتے تھے
نیں کہ بدرالدین در آتکہ	اب جبکہ بدر دین آ گئے۔
ناگمانیں شدّت انت	ہم پر اُس نے اچانک تشدد شروع کر دیا

شاعر کہتا ہے کہ اس علاقے میں اس وقت ہمارے چوالیس ۴۴ قبیلے آباد تھے، میر جلال خان ہم سب کا سردار تھا:-

مے سرءَ میریں جلال کھان	میر جلال خان ہمارا سردار ہے
چل وچیاریں بولک انت	اور ہم چوالیس ۴۴ قبیلے ہیں۔

روایت ہے کہ جب بدر دین سیستان کا بادشاہ ہُوا تو اس نے ایک دفعہ بلوچوں کے ان چوالیس ۴۴ قبیلوں میں سے ہر ایک سے ایک ایک دوشیزہ طلب کی، بلوچ

بہت پریشان ہوئے بہت غور وفکر کے بعد بالآخر انھوں نے فیصلہ کیا کہ دو شیزاؤں کے لباس میں چوالیس خوبصورت لڑکے بدر دین کے دربار میں بھجوادیں اور خود اس ملک سے ہجرت کرکے کہیں اور چلے جائیں ۔ چنانچہ ایسے ہی کیا گیا ۔ اور پھر اسی دن سردار جلال خان کی سرکردگی میں جگیتی سے نقل مکانی کرکے مکران کی طرف روانہ ہوئے وُہ بڑی تیزی سے بڑھتے ہوئے ہارین کی بندرگاہ کے نواح میں پہنچے جو کیچ کی دائیں طرف واقع تھی یہاں سے رفتہ رفتہ کیچ مکران کی تمام وادی میں پھیل گئے ۔ میر جلال خان یہیں فوت ہوئے ۔ اس کے بعد شہد دست اور پھر شیہک ان کے سردار ہوئے ۔

نسب نامہ کی اس طویل نظم سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رند و لاشار کی آمد سے قبل بھی ان علاقوں میں بلوچ قبائل کثرت سے آباد تھے ۔ اسی لئے شاعر کہتا ہے !

ئی بلوچ باز دلبیار نت	بہت اور بے شمار بلوچ اور بھی ہیں
درست مں رندءُ ماں نہ نت	لیکن وُہ رند کے طائفے میں شامل نہیں ہیں ۔

سردار شیہک کے زمانے سے ہماری یہ کہانی شروع ہوتی ہے ۔ جو میر چاکر رند اور میر گواھرام لاشاری کے کارناموں سے رنگین ہے ۔ اُسی دَور کا ایک شاعر کہتا ہے کہ کیچ مکران میں کئی سال رہنے کے بعد امیران رند و لاشار کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہُوا کہ مکران کے دشت و جبل میں پڑے رہنے سے بہتر ہے کہ آگے بڑھ کر زرخیز و شاداب زمینوں اور سبزہ زاروں پر قبضہ کیا جائے ۔ چنانچہ ؛ ـــ

	ایک دن رند و لاشار جمع ہوئے
رند و لاشاری آوارنت تران لبتش پہ ڈیوان	اور آپس میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا

بیاات وشید البڑوں، پہ گباہیں ھلکہان

(کہا کہ) اب یہاں سے لد چلیں سرسبز و شاداب وادیوں کی طرف

جو دمیتا پاں کہٹوں، بہر کنوں بی پہ دتان

ندیوں، چشموں اور زرخیز زمینوں پر جاگیر کریں ۔ اور پھر اُن کو آپس میں بانٹ لیں

تی راہج درانا کس ہکیوں، بیاتکاں لوگ گہدان

دوسری قوموں اور اُن کے راجاؤں کو خاطر میں نہ لائیں (یہ فیصلہ کرکے وہ لوگ) اپنے گھروں اور خیموں کی طرف

حکم پہ لونڈیں نکھیساں لوک کنتش آدمان

اور حکم دیا انھوں نے اسی وقت اپنے غلاموں اور تنو مند نوکروں کو

بوجت بوراں بارگیناں، کوٹوانی اندران

(کہ) کھول لاؤ بیلی گھوڑیوں کو اصطبلوں کے اندر سے

سنج کنیت بانزیں بہانان نہ ھزاری مرکبان

اور زین کس دو، کمین قیمتی گھوڑیوں اور نو ھزاری گھوڑیوں پر۔

بیارت لیگاں گردگیناں، چہ نلی دکھوڑدیان

لے آؤ! ندیوں اور نالوں والی چراگاہوں سے خوبصورت اونٹوں کے گلوں کو۔

گوانک جنگ جوراں بی کاداں، اریکپت چہ جھگیان

خاوندوں نے اپنی حسین بیویوں کو کہا کہ اب اُتر آؤ ماڑیوں اور سائبانوں میں سے

کشت گھالی دپلنگاں اجل وھوریں کمبلان

باہر نکال لاؤ۔ گھروں میں سے قالینوں پلنگوں، دریوں اور سرخ کمبلوں کو

بوپ و موربندیں لیہپنا، ہنگلو کین سجلان

گدیلوں ۔ پھولدار لحافوں اور چاندی کے برتنوں کو ۔

سکہ و تانساں بلور ءِ مکرانی کدھان	تانبے اور تانبے کی دیگچیوں ۔ تھالیوں بلور کے گلاسوں اور مکران کے بنے ہوئے پیالوں کو
رند ھیدیں ءَ نہ بندنت، چرنت دیہاں چکیل	رند اب یہاں نہیں رہیں گے ۔ دور کے علاقوں میں جائیں گے ۔
پوشتہ بنداں تی دھڑ، پہ کبا د شد ھوان	رندوں نے پھر اپنے دھڑ ڈھانپ لئے قباؤں اور ریشمی ملبوسات میں
دسکلا، گوں بازو بنداں، جل گوں دیلئی تی زیں نعل	(اُن کے اوپر اپنے ہتھیار سجا لئے) دسکلا ۔ بازو بند اور دانے دار زرہیں پہن لیں اور سروں پہ فولادی خود رکھے
پادلایں موزگاں گوں، کاسنت میں ردعان	پاؤں میں سرخ موزے پہنے ۔ اور کابل میں پاؤں ڈال کر زین پہ بیٹھ گئے ۔

اس میں شک نہیں کہ مکران سے روانہ ہوتے وقت ان چوالیس قبیلوں کے تمام افراد اُن کے ساتھ نہیں گئے ۔ ان کا کچھ حصہ بلکہ کئی قبیلے وہاں مکران میں ہی رہ گئے باقی سردار شیہک اور میر گواھرام لاشاری کی سرکردگی میں یوں روانہ ہوئے کہ : ۔

شیہک مں سرپٹ سرداریں	سردار شیہک آگے آگے تھے
نود بندگ بسکی سالاریں	سخی نود بندگ (قبائل) کے سپہ سالار تھے
راجاں سرجمی ءَ زُرتنت	وہ، اُن سارے قبیلوں کو ساتھ لے کر چلے
آپو زد ءِ نسیب ءَ بُرتنت	آب و دانہ جن کی قسمت میں تھا
کھوڑ و کھوڑ دیاں گندان ءَ	پہاڑی ندیوں اور اُن کے منبعوں کو دیکھتے بھالتے

آپ وآپ سراں نندان ءُ	پانی کے چشموں اور جھیلوں کے کنارے ڈیرے ڈالتے ۔
کولواهی پٹاں ، گردان ءُ	کولواہ کے چٹیل میدانوں میں گھومتے پھرتے انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا ۔

سردار شیہک اپنے قبائل کے ساتھ کئی سالوں تک کولواہ کے علاقہ میں آشال کے مقام پہ ڈیرہ ڈالے پڑے رہے ۔ یہاں پہ ہی اُن کا نامدار فرزند میر چاکر پیدا ہُوا ۔

چاکر چو چراگین لال ءُ	چاکر، لعلِ شب چراغ کی مانند
پیدا بُوت بے آشال ءُ	تولد ہوئے اسی آشال میں
پیش چہ بانڑی ءَ سال ءُ	(لانچہ ہن) بانڑی سے تین برس پہلے
رُست من سائیں اِکبال ءُ	(اس نے اچھا اقبال کے ساتھ پرورش پائی

الغرض : جب سردار شیہک نے کولواہ سے نقل مکانی کرنے کا فیصلہ کیا تو میر چاکر اُس وقت نوجوان تھے اور :۔

سردار زہجنیں شیہک ءُت	تیغ زن شیہک (قبیلے کے) سردار تھے
کئول و وعادعی یک ڈُک ءُت	وہ قول کے پکے اور وعدے کے سخت پابند تھے
نودبندگ ، شنگ ساری ءُ	نوربندگ اُن سے آگے جارہا تھا
گوئستگ بال گنز هاری ءُ	بال گنز سے وہ سیلِ آب کی مانند گزرے
کیچ کھورو تن آ ، کیل کھور ءُ	کیچ کی ندی اور کیل کی ندی پر سے
چو بشّامی نہ گوری تیں هور ءُ	وہ ساون کے ان بادلوں کی طرح

جو مہینہ نہیں برسات گذرتے چلے گئے۔

راجاں جہتگ نجی ءُ	تمام قبائل اُن کے ساتھ تھے ۔
دیم پہ سیبیؔ دکچھیؔ ءُ	اور وہ سبیؔ اور کچھی کیطرف چلے جا رہے تھے

اگرچہ میر چاکر رند اور میر گواھرام لاشاری کی داستان کو جلا بخشنے والی اور کچھی کے میدانوں کو بلوچوں کے خون سے رنگین کرنیوالی جنتنی حسینہ، گوھر بھی کولواہ میں اُن کے ساتھ تھی لیکن کولواہ سے کوچ کرتے وقت اُس نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا جس پر سردار شیہک اور نودبندگ اپنے قبائل کے ساتھ روانہ ہوئے تھے کیونکہ اس راستے میں اُس کی اونٹنیوں کے گلوں کے لئے چارہ اور پانی وافر نہیں مل سکتا تھا ۔ شاعر کہتا ھے :-

گوھر گوں دتی راہچیان	گوھر اپنے چرواھوں اور خدمتگاروں کیساتھ
گوں ہیش دگوئرم وڈاہچیان	اپنی بھیڑوں، گائیوں اور اونٹنیوں کے گلوں کو ہانکتی ہوئی ۔
زر کرء ءُ شتہ آپی ءُ	ساحل کے ساتھ ساتھ چلی تاکہ اس کو پانی مل سکے ۔

رند ولاشار کی اس پُرشکوہ اور تاریخ ساز نقل مکانی سے متعلق جتنی قدیم نظمیں اب تک دستیاب ہوئی ہیں اُن میں سے کسی ایک میں بھی اُن کے کولواہ سے کچھی تک پہنچنے کے درمیانی عرصے کا جس میں غالباً کئی سال لگے ہوں گے کوئی ذکر نہیں ملتا۔ حالانکہ رند ولاشار کی آمد سے قبل جھالاوان اور سراوان کی وادیوں اور کوہستانوں میں براھوئی قبائل آباد ہو چکے تھے ۔ جیساکہ براھوئیوں کے سلسلے میں

بیان ہوا ہے کہ میر بجار میرواڑی کی سرکردگی میں جدگالوں کے خلاف کئی لڑائیاں لڑکر اس علاقے پر براہوئیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ رند لاشار قبائل کا تو ان سے ایک اول عرصہ بعد یہاں سے گذر ہوا۔ اور وہ تھوڑے لوگ بھی نہیں تھے جیسا کہ شاعر کہتا ہے :-

شیہک رینگت چو موجان	شیہک دریا کی موجوں کی طرح
رندگوں چل ھزاری پوجان	چالیس ھزار فوج کیساتھ آگے بڑھتا رہا۔

تب سے رند لاشار کا ان علاقوں میں آباد براھوئیوں یا جدگالوں سے مڈبھیڑ نہ ہونا بعید از قیاس ہے، اس سلسلہ میں تاریخی طور پر اخوند محمد صدیق کا بیان درست معلوم ہوتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ جب سردار شیہک اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ رائے مرتفع قلات پہنچے تو اُن دنوں قلات کی وادی پر میر عومر میرواڑی کی حکومت تھی۔ میر عومر رند و لاشار کے خلاف لڑائی میں مارا گیا اور اُس کی بیوی (ماھناز) اپنے کمسن بیٹے بجار کو لیکر مستنگ چلی گئی۔ جب میر بجار جوان ہوا تب اپنی ماں سے اجازت لے کر وہ بھیر (قلات) چلا آیا، چھپر میں سردار عومر میرواڑی ساباہی نامی ایک رئیس رہتا تھا۔ سیاھی زئی ریسانی اپنے کو جس کی اولاد بتاتے ہیں۔ میر چاکر دگوا ھرام ان دنوں قلات کو خیر باد کہہ کر کچھی پر قابض ہو چکے تھے، قلات میں میر مندو نامی ایک رند اُن کا نمائندہ حکمران تھا۔ جس کے متعلق کہا جاتا ھے کہ وہ میر چاکر رند کا خسر بھی تھا۔ بہرحال بقول اخوند محمد صدیق رئیس سیاھی کی مدد سے میر بجار نے براھوئی قبائل سے لشکر جمع کیا۔ اور پھر حملہ کر کے قلات پر قبضہ کر لیا۔ میر مندو رند لڑائی میں کام آیا۔ اس کی اولاد اب تک قلات میں آباد ھے جو مندوانی کہلاتے ہیں۔ اس سے صاف ظاھر ہوتا ہے کہ براھوئی جاگال

جنگ سے متعلق اخوند محمد صدیق اس تمام واقعہ کی تردید کرتا ہے، جو شاعر نے میر عومر سے متعلق بیان کیا ہے، اور جسے پراھوئیوں سے متعلق باب میں ہم بیان کرچکے ھیں لیکن جیسا کہ ہم ابتداء میں کہہ چکے ہیں کہ یہاں تاریخی حقائق ہمارے پیش نظر نہیں بلکہ ہم واقعات کو اُسی رنگ میں دیکھیں گے جس رنگ میں ہمارے شاعروں نے انہیں پیش کیا ہے۔

بہر حال تاریخی طور پر اس واقعہ کی حقیقت جو بھی ہو، اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رند و لاشار قبائل سراوان اور جہلاوان سے بالترتیب براستہ درہ بولان اور درہ مولہ کچھی کے میدان میں داخل ہوئے۔ رند قلات سے براستہ شیخڑی جوھان اور کشان سے ہوتے ہوئے بی بی نانی کے مقام پر درہ بولان میں داخل ہوئے اس راستے میں اُن سے بچھڑے ہوئے بعض قبائلی دستے مثلاً گلوئی۔ جتوئی وغیرہ جگہ بہ جگہ آباد چلے آتے ھیں۔ لاشاری، خضدار اور زیدی سے درہ مولہ میں داخل ہوئے اور کچھی میں نکل کر گنداوہ پر قبضہ کرلیا۔ شاعر کہتا ہے :۔

لڈِتہ ھلکاں چہ بُنی ھندان	پرانی قیام گاہوں سے ڈیرے اٹھا لے گئے
یاگو و بازاریں جھکوہ آریتش	جہلاوان کے سرسبز و شاداب پہاڑوں کو چھوڑ کر
دیم من زر جیں مُولوءَ داتش	انہوں نے اپنا رُخ روپہلی چمک دمک والے مُولہ کی طرف پھیر لیا۔
کشتگ گولو اچ ھاملک ءَ	گولو کو نکال کر گنداوہ پر قبضہ کرلیا۔
چاکر پہ لڑ بوجی رواں بیتہ	میر چاکر بولان سے منزل بمنزل سفر کرتا ہوا
زور سیوی چہ دشمناں زیتہ	سبّی پہنچا، اور سبّی کو طاقت کے زور پر دشمنوں سے چھین لیا۔

پگگیں دا زاں دا رشں ھور بیتہ — دشمنوں کو اس نے ایسے کاٹا جیسے گندم کی پکی ہوئی کھیتی کو درانتی کاٹتی ہے۔

اس واقعہ کو ایک اور شاعر اس طرح بیان کرتا ہے۔

شہیکے ریچگنت پہ موجہان	شیہک، دریا کی موجوں کی طرح
رندگوں چل ہزارءِ بیوجہان	چالیس ہزار لشکر کے ساتھ
مئِ بولان ءَ دپ ءَ جھیگ بیت	بولان کے دہانے سے کچھی میں داخل ہوا
رندگوں بولکاں شیشنگ بیت	رند اپنے اپنے طالفوں کے ساتھ علاقے میں پھیل گئے
لاشاری نجیں گنداگو	لاشاری گنجوں والے ٹولے میں اُتر کر
گنجیں مولہ ءَ ایر کپتنت	دوسری طرف کی ترائی سے باہر نکلے
سرسندیں نگو رکدر ریختنت	اور گنداوہ تک پہنچ گئے۔

یہ غالباً ۱۴۸۵ء کا واقعہ ہے جبکہ کچھی پر ان دنوں جام نندہ کی حکومت تھی۔ کچھی کے جدگال میر چاکر کے چالیس ہزار بلوچوں کا زیادہ عرصہ تک مقابلہ نہیں کر سکے جام نندہ شکست فاش کھا کر کچھی سے دستبردار ہو گیا۔ جدگال کچھ تو سندھ اور پنجاب کیطرف بھاگ نکلے اور کچھ بلوچوں کی اطاعت قبول کر کے اُن کے کاشتکار بن گئے۔ اس واقعہ کو ایک طرح شاعر فخریہ انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

نجیں کشتگنت جدگالاں	جدگالوں کا انھوں نے قتل عام کیا
ملکش برتگنت گوں مالاں	انکی زمینیں چھین لیں اُن کے مال مویشی لوٹ لئے
نشتنت سرجم ءَ ہنت سالاں	اور پھر کئی سال یہاں امن و چین سے رہے

سردار شیہک ان دنوں بوڑھا اور ضعیف ہو چکا تھا اس لئے ایکدن اس نے

گوشتگ نیمبنیں رندان ءَ	تیغ زان رندوں سے
لوحالی ملکِ گندان ءَ	بادشاہ صفت لوحانیوں
جتوئی سلاح سندان ءَ	اور ہتھیار شکن جتوئیوں سے کہا
ریتوں شہ بلوچی شان ءَ	میں اب بلوچی شان سے رہ گیا ہوں
شمے سردار چاکرانت پھلان ءَ	اب تمہارا سردار میر چاکر ہے۔ اس کی فرمانبرداری کیا کرو۔

رندوں نے تو بڈھے سردار شیہک کی بات مان لی لیکن لاشاریوں نے میر چاکر کو سردار ماننے سے انکار کر دیا اور اُسی دن :۔

لاشار ءَ پہ ھما اکرام ءَ	لاشاریوں کو یہ بات پسند نہیں آئی
پاگے بستگنت گواھرام ءَ	انھوں نے میر گواھرام کے سر پہ اسی دن سرداری کی پگڑی باندھ دی

اس دن سے بلوچوں کے ان دو بہادر اور جنگجو طائفوں یعنی رند و لاشار میں اختلافات کی بنیاد پڑ گئی جو بعد از ان اگوھر حبتی کی اونٹنیوں کے بہانے ایک طویل خانہ جنگی کی شکل اختیار کر گئی اور بقول شاعر پورے تیس ۳۰ سال تک :۔

شنگوئرءَ گواھرام دتیگ ءَ	ایک طرف سے میر گواھرام
شانگوئرءَ میر چاکرءَ	اور دوسری طرف سے میر چاکر
سرگوئے بیتگنتی	اس لڑائی کا سرغنہ بن کر
نیشتی درشتنت مںٔ دپ ءَ	ایک دوسرے پر دانت پیستے رہے

پیلویں سی سال جنگت — پورے تیس سال تک وہ آپس میں لڑتے رہے
گوھرئے جرء سر — گوھر کی اونٹنیوں کے بچوں کے لیے۔
راجاں کشتیش ایو کیگ — قبائل کو اُنھوں نے اکیلا چھوڑ دیا۔
پہ ھُدائی آسرا — خدا کے آسرے پر
پوشتُشتش پہ بدیگاں — ایک دوسرے کی دشمنی میں
زاھد و پیلاوار — وہ سب کچھ بھول گئے

یہاں تک کہ بالآخر اُن کو بلوچستان ہی چھوڑ دینا پڑا۔ دونوں قبیلے تیس سال کی خانہ جنگی سے بدحال اور منتشر ہو کر سندھ اور پنجاب کی طرف نکل گئے اور پھر کبھی بلوچستان کا رُخ نہیں کیا میر چاکر کی قبر ست گڑھ پنجاب میں اور میر گواھرام کی روہڑی کے قریب سندھ میں کہیں ہے۔

۳۔ گوھر کی اونٹنیوں کا قضیہ

ایک شاعر نے کہا ہے :

جتّنی ، روماں ئنت بلوچانی	جتنیاں بلوچوں کے رومال ہیں
ڈُومبنی ، ڈگریں گدھے شیر ئنت	اور ڈُومبیاں تازہ دودھ سے بھرے ہوئے پیالے

اسی لیے تو شروع ہی سے بلوچوں کی باہمی چپقلشوں اور خانہ جنگیوں میں حسین جتنیوں اور ڈُومبیوں کا ہاتھ رہا ہے ، بلوچ شعراء کی رومانی نظمیں ان جتنیوں کے ساتھ بلوچ بانکوں کی داستانِ عشق و محبت سے بھری پڑی ہیں۔ رندی دور (پندرھویں صدی) کی نظموں میں ایسی سات حسیناؤں کا بار بار ذکر آیا ہے جن پر بانکے سجیلے بلوچ نوجوان مرمٹتے رہتے ہیں ، کہتے ہیں کہ ساتوں مشہور و معروف حسینائیں یعنی گوھر ۔ شاری ۔ بشّی ۔ ماھری ۔ سومری ۔ ھتّلی اور لبڈی بہنیں تھیں سب مال دار ، باسلیقہ ، شائستہ اور انتہائی حسین و دلربا جتنیاں تھیں ان ہی میں سے گوھر جو غالباً سب سے بڑی تھی اس تیس سالہ خانہ جنگی کی ہیروئن ہے ۔ جس میں یہ جا کر بندادر میر گواھرام لاشاری نے سرغنہ بن کر حصہ لیا ۔ اور رند و لاشار بلوچ قبائل کو بڑھ بڑھ کر آپس میں کٹوا ڈالا ۔ گوھر سے متعلق ہمارا شاعر کہتا ہے :۔

گوھر اَتَت ماھیں بُجنے	گوھر ایک ماہ پیکر عورت تھی
بازمال و بگّت ءِ بانکے	وہ بہت مالدار اور اونٹوں کے گلوں کی مالکن تھی ۔
پیشداری کُنّگ ءِ تنگوئت	اس کے خیمے کے ستون سونے کے تھے
نشتیں بجے ابریشم ئت	وہ ریشمی گدوں پر بیٹھا کرتی تھی
گواھرام وَت پہ مِنّت ئت	خود گواھرام اس کے چاہنے والوں میں سے تھا

رات دن شاطائیں بیٹھ بیٹھ کر اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا	روچ و شپ ءَ رتالوٹت

مگر، گوھر کسی طرح بھی میر گواھرام سے تعلق پیدا کرنے پر رضامند نہیں ہوتی تھی، آخر کار تنگ آکر ایک رات میر گواھرام خود اس کے خیمے میں گیا اور اس پر دراز دستی کی ناکام کوشش کی، گوھر بگڑ گئی اور میر گواھرام کو طعنہ دیتے ہوئے کہا: ؎

بیٹے کی طرح میں نے تجھے پالا	بچّی اوں ترا رودینتگ
اور بھائی کی طرح تجھ سے پیار کیا	براتی اوں ترا دوست داشتگ
اگر کوئی عورت ۔ کسی نوجوان کو اپنا بھائی کہے ۔	ورناءَ اگں برادر گشت
(تو وہ)۔ اس کی عصمت پر ہاتھ ڈالنے کے بجائے اس کے ناموس کی حفاظت پر کٹ مرتا ہے .	تہ ورناس مہیاراں باریت

س طرح گوھر میر گواھرام سے ناراض ہو کر دوسرے دن لاشاریوں کی قبائلی حدود سے باہر نکل آئی اور پھر وہاں سے اپنے مال مویشی سمیٹ کر میر چاکر کی پناہ میں چلی گئی .

شاعر کہتا ہے کہ میر چاکر سے جاکر گوھر نے شکایت کی کہ: ؎

گواھرام نے مجھے ناراض کیا ہے	گواھرام ءَ من ءَ رنجینتگ
ایک رات مجھ پر ہاتھ ڈالنے آیا تھا	پر من شپے آ اُرتگ

گوہرتو اَنگگاں باھوٹ	اب میں آپ کی پناہ میں آئی ہوں
چھیں دَے من رَجاگاۓ	ایک چراگاہ منتخب کرکے میرے حوالے کر دیں
بگ ءَ را بندے پیش دار	اور میری اونٹنیوں کے گلوں کے لیے ایک
	ٹھکانا بھی مجھے دکھا دیں ۔

گوہر کی باتوں سے میر چاکر کو بہت دکھ ہوا کہ میر گواھرام جیسا ایک بہادر اور شریف بلوچ جس کا فرض اپنے ہمسایہ کی جان و مال اور ننگ و ناموس کی حفاظت کرنا ہوتا ہے - کیونکر ایسی ناشائستہ حرکت کرسکتا ہے ، میر گوھرام کے ساتھ اس کے تعلقات پہلے سے ناخوشگوار تھے اس واقعہ سے اس میں مزید تلخی پیدا ہوئی لیکن اُس نے صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے گوھر سے کہا :-

چہ گواھرام ءَ مکن تو ڈلھے	گواھرام سے کوئی خطرہ محسوس نہ کر
دل جمی ، بند جاگاھے	جہاں تیرا جی چاہے
ھر جاکہ تئ دل لوٹیت	کوئی چراگاہ پسند کرکے اپنا ڈیرہ ڈال لے
یا من کچروک ءِ جو ءَ	یا پھر کچروک کی ندی پر جا کر قیام کر
زبدانت گردگیں بگانی	جو ، اونٹوں کے گلوں ، بھیڑوں
ھاریں گنوّرم و میشانی	اور گائیوں کے لئے ایک بہترین چراگاہ ہے

کچھ عرصہ بعد ایسا ہوا کہ ایک دفعہ عید کے دن میر گواھرام لاشاری کا لڑکا رامین چند نوجوان لاشاری گھڑ سواروں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے بستی آیا یہاں ریحان اور اس کے ساتھی رند نوجوانوں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی شام کے وقت ان جوانوں کو گھوڑے دوڑانے کا شوق چڑھا پاس ہی موچی کا مٹیالے رنگ کا پلا ہوا مینڈھا بندھا ہوا تھا ۔ طے ہوا کہ گھڑ دوڑ

یں جس کا گھوڑا جیتے سینڈھا اُسی کا ہوگا ۔ اس واقعہ کو شاعر یوں بیان کرتا ہے ا

بانگہے لانساری پہ آ جہنر ءُ — ایک صبح کو لاشاری سیر و تفریح کیلئے

آتکگنت میریں چاکرءِ شہر ءُ — میر چاکر کے شہر میں آئے۔

دلیتگنت موچیءِ گرانڈ بوربن — انہوں نے موچی کا مٹیالے رنگ کا سینڈھا

لبنگی ءُ من منگ ءِ ساہ ءُ — جو چھپر کے سایہ تلے بندھا ہُوا تھا

تاچوں بوراں پہ توکّل شاہ ءُ — آؤ اللہ پہ توکّل کرکے گھوڑے دوڑا

(انھوں نے رند نوجوانوں سے کہا)

گھوڑے دوڑائے گئے لیکن نمایاں جیت کسی ایک کی نہ ہوسکی۔ رامین اور ریحان

گھوڑے ہمدوش اور باقیوں سے آگے تھے، یہاں تک کہ دوڑ ختم ہوگئی لیکن فیصلہ کن جی

کسی کی نہیں ہوئی، اب تماشائیوں نے باتیں بنانا شروع کیں کسی نے کہا کہ ریحان کا گھوڑا

قدر آگے تھا۔ اور کسی نے کہا کہ نہیں رامین کے گھوڑے کی گردن صاف آگے دکھائی دے رہی

الغرض تُو تُو میں میں، اور جھگڑے تک نوبت پہنچ گئی، مگر شاعر فیصلہ کُن انداز میں کہتا ہے

بوتگگنت گولانی ترصیں تازی — اُنہوں نے چراگاہوں میں کلیلیں کرنیوالے

اپنے سُبک رفتار گھوڑے دوڑائے

اُش پد ءُ رنداں دُروہ کتہ گوازیا — لیکن بعد میں رندوں نے کھیل میں دھوکہ کیا

گوُشتہ ریحان ءِ سیاہ مزیں تازی — (اُنہوں نے کہا) ریحان کا کالا گھوڑا آگے تھ

گھڑ دوڑ کے جلد بعد رامین اور اس کے نوجوان ساتھی ناراض ہوکر عصر کے وقت وہاں سے

واپس ہوئے گوھر جتنی کا ڈیرہ اُن کے راستے میں پڑتا تھا۔ مشتعل تو وہ پہلے سے تھے ہی اب گو

کا ڈیرہ جو دیکھا تو اُن کے جذبات زیادہ بھڑک اُٹھے، گوھر جو پہلے لاشاریوں کی پناہ میں

تھی اب نہ صرف اُن کو چھوڑ کر آئی تھی بلکہ اُن کے سردار کے خلاف ایک ھمسایہ عورت پر ہاتھ اُٹھانے اور اس کی عصمت و ناموس پر دست درازی کرنے کا الزام بھی لگا چکی تھی جس سے لاشاریوں کی سخت سُبکی ہوئی تھی۔ اور اُن کی بلوچی ننگداری پر حرف آیا تھا۔ رامین اور اس کے نوجوان ساتھی، نتائج سے بے نیاز آؤ دیکھا نہ تاؤ، گوھر کے ڈیرے میں داخل ہوئے۔ اور اس کی اونٹنیوں کے تمام بچوں کو تلوار سے کاٹ کر رکھدیا۔ ؎

اُش ھما درو گھیں گوازی ءُ زہر ءَ	رندوں کی، جھوٹی گواہی سے مشتعل ہوکر
رھیتہ مش زردیں دیگر ءِ پہر ءَ	ڈھلتی عصر کو جب وہ واپس جارہے تھے
گڑتگ ھڑ چہ کینگ و کہر ءَ	اُنھوں نے بغض وحسد سے گمراہ ہوکر
	گوھر کی اونٹنیوں کے بچوں کو تلوار وں سے کاٹ کر رکھدیا

گوھر گو کہ حبشی تھی لیکن سمجھدار باسلیقہ اور قبائلی رموز سے آشنا عورت تھی وہ جانتی تھی کہ اگر میر چاکر کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو وہ لاشاریوں سے انتقام لئے بغیر نہیں رہے گا کیونکہ کسی بلوچ کی پناہ (باھوٹ) میں آئے ہوئے شخص کی ذات پر ہاتھ اُٹھانا یا اس کے مال ومتاع کو دانستہ طور پر تلف کرنا یا نقصان پہنچانا بلوچوں کے مسلمہ رواج کی خلاف ورزی اور علی اعلان دعوت جنگ دینا تھے، اسی خیال سے گوھر خاموش رھی۔ اُس نے میر چاکر یا کسی اور رند کو اس کی اطلاع نہیں دی مگر اتفاقاً ایک دن میر چاکر کا وہاں سے گذر ہوا۔ بیبگر اور دوسرے چیدہ چیدہ رند اس کے ہمرکاب تھے، شاعر کہتا ہے کہ میر چاکر کو اپنے ڈیرے کی طرف آتے دیکھ کر:

بی بی گوھر، دَت در کپتگ	بی بی گوھر اس کے استقبال کو خود لینے خیمے سے باہر آئی۔
ھلک ءَ را توار ے داتگ	اور اپنے ڈیرے والوں کو آواز دی۔

پُھلیں پنڑے آور تگ — جو ایک پھولدار قالین لے آئے،
میرمی چاکر ءَ چیر گیھتگ — اور میر چاکر کے لئے اُسے بچھا دیا۔

جب شام کو اونٹنیوں کے گلے چراگاہوں سے واپس آنے لگے۔ تو خلافِ معمول

ڈاچی اُنگنت دھنزان ءَ — ڈاچیاں بلبلاتی
شیر چِچہ مایگاں شنزان ءَ — اور تھنوں سے دودھ ٹپکا رہی تھیں

میر چاکر جو خود بھی ایک مالدار شخص تھے اونٹنیوں کی یہ حالت دیکھ کر سمجھ گئے کہ اونٹنیوں کے ساتھ کوئی حادثہ ضرور ہوا ہے۔ تب اُنھوں نے گوھر سے پوچھا ! ؎

ڈاچی پہ چکار ءَ دھنزنت — یہ تمہاری ڈاچیوں کو کیا ہوا ہے
شیر چِچہ مایگاں ءَ شنزنت — وہ کیوں یوں تڑپتی. تھنوں سے دودھ ٹپکاتی اور بلبلاتی ہیں۔

گوھر نے بات چھپانے کے لئے میر چاکر کو جواب دیا کہ ؛ ؎

ھتراں گوُرُ آتکہ رسترے — سردار ! اونٹنیوں کے بچوں کو
تو ڈاچری بور ژنگنت — ایک درندے نے پھاڑ کھایا ہے
ڈاچی ھوانکو دھنزگ ئنت — اس لئے ڈاچیاں تڑپتی
شیر چِچہ کمڑیاں شنزگ ئنت — تھنوں سے دودھ ٹپکاتی اور بلبلاتی ہیں۔

میر چاکر اس علاقے کے نشیب و فراز سے واقف تھے اُن کو گوھر کی بات کا یقین نہیں آیا کہنے لگے :-

اِے مے مُپتی ھَنُد بینگنت — یہاں تو میرے باپ کا ڈیرہ رہا ہے
اِے رستری ھَنُد نہ تُنت — یہ درندوں کی جگہ نہیں ہے۔
ھِراں گوَرُ آتکہ رھزنے — تیری اونٹنیوں کے بچوں کو یا تو کوئی چور لے گیا ہے
یا رِنداں کتہ وُت حرکتے — اور یا پھر رندوں نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی ہے۔

اونٹنیوں کا ساربان پاس کھڑا تھا۔ میر چاکر نے اُسے بُلا کر پوچھا۔ گوہر نے

گوھر چسم جنگ راپچی ءَ — گوھر نے ساربان کو آنکھ سے اشارہ کیا
مُرداریں گنوک پاجی ءَ — اُس نادان، بیوقوف اور پاگل ساربان کو
ھِراں بہل دَتی ھرچی ءَ — اونٹنیوں کے بچوں کا صحیح حال نہ دے اُسے رہنے دے اگم کر دے
راجان ءَ مُدّے بشری ءَ — قبائل کو مصیبت میں نہ ڈالے

مگر ساربان یا تو گوھر کا اشارہ نہ سمجھ سکا اور یا پھر میر چاکر کے چابک سے ڈر گیا جو بل کھائے ہوئے سانپ کیطرح اس کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔ ساربان نے صاف صاف کہہ دیا کہ: —

— پرسوں لاشاری

پیری اسکگنت لاشاری — سیر و تفریح اور شکار کے بہانے آئے
نیمون پہ شکار د سوار ی — گھوڑے دوڑانے اور خوشی منانے کو
شنک دشادہ دلبورتاچی — وہاں سے آئے وہ بدمستوں کی طرح

شانگو رُ آتکگنت مستیگ ءَ	یہاں سے پلٹے دشمنوں کی طرح
ٹنگو رُ گشتگنت کستیگ ءَ	اور اونٹنیوں کے بچوں کو جوڑی
ھرّاں کشتگنت تجکتیگ ءَ	جوڑی کر کے ذبح کر ڈالا
آسان اِش کُنگ سجیگ ءَ	اور آگ پران کا کباب بنا کر کھایا

ساربان کی زبانی جب میر چاکر کو حقیقت معلوم ہوئی تو وہ غصے سے سانپ کیطرح بل کھانے لگا۔ وہیں سے ہر طرف گھڑ سوار دوڑا کر رندوں سے لشکر طلب کیا۔ تین دن تک وہیں بیٹھ کر رند آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے بالآخر طے پایا کہ لاشاریوں سے اس بے حرمتی کا بدلہ لیا جائے چنانچہ: ـــ

گوں نہ سد گرو ھنبریں تازیان	نوسو تیز رفتار گھوڑوں پر سوار
گوں کجسد بیر سریں دریابان	فولادی خود پہنے ہوئے نوسو رند نوجوان
ھلک ءَ رھتگنت لاشار ءَ	لاشاریوں کے ایک گاؤں پر ٹوٹ پڑے
بگش گدتگ گوا ھرام ءَ	گواھرام کے اونٹوں کے گلے کو تلواروں سے کاٹ ڈالا۔
باسکیگاں جتنت ساربان ءَ	اور ساربان کے ہاتھ قلم کر دیئے۔

اس طرح رند و لاشار کے درمیان اس خانہ جنگی کی بنیاد پڑ گئی جو پورے تیس سال تک جاری رہی، اس عرصہ میں رند و لاشار کے درمیان کئی چھوٹی بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ جن میں اکثر لڑائی رندوں کیخلاف فیصلہ کُن ثابت ہوئی۔

کہتے ہیں کہ متعدد لڑائیوں میں لاشاریوں کے ہاتھوں پے در پے شکستیں کھانے کے بعد میر چاکر نے اپنے مشہور بھانجے بیبگر کو قندھار کے خلجی حکمران کے پاس بھیجا اور اس

سے امداد طلب کی شاعر کہتا ھے :-

چاکر شکستہ بیبگر ءَ	چاکر نے بیبگر کو
اُودگوں خلجیانی خان ءَ	خلجیوں کے خان کے پاس بھیجا
شاہا! اُتکگاں باھوتی	"اے بادشاہ! میں آپ سے امداد مانگنے آیا ہوں
بخش تو لشکراں اوغان ءَ	افغانوں کا لشکر میرے ساتھ کر دیں"

اِن دنوں ہرات کے بادشاہ، شاہ حسین خلجی کی طرف سے ذنون بیگ نامی ایک مُغل قندھار کا گورنر تھا۔ اس نے پیر ولی نامی اپنے ایک سپہ سالار کو پانچ سو گھڑسواروں کا ایک دستہ دیکر میر چاکر کی امداد کے لئے بلوچستان بھیجا:-

گوئشتہ بادشاہ پہ جواتی	بادشاہ نے مہربانی سے کہا،
تئی بہرا نت پیر ولی نامانی	میرا مشہور سپہ سالار پیر ولی
	تیرے ساتھ جائے گا۔

بیبگر جب پیر ولی کو لاؤ لشکر کے ساتھ ہمراہ لے کر ڈھاڈر پہنچا تو میر چاکر بھی سبی سے اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ھوئے۔ دونوں لشکر ڈھاڈر میں ایکدوسرے سے ملے اور پھر یہاں سے میر گواھرام سے دو دو ہاتھ کرنے گنداوہ روانہ ھوئے، شاعر کہتا ھے کہ رند بہت خوش تھے :-

یستش پیر ولی گوں پئوجان	وہ پیر ولی کو فوجوں کے ساتھ دیکھ رہے تھے
پئوجانا، چو دریائی موجان	فوجیں جو دریا کی موجوں کے مانند تھیں۔
چاکر دُت سرءَ ہیت ساری	چاکر خود اُن کے آگے آگے تھا
ورنایاں مُشتنت بے ساری	نوجوان مدھوشی کے عالم میں بڑھے جا رہے تھے

اس سے قبل کہ میر چاکر اور میر گوہر کی ہی کے اس مشترکہ لشکر کا حشر بیان کیا جائے ضروری ہو جاتا ہے کہ میر گواھرام لاشاری کی بھی کیفیت بیان کی جائے کہ ریک کی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد اس پر کیا گذری -

ریک کی لڑائی اس سلسلے کی لڑائیوں میں وہ شدید ترین لڑائی ہے جس میں لاشاریوں کو شکست ہوئی - شاعر کہتا ہے کہ اس لڑائی میں : ؎

رِندگوں زھمانیں لاشاری	رِند، تلوار باز لاشاریوں کے ساتھ یوں گتھ گئے
مان اُتکنت گوُرُو کاٹاری	جیسے خنجر سینوں میں پیوست ہو جاتے ہیں
نُرسد کُشتگنت لاشاری	نو سَو لاشاریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا -
مالش رُتگنت یبّاری	اور اُن کا مال و اسباب سب لوٹ لیا گیا

اس شکست کے بعد میر گواھرام نے اپنے ھمسایہ نوحانیوں کے ہاں جاکر پناہ لی - میر عومر نوحانیوں کا سردار تھا - میر گواھرام نے اس سے جاکر کہا : -

زاناں، چاکرءِ گھار زھتکے	میں یہ جانتا ھوں کہ تم میر چاکر کے بھانجے
رِندءِ نکوُ ءُ داروکے	اور رندوں کے طرفدار ھو -
گُڈا تو اُھگاں باھوئے	لیکن اس کے باوجود بھی میں تمہاری پناہ میں آیا ھوں -
باھوتاں تئی ھنزری ءَ	تاکہ تم اپنی ھنزری[1] تلوار سے میری مدد کرو

میر عومر نے ایک بہادر اور باغیرت بلوچ کی طرح لئے اپنی امداد کا یقین دلاتے ہوئے کہا :

---

[1] ھنزری

باھوٹے منی پیرانی	تم میرے پیروں کی
پیشی زمھنیں میرانی	اور میرے تلوار باز آباواجداد کی پناہ میں ہو

شاعر کہتا ہے کہ میر گواھرام کو پناہ دینے کے بعد میر عومر نوحانی نے : ۔

ھپت سد پنڈرہ وھشت سد پیشی	سات سو بیل اور آٹھ سو دُنبے
گندم ورشتگیں سد گوالگ	پسی ہوئی گندم کی سو بوریاں
مہمانی پما گواھرام ءَ	گواھرام کو بطور مہمانی
دانگ عومر ءَ میرین ءَ	میر عومر نے دیں ۔

لھذا، ان دنوں میر گواھرام اپنے لاشاریوں کے ساتھ لوحانیوں کے علاقے میں تھے۔ جب کہ انھیں بیبرولی کی معیت میں میر چاکر کے حملہ آور ہونے کی اطلاع ملی میر گواھرام اور میر عومر کی سرکردگی میں بہت جلد لاشاریوں اور لوحانیوں کا مشترکہ لشکر بھی جمع ہونا شروع ہو گیا۔ اس لشکر نے پہاڑوں کے دامن میں نلی کے مقام کو جو تین طرف سے اونچے اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اپنے لئے میدان جنگ منتخب کیا ۔

میر چاکر اور بیبرولی کا مشترکہ لشکر جب نلی کے سامنے پہنچا تو پہاڑوں کو دیکھ کر بیبرولی گھبرا گیا اور اس نے بقول شاعر : ۔

بُرتَش ئن نلی ءَ گٹ ءُ	میر چاکر اسے (بیبرولی کو)
داشتی بیبرولی مں پٹ ءَ	نلی کی گھاٹی تک لے گئے
گوشتی بیبرولی پہ راہ ءَ	بیبرولی نے میدان میں اپنے لشکر کو روک لیا
گوئیں پوج ءِ لشکر ءِ ھمراہ ءَ	اور پھر اپنے ساتھیوں سے اُس نے کہا ۔

من ءُ پھرمان چو نہ داتہ شاہ ءُ	بادشاہ نے مجھے
کوہ دلھنڈگ ءِ دھاوا ءُ	پہاڑوں اور گھاٹیوں میں لڑنیکا فرمان نہیں
برگشتہ پلا، بے ڈاہ ءُ	اور وُہ خاموشی سے وہاں سے اپنی فوج سمیت واپس چل دیا ۔

بیبرولی کی اس بزدلانہ واپسی کے بعد میر چاکر کے لئے اب دو ہی راستے تھے ایک یہ کہ بیبرولی کے ساتھ وُہ بھی اپنے لشکر کو لے کر واپس ہوتا جب کہ دشمن سامنے کھڑا اُسے للکار رہا تھا یا یہ کہ، اپنے رندوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھتا اور لاشاریوں اور نوحانیوں کی مشترکہ طاقت سے ٹکراتا ۔ میر چاکر کے لئے دونوں صورتیں خطرناک تھیں۔ بیبرولی نے عین میدانِ جنگ میں آکر جو بزدلی دکھائی ۔ اس کا خمیازہ میر چاکر کو بہرصورت بھگتنا تھا ۔ چنانچہ اس نے ایک بہادر بلوچ کی طرح سر جھکا کر واپس ہونے پر سر بلند کر کے آگے بڑھنے کو ترجیح دی ۔ اسی وقت جبکہ رند نوجوان تلواریں سونت کر آگے بڑھنے لگے تو بیبگر نے میر چاکر کے گھوڑے کی باگیں پکڑ کر اس سے کہا،

چاکر! پرچے ءُ بے سارے	چاکر! دیوانے کیوں ہو رہے ہو۔
برساں من زرءُ گُٹ دارے	بھائیوں کو سمندر میں کیوں دھکیل رہے ہو
سردار! کینگاں کوتاہ کن	سردار! بغض و کینہ چھوڑ دو ۔
بُرزیں کھنڈگاں چھپار کن	پہاڑوں کی اُن اونچی گھاٹیوں کو اچھی طرح دیکھ لو۔
نوحانی ھزار مرد بیت	جہاں صرف نوحانی ایک ھزار مرد میدان میں جمع ہیں ۔
بیدچہ زھجنیں لاشاری	اور تلوار باز لاشاری جوان کے علاوہ ہیں

سنت پلو ءُ بجی ءُ — وہ سب ایک ساتھ تمہارے مقابل کھڑے ہیں
پیش کنزگ تراعونیگنت — جب تم ان سے ٹکراؤ گے تب آگے
بڑھنا تمہارے لئے دریائے خون میں تیرنا ہوگا
پدکنزگ پراداں هیب انت — اور پیچھے ہٹنا اُن کے لئے عیب کی بات ہوگی

بیبگر کی دانشمندانہ باتیں ناتجربہ کار اور آتش بجان رند نوجوانُن کو پسند نہ آئیں وہ مشتعل ہو کر بیبگر کو لعنت ملامت کرنے لگے۔ بقول شاعر انھوں نے کہا ! ہے

بیبگر ! تراگونڈتوں سراھمینتہ — بیبگر تمہیں لڑائیوں کے خدنگوں نے
هندیاں متوڑے داتہ — تجھے ڈرایا اور ہندی تلواروں نے
تجھے چکرا دیا ہے۔
باتیگیں تپانت گیمنتہ — ان کے ڈر سے تجھے معرکہ کا بخار چڑھ گیا ہے
ادداکہ جنوں مازھماں — (لیکن تم فکر نہ کرو۔) وہاں جب ہم تلوار
بیبگر ! تیر دوری ترا دیر نیاددں — چلائیں گے۔ تو بیبگر تجھے کمانوں سے نکلے
ہوئے تیروں کی زد سے دور بٹھا دیں گے
گلیے تئی سرءُ پر ریفول — تیرے اوپر ایک کمبل بھی ڈال دیں گے
تیراں ھژمیٔ ترٔنیوں — اور تیروں کا رُخ تجھ سے اپنی طرف پھیر لینگے
(تم دور سے بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہو)
مادجنیں لاتاری — ہم اور تلوار بازلاتاری
آپ و بنھی مان آیوں — پانی اور زمین کیطرح پیوست ہو جائیں گے
ھوشگ پنچ کنوں اپتی ءُ — جوار کے خوشوں کیطرح ایک دوسرے کو گاہ
کر رکھ دیں گے

نوُبندو گُہند - کئی سُہیت بریتا | تم دُور سے بیٹھ کر دیکھتے رہنا کہ جیت کس کی ہوتی ہے ۔

نوجوان رندوں کے ان طعن و تشنیع سے بیبگر کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اس نے میر چاکر کے گھوڑے کی باگیں چھوڑ دیں اور لشکر کے آگے آگے ہولیا۔ جب سورج نکل آیا تو رند و لاشار مست سانڈوں کی طرح آپس میں گتھ گئے ۔ شاعر کہتا ہے ۔ ؎

رَوچ ءُ کہ چیہئے بُرتہ	جب سورج کسی قدر بلند ہوا
رِند دیہاں زُیل بیتگنت	رند اپنی گھوڑیوں پر آگے بڑھے
مان اُتکگنت سانڈیں کمان	مضبوط کمانیں کڑکنے لگیں
بلاَن وشیرازی لڑان	نیزے اور شیرازی تلواریں ٹکرائیں
گوُحان و گینڈءِ اسپران	تلواروں کی ضربیں ۔ گینڈے کی کھال والی ڈھالوں پر پڑنے لگیں
جنگ بادشاہی بیتگ	بادشاہوں کی سی لڑائی کا سماں بندھ گیا
داں ھشت سدی نیکیں گجنت	تا آنکہ آٹھ سو بہادر رند میدان میں کام آگئے ۔
گوں میرھان ورزشتیں لڑءُ	میرھان اپنی طلا مُشت تلوار کے ساتھ مارا گیا ۔

بالآخر رندوں کے پاؤں میدان سے اکھڑ گئے ۔ میر چاکر کی مشہور گھوڑی سنگوات میدان میں تیر کھا کر گری ۔ میر چاکر لاشاریوں کے گھیرے میں آگیا

قریب تھا کہ لاشاری اُس کا کام تمام کر دیتے ۔ کہ نود بندگ لاشاری اس کی مدد کو پہنچا شاعر کہتا ہے :۔ ــــ

چاکر پڑ ءَ بھمنتا ست	چاکر میدان جنگ میں حیران کھڑا تھا
زھم کشتنگ وادشتا تگت	ننگی تلوار ہاتھ میں لئے
کھیری پہ گونڈ پاں داتگت	ڈھال سینے پر حفاظت کے لئے رکھے
چارٹبتہ پھلّ نود بندگ ءَ	(نود بندگ نے اُسے دیکھ لیا)
چاکر کُتنی پھلّ ءِ سر ءَ	اور پھل نامی اپنی گھوڑی) سے اتر کر
	میر چاکر کو اس پر سوار کیا
پُھلّ ءَ را چابکے جتی	پھر اس نے پھل کو ایک چابک مارا
پُھلّ گوں ھدائی کدرتاں	پھل خدا کی قدرت سے
گوُستہ اَشا سمسوریں زر ءَ	ہو گئے اس سرخ سمندر سے تیر کر پار ہو گئی
شہ گٹ و گڑ ھینوکیں گر ءَ	(اور میر چاکر کو) گھاٹیوں اور گونجنے والی
	چٹانوں کے اس پار پہنچا دیا

کہتے ہیں کہ لڑائی کے بعد جب میر گواھرام کو معلوم ہوا کہ میر چاکر کی جان نود بندگ لاشاری نے بچائی ہے تو اُسے بہت دکھ ہوا ۔ اور اس نے نود بندگ کو بلا کر اس سے پوچھا کہ : ــــ

نود بندگ ! رند لاشار نہ بیت	اے نود بندگ ! کیا تجھے معلوم نہیں
	کہ رند کبھی لاشاری نہیں بن سکتا ؟
نزعپ کرپچے ٹالا کتیں	جب یہ بات ہے تو پھر تم نے چاکر کو اپنی
	گھوڑی دیکر اس کی جان کیوں بچائی ؟

سر چو کرّٹیٰ بُرّہ تیں
چاہیئے تو یہ تھا کہ تم جوار کے خشک خوشے
کی طرح اس کا سر قلم کر دیتے

چوناں کہ مولی تھرو ڈکتیں
اور مولی کی طرح
اس کی گردن مروڑ دیتے

سیوی گوں بُڈیّت ءِ گُتیں
یا پھر تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر
تن سے جدا کر کے ہمیں سبی پر قبضہ کرلینا ہوتا

لودبندگ لاشاری نے جواب میں گراہرام سے کہا: ؎

من رند نہیاں، لاشاری آں
بیشک رند کبھی لاشاری نہیں بنتا،
اور میں رند نہیں لاشاری ہوں

اَش رندنی ءَ بیتگاں
لیکن میں رندنی کے

شیرءِ مُدی ءِ مترکگاں
بطن سے پیدا ہوا ہوں

لولی مُدی ءَ داتگنت
میں نے مُدی کا دودھ پیا ہے
مُدی نے مجھے لوریاں دی ہیں

من داب شاگیں گوازگ ءَ
اور شیشم کے جھولے میں
جھولا دے کر سلایا ہے

داتہ کہ لولی نیم شپ ءَ
آدھی آدھی راتوں کو
اپنی لوریوں میں وہ مجھ سے کہتی رہی ہے

پکار بے میرءِ چپّا کر ءَ
بیٹا: بڑے ہوکر کسی دن تم میر چاکر
کے کام آؤ گے۔ کسی لڑائی کے دن

روچے من جنگ ءِ دربرے
جنگ کے شدید طوفان میں

جنگ ءِ گرانیں رو ھوَرے

تم اس کی جان بچاؤ گے

ماراھما روچ وَرنُ ! مجھے وہ دن یاد ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ سنّی کی لڑائی میں لاشاریوں نے رندوں کو بلوچستان سے اکھاڑ پھینک دیا۔ بلوچستان میں پھر اُن کے قدم کہیں نہ جم سکے۔ میر چاکر ہرات کے بادشاہ شاہ حسین خلجی سے مدد مانگنے خود قندھار سے ہوتا ہوا ہرات گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ اس لڑائی کے بعد :-

چاکر گوں دل ءُ جیڑان ءُ	چاکر اپنے دل سے جھگڑتا
میرھان پہ غمان لیٹران ءُ	اور میرھان کے جانکاہ غم میں تڑپتا رہا
یک ماھے نہ نشتگ لوگ ءُ	گھر میں وہ ایک مہینہ بھی نہیں ٹھہر سکا
رپتگ یلو گپیں کندھار ءُ	بہت جلد روانہ ہو کر باغوں والے قندھار کو چلا گیا۔
شود ءُ من ھر یوی شہر ءُ	اور پھر وہاں سے ہرات جاکر
سُلطان شاہ حسین پہ پہر ءُ	سُلطان شاہ حسین کے پاس
گوں تُرکاں نشتگت یا ھوئی	ترکوں کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔
گرانیں لشکراں ءُ لوٹی	اور اُن سے ایک بڑے لشکر کی امداد طلب کی۔

تاریخ سے ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں بلوچوں کے تعلقات زیادہ تر قندھار اور ہرات کی حکومتوں سے وابستہ تھے ہرات اور قندھار سے کاروان تجارتی لین دین کے لئے درۂ بولان سے گذر کر سندھ اور ھند کو آتے جاتے تھے۔ جس زمانے کا

ہم ذکر کر چکے ہیں ہرات پر سلطان شاہ حسین خلجی کی حکومت تھی ۔ قندھار میں ذنون بیگ نامی اُن کا ایک گورنر رہا کرتا تھا ۔ مسٹر لانگورتھ ڈینز کی رائے میں "اس خطہ میں جس سلطان شاہ حسین کا ذکر ملتا ہے وہ غالباً سلطان حسین بیکرہ تھے جس نے ۱۴۶۸ء سے ۱۵۰۶ء تک ہرات پر حکومت کی اور ذنون بیگ اُن کے گورنر اور سپہ سالار کی حیثیت سے قندھار میں مقیم تھے ۔"

روایت کرتے ہیں کہ میر گواھرام لاشاری کو جب معلوم ہُوا کہ میر چاکر بلوچستان چھوڑ کر سلطان شاہ حسین سے امداد مانگنے ہرات گیا ہے تو اس نے بھی اپنے ایک نمائندہ کے ذریعہ دس لاکھ اشرفیاں سلطان شاہ حسین کو بطور رشوت بھجوا دیں اور سلطان سے استدعا کی کہ میر چاکر کی مدد نہ کریں ۔ اور اگر میر چاکر کو وہیں ہی قتل کرا دیا جائے تو بقول شاعر :-

دہ لکھ اشرفی شستا تہ	گواھرام نے دس لاکھ اشرفیاں
ادغان ءِ شہ ءَ بخشا تہ	افغانوں کے بادشاہ کو بھیجیں
خت و کاگدے راھداتہ	اور ایک خط بھی لکھا کہ
گار کن چاکر ءَ گوں پران	حریر پوش چاکر کو مروا دو
آسودگ بباں چہ شتران	تاکہ میں اس کی شرارتوں سے محفوظ اور آسودہ خاطر رہوں ۔
کایاں پر تئی گھالی ءَ	(اگر آپ نے مروا دیا) تب میں آپکے سلام کو آؤں گا
سال پہ سال دیاں مالی ءَ	اور سال بسال آپ کو خراج بھی دے دیا کروں گا ۔

شاہ حسین کو میر گوا ھرام کی تجویز پسند آئی ۔ چنانچہ اس نے میر گوا ھرام کو لکھا کہ

دروازگ ھریو ءُ بستگ	(ہم نے میر چاکر پر)
	ھرات کا دروازہ بند کردیا ھے
نیلاں سرمناہیں ست ءُ	اب اگر یہ ممکن ہو کر
آسمان ءُ کھرسے گرتیت	آسمان پر چڑھ کر کوئی گدھا رینگ سکے
	(تب یہ بھی ممکن ہو سکے گا کہ)
چاکر بیدا ئے تر بیت	میر چاکر یہاں سے زندہ واپس جاسکے

کہتے ہیں کہ میر چاکر تقریباً چھ سال تک ہرات میں پناہ گزیں بن کر رہا ۔ سلطان شاہ حسین نے میر گوا ھرام کی انگیخت میں آکر اُسے جان سے مار دینے کے کئی جتن کئے ۔ ملا شورن نے ایک طویل نظم میں ان واقعات کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ ایک دن بادشاہ نے میر چاکر کو اپنے دربار میں طلب کیا جب وہ حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس سے کہا ۔

گوں من زھریں شیرے اُست	میرے پاس ایک خونخوار شیر
گوں تو گوھریں تیگے اُست	اور تیرے پاس ایک جوہر دار تلوار ہے
آزمیتی گوئی ءَ شیر ءُ	(اپنی تلوار کو) اس شیر پہ آزما کر تو دیکھ

میر چاکر نے کہا مجھے منظور ھے ، تب بادشاہ نے حکم دیا اور :

شیرباں زھریں شیر بوتکہ	شیر کے رکھوالے نے
	وہ خونخوار شیر کھول دیا
شنگو ءُ چاکر وشانگو ءُ شیر	اسطرف سے چاکر اور اس طرف سے شیر
ڈیک وارتنت مزار و شیر	شیر ببر اور شیر نر آپس میں ٹکرا گئے ۔

سرداز ءَ کتگ زھمبازی	سردار (چاکر) نے تلوار کے کرتب دکھلائے
چوٹی درھنزنگ شیرازی	اور پھر اس انداز سے اپنی شیرازی تلوار سے وار کیا
ژشیر کوٹکیگ ءَ کپتہ	کہ شیر دو ٹکڑے ہو کر
میرءِ موزگاں لالیناں	میر چاکر کے سُرخ موزوں پر گرا
میرچو منگہ ءَ اوشتاتہ	میر چاکر پہلوانوں کی طرح
دست ءَ بربروتاں مُشتہ	اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا وہاں کھڑا رہا۔
تُرکی لشکر ءَ بیم زرتہ	ترکوں میں ہراس پھیل گیا۔

اس واقعہ کو زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ بادشاہ نے میر چاکر کو پھر اپنے دربار میں بلایا جب میر چاکر آیا تو بادشاہ نے اس سے کہا کہ تمہاری شہسواری کی ہم نے بڑی تعریف سنی ہے ہمارے پاس ایک گھوڑا ہے :- ے

سواری ءَ ترا بشکھایاں	وہ گھوڑا ہم سواری کے لئے آپکو دیتے ہیں
تئی مردی توکل ءَ راچاراں	اس سے ہم آپ کا توکل اور آپ کی مردانگی دیکھنا چاہتے ہیں۔
ھیت پُشت ءَ کھد تاچینی	اس گھر سے پرانے کنوئیں پر سے
کور چاپہت ءِ سرءَ درکپتی	آپ اسے سات بار کدوا کر
دوست و دشمنانی دیما	اور اس میدان میں اسے دوستوں اور دشمنوں کے سامنے دوڑ کر دکھا دیں

میر چاکر نے کہا مجھے منظور ہے۔ جب گھوڑا لایا گیا تو :-

چارءِ داشتگنت زونگءُ اگان	چار آدمیوں نے اس کی باگیں تھامی ہوئی تھیں ۔
ھشتءِ گپتگنت بادکشان	آٹھ نے پچھاڑی کی رسیاں
ھپتءِ برنج کتہ دستکشان	اور سات نے اگاڑی کی طنابیں پکڑی ہوئی تھیں ۔
آتہ آسر بیت سینج و زاگ	اس کے باوجود وہ قابو سے نکلا جارہا تھا

میر چاکر اپنی انگلی میں انگوٹھی کو پھراتے ہوئے گھوڑے کی طرف بڑھا اور اس کی گردن تھپک کر کہا :۔

تو گر دُلدُل ءِ اَولادءِ	اے گھوڑے خوب سن لے کہ) تم اگر دلدل کی اولاد ہو
من دی چاکر شیہکاں !	تو میں بھی شیہک کا بیٹا چاکر ہوں

یہ کہکر میر چاکر نے : ۔

پادی بر رکاب ءِ شپتہ	رکاب میں پاؤں ڈالا ہی تھا کہ
مثل پہ دو رواں بُرز بیتہ	جنگی گھوڑا چھلانگ لگانے کو لپکا
ھپت بر مُ پڑءِ تاجنیتی !	میر چاکر نے اُسے سات بار میدان میں دوڑایا
کورچاھت ءُ سرءِ دَر کپینتی	اور ساتوں بار اندھے کنوئیں پر سے کُدوایا
دوست و دشمنانی دیما	دوستوں اور دشمنوں کے سامنے

شاعر کہتا ہے کہ بادشاہ کا یہ وار بھی خالی گیا اب اس نے ایک بار پھر میر چاکر کو آزمائش

میں ڈالنے کی ٹھانی، زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ بادشاہ کا قاصد آیا اور اس نے میر چاکر سے کہا کہ بادشاہ نے آپکو یاد فرمایا ہے۔ آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ میر چاکر بادشاہ کے پاس گیا۔ بادشاہ نے پوچھا! ؎

مردکہ ایوک و دشہورک بی	میر چاکر! اگر آدمی اکیلا اور غیر مسلح ہو
ہتھیارکہ منتی ہچھیَ !	یعنی اس کے پاس کوئی بھی ہتھیار نہ ہو
آئی ءَ توکل چوں بیت ؟	تب اُسے لڑنے کا حوصلہ کیسے ہو سکتا ہے

میر چاکر نے جواب دیا! ؎

دست و دِل دتی ھمراہ بُنت	اگر اس کا دِل اور بازو ساتھ دیں
ہتھیار ءِ کُی ہچھیَ نیست !	تو ہتھیار کا نہ ہونا کوئی چیز نہیں

اس پر بادشاہ نے حکم دیا کہ میر چاکر کے ہتھیار لے لئے جائیں۔ جب میر چاکر کو نہتا کر دیا گیا تب بادشاہ کے حکم سے! ؎

پیل باناں گنوک بھنگی ئین	بھنگ پینے والے دیوانہ فیل بانوں نے
پیلے بوتنکگنت جنگی ئین	ایک مست اور لڑاکا ہاتھی کھول دیا۔
پیل گوں چاکر ءَ ڈیک دارتہ	ہاتھی چاکر کے ساتھ جا ٹکرایا
ھِندریے گلی ءَ دیتہ	گلی میں ایک کُتیا پڑی سو رہی تھی
گپتہ من کُچک ءَ پاداں	میر چاکر نے کُتیا کو ٹانگوں سے پکڑ کر
پیل ءَ ہمتی سر سُنٹ ءَ	لے ہاتھی کی سونڈھ پر گھما کر مارا
پیل ءَ پُشت کتہ ایرمان ءَ	ہاتھی ٹھنڈا پڑ گیا اور پیٹھ پھیر کر چلا گیا
دلیتنت گوانگر ءِ نیاڑیاں	محلات کی عورتوں نے یہ تماشا دیکھا

سُلتان ءِ جَن وسموتیسیان — جن میں سلطان کی بیگم اور ساس بھی شامل تھیں

شاعر کہتا ہے کہ سلطان کی والدہ میر چاکر کی بہادری اور بلند ہمتی سے بہت متاثر ہوئی۔ چنانچہ اس نے بر وقت سلطان کو کہلا بھیجا کر: ـــ

اے مردِ چاکرِ شیہک انت	یہ جواں مرد شیہک کا بیٹا چاکر ہے
کَوُل و وھدھی ءِ پکّیں انت	جو قول کا پابند اور وعدے کا پکا ہے
بوراں بے لگام ءَ تاچیت	جو شوخ گھوڑوں کو لگام ڈالے بغیر دوڑاتا ہے
تازی کرّگاں بے زین ءَ	تیز رفتار بچھیروں پر زین ڈالے بغیر سوار ہوتا ہے
مستیں لیٹراں، بے گوَمُس ءَ	مست سانڈ اونٹوں پر نکیل ڈالے بغیر چڑھتا ہے،
شیراں، گوں وتی زر زیر ءَ	شیروں کو اپنی مقناطیسی تلوار سے کاٹتا
پیلاں، پہ اوّل شہمات ءَ	اور مست ہاتھیوں کا منہ ایک ہی تھپیڑ سے پھیر دیتا ہے،
بخشی لشکراں گرا تیتان	خوبصورت ترکوں کا
ترکی ھمبلاں پھلیتان	اسے ایک بڑا لشکر دے دو
پیلاں گوں سریّاں سیاھیناں	ہاتھیوں کی ایک کالی قطار
زنوَں ءِ کھاریا پوجان	اور زنوں کی فوج قہار
آسمان اندھیر ءُ بیت موجان	جس کی گرد سے آسمان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ (اس کے ساتھ کر دو)
تچکیت چیلی بکنت لاشار ءَ	تاکہ وہ جاکر لاشاریوں کا قتل عام کر دے

بعد میں، شاہ حسین خود بھی میر چاکر کی شرافت، جوانمردی اور بلند رتبے سے بہت متاثر ہُوا، ایک دن اس نے میر چاکر اور اس کے بہادر ساتھیوں، بیبگر اور براہیم کو دربار میں طلب کیا، خلعت فاخرہ سے نوازا اور زنوں بیگ حاکم قندھار کے نام انہیں ایک فرمان لکھ کر دیا کہ ترکوں کی ایک بڑی فوج لے کر میر چاکر کے ساتھ خود بلوچستان جائے اور لاشاریوں کو پامال کر کے کچھی پر میر چاکر کا اقتدار بحال کرائے۔

روایت ہے کہ جب میر چاکر، زنوں بیگ کے زیر کمان سلطان شاہ حسین کی ایک فوج لے کر بلوچوں کا قتل عام کرنے بہت تیزی سے بلوچستان کی طرف آ رہا تھا۔ تو میر گوہرام لاشاری کی ماں نے ایک رات کو خواب میں دیکھا کہ، اُس نے

دوشی من شپ ءَ گوہرام ءَ	رات، سپیدہ سحر کے وقت
دابے دیستگاں پہ پہام ءَ	میرا خیال ہے کہ میں نے ایک خواب دیکھا
پیش ءَ چہ نَلی ءَ کھوَر ءَ	نلی کی پہاڑی ندی میں
ھر دھدی رگھام کُت ھوَر ءَ	اس سے پہلے جب بارش ہوتی اور سیلاب آتا
آپی رپتگ جہلا دی	تو، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے
گوئستہ ءِ زمانہ یادی	پانی ڈھلوان کی طرف بہتا
دوشی لیکراں گرئند گُرتہ	لیکن رات میں نے دیکھا کہ جب بادل گرجے
کچھیّ ءَ دہاں ژند گرُتہ	اور بارش نے کچھی کے دیہات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا
آپ ءُ بے حساب ءَ رِیتہ	پانی بے انداز برسا
آپ شتہ سرشمال بند جیتہ	یہاں تک کہ پہاڑی گھاٹیوں پر سے بھی
کوہ دکندگاں سر گرُئستہ	پانی اوپر چڑھا۔

آپ ءَ ، شہ دپ ءَ بالائی	سیلاب نے ڈھلوان سے بلندی کی طرف بہہ کر
ئے ھلگ ءَ را تپائے داتہ	ہمارے گاؤں کو غرقاب کر دیا۔

اور پھر خود اپنے خواب کی تعبیر کر کے گراهرام کی ماں نے اس سے کہا: ۔

واب ءِ منی گمانءَ ایش انت	میرے خیال میں اس خواب کی تعبیر یہ ہے
سوچیں ھما ترون اندیش انت	جس سے میرا دل بہت پریشان ہے ۔
اے سردچاکر شیہک انت	ہو نہ ہو یہ سیلاب شیہک کا بیٹا چاکر ہے
کئول و وھدی یک ڈکٹ انت	چاکر جو قول کا پابند اور وعدے کا پکا ہے
ترکانی ہوت سک انت	تجھ پر حملہ کرنے کو ترکوں کی شاہانہ
	فوج لے کر
کیئت گرں بادشاہی مُوجان	طوفان بدوش دریا کی موجوں کی طرح
کہرات چو دریائی سوجان	غصے سے بھرا ہوا چلا آ رہا ہے

ماں نے میرگراهرام کو نصیحت کی کہ :۔

گنداں کہ ترا نیست راھے	میں دیکھتی ہوں کہ تیرے لئے اس
	کے سوا اور کوئی راستہ نہیں
کہ کن تو بگیر جنگ جائے	کہ راستے سے ایک طرف ہٹ کر
	اپنے لئے کوئی میدان چن لے
لجاں برز تیرں کوھاں بر	عورتوں کو اونچے پہاڑوں پر بھیج دے
	مویشیوں کو گھاٹیوں کے اس
مالاں کھنڈگ ءَ آدیم کن	پار پہنچا دے۔

لیکن میر گوہرام پر ماں کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس خواب کو اس نے اپنی ماں کا وہ
خیال کیا اور نظر انداز کر دیا البتہ ماں کو تسلی دیتے ہوئے اس لے کہا: ؎

منءِ سوگند پہ ھدائی نامءِ	مجھے ذاتِ خدا کی قسم ہے کہ
منءِ ترس شہ چاکر شیہکءِ نیبت	مجھے شیہک کے بیٹے چاکر سے کوئی خوف
شش سال برحسابءِ گوگستگ	پورے چھ سال گنتی کے گذرے ہیں کہ
چاکر بادشاہءِ بستگ	چاکر کو بادشاہ نے قید میں ڈال رکھا ہے
شاہءِ کاگھدے راھدانگ	بادشاہ نے خط لکھ کر خود مجھے اطلاع دی
احوال چو منءِ رادانگ!	کہ ہم نے ہرات کا دروازہ میر چاکر پر بند کر
"من دروازگ ھر لیءِ لستگ"	اب اگر یہ ممکن ہو کہ
آسمانءِ کھرے گرسریت	آسمان پہ چڑھ کر کوئی گدھا رینک سکے
چاکرئیں شدا برتریت	تب یہ بھی ممکن ہو سکیگا کہ میر چاکر
	یہاں سے زندہ واپس جا سکے۔

آخر وہی ہوا جس کی گوہرام کی ماں نے خواب میں پیش بینی کی تھی۔ ایک رات دور
گرجدار آواز آنے لگی۔ میر گوہرام نیند سے جاگ اٹھا اور اس نے اپنے ساتھی نوجوانو
سے کہا: ؎

گرندانت دگرءِ ک نودانءِ	بادل گرج رہے ہیں اور بجلی کوند رہی ہے
آپ شوئے گشت لوگانءِ	اٹھو اور اپنے خیموں کی طنابیں کس لو
	پانی کے بہاؤ کا راستہ بنادو

لیکن، درحقیقت نہ تو آسمان پہ بادل تھے اور نہ ہی کہیں بجلی کڑکی تھی۔ یہ اس گھ

فوج و لشکر کے قدموں کی دھمک تھی جسے قندھارسے لاشاریوں کو تاخت و تاراج کرنے میر چاکر لا رہا تھا۔ صبح جبکہ سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ میر چاکر زنون بیگ کی سپاہ کے ساتھ لاشاریوں کے ڈیرے پر ٹوٹ پڑا اور اُن کا ایسا قتلِ عام کیا جس کی نظیر بلوچستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ شاعر کہتا ہے :

چاکر دَت ، سرءَ پُر گوانی	چاکر غصے میں بھرا ہُوا لشکر کے آگے آگے تھا
شگیرے جنگ زلماتی	اُنھوں نے اندھیری رات میں شبخون مارا
بیست و چار ھزار لاشاری	چوبیس ھزار لاشاری کام آئے ۔
سے صد کشتگنت نوھانی	اور تین سَو نوھانی تلواروں کی خوراک بنے
دپ برج جتگنت زھانی	گواھرام چپکے سے جان بچا کر بھاگ نکلا
گواھرام در شتگ پنھانی	اپنے ناموس پر قربان نہیں ہُوا ۔
حیرات مزبیت لجّانی	جان بچا کر سندھ میں در بدر کی ٹھوکریں کھانے
سندھءَ سر ڈھوریت زیانی	چلا گیا ۔

میر گواھرام اور بہادر لاشاریوں کو ایک غیر ملکی طاقت سے مغلوب کرنے کے بعد میر چاکر بھی زیادہ عرصے تک بلوچستان میں نہیں رہ سکتا۔ بالآخر با چشمِ گریان و سینۂ بریان اُسے بھی اپنی نادانشمندانہ حرکتوں کا خمیازہ بھگتنے کے لئے بلوچستان کے کوھستان چھوڑ دینے پڑے

۴۔ میر چاکر و میر گواہرام کی شاعرانہ نوک جھونک

اِس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں کہ میر چاکر رند اور میر گواہرام لاشاری کے درمیان مخا
درحقیقت اسی دن سے پیدا ہوئی تھی جس دن سردار شیہک نے رند و لاشار کے طائفوں
کہا تھا کہ اب چونکہ میں بوڑھا اور ضعیف ہو چکا ہوں۔ سرداری کی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں اٹھا
سکتا۔ اس لیے وہ میر چاکر کو اپنا سردار تسلیم کریں۔ لیکن لاشاریوں نے میر چاکر کو اپنا
ماننے سے انکار کیا۔ اور اسی دن میر گواہرام کے سر پہ پگڑی باندھ کر اسے اپنا سردار بنالیا۔

گوھر کی اونٹنیوں کے واقعہ نے اس دبی ہوئی چنگاری پر تیل کا کام کیا۔ جس سے
مخالفت کی یہ دبی ہوئی چنگاری ایک شعلۂ جوالہ بن کر بھڑک اُٹھی۔ پورے تیس سال تک
رند و لاشاری نوجوان، کچھی کے چٹیل میدانوں اور مُولہ دلبلان کی گھاٹیوں اور وادیوں میں
اپنا خون پانی کی طرح بہاتے رہے۔ تا آنکہ آئے دن کی لڑائیوں سے فریقین کی طاقت اُن
اس حد تک کمزور ہو گئی۔ کہ وہ بلوچستان میں آباد دوسرے تازہ دم قبائل کا مقابلہ کرنے کے
قابل نہ رہے، اور بالآخر سندھ و ھند کی طرف نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے

بلوچ گویوں کی زبانی اس دور کی جو نظمیں سینہ بسینہ ہم تک پہنچی ہیں۔ اُن سے
ظاہر ہوتا ہے، کہ میر چاکر و میر گواہرام نہ صرف میدان جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف
صف آرا رہے ہیں۔ بلکہ میدان ادب یعنی شعر و شاعری میں بھی وہ ایک دوسرے
کے خلاف برسرِ پیکار رہ چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی جوابی نظمیں، بلوچی میں جنہیں
"پَسّوی شیئر" کہتے ہیں کافی مشہور ہیں۔ گویّے اب تک ان نظموں کو گا کر میر چاکر
و میر گواہرام کی یاد کو تازہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود رند

لاشار قبائل کے دلوں میں کدورت کی رمق اب بھی باقی ہے، ایک رند اب بھی بلا جھجک کہتا ہے کہ: ؎

رِندءَ ھُدا لاشار نہ کنت   رند کو خدا لاشار نہ کرے

بہرحال ان جوابی نظموں کو نہ صرف تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل ہوئی ہے بلکہ بلوچی ادب میں بھی انہیں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ انکشافِ حال کے لئے ان میں سے ایک دو کا یہاں بیان کریں۔

کہتے ہیں کہ کاچان کے قریب میر گواھرام کے اذٹروں کا گلہ اور اس کے ساربان کے ہاتھ کاٹنے کے بعد جب میر چاکر پلٹا تو میر گواھرام نے اپنی چیتلی اور سبک رفتار گھوڑیوں پر سبی پہنچنے سے قبل انہیں راستہ میں جالیا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی جس میں طرفین کے کئی آدمی مارے گئے اور میر گواھرام اپنے اذٹھنک کے بچے کچھے گلوں کو رندوں سے واپس چھیننے میں کامیاب ہوا اسی لڑائی سے متاثر ہو کر کچھ دن بعد میر گواھرام نے ایک نظم کہی اور اسے ایک ڈومب کے ذریعے میر چاکر کو سنانے بھیجا۔

یہاں پر واضح لہے، کہ اُن دنوں بلوچ سوسائٹی میں شاعر پر کوئی گرفت نہیں ہوتی تھی۔ گویئے شاعر کی نظمیں یاد کر کے برملا ان افراد کی مجلس میں جا کر سناتے جن کے خلاف یہ نظمیں کہی گئی تھیں کیا مجال کہ مخاطب گویئے کو ایک لفظ بھی بُرا کہتا۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ قلات کے خان۔ میر نصیر خان نوری کے دربار میں ڈیرہ غازیخان سے ایک بلوچ شاعر آیا اور اس نے بھرے دربار میں ایک نظم سُنا کر خان کو وہ بے نقط سنائیں کہ درباری کانپ اٹھے وزیر نے خان سے کہا۔ "سرکار! کتا بھونک رہا ہے۔" خان نے جواب دیا! "ہاں، مگر کچھ دیکھ کر بھونکتا ہے" اس کے باوجود خان نصیر خان نوری نے شاعر کو خلعت دے کر رخصت کیا۔ یہ بلوچوں کا ایک قدیم رواج تھا۔ بلوچستان میں جہاں

قبائلیت کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے ، اس رواج کی پابندی اب بھی کی جاتی ہے ،
چنانچہ ، میر گوآهرام اپنی اس نظم میں میر چاکر سے کہتا ہے : ؎

مائُکا بِل بوں ۔ برهنگیں ڈنے
گور خیریں ڈنانی سلاکلتے

ایک دن ایک چٹیل میدان میں چھوڑا
ایک ایسے میدان میں جو گورخوں اور تلیر کی چراگاہ تھا ۔

آسرو اُمیتوں نہ ٹٹ چو شیں
یسرءِ کائنت رندو ڈومبا کی
نجو و جتوئیءِ تنا دانی

ہم کو یہ اُمید نہ تھی کہ
رند اور ڈومبکی ایک ساتھ آئیں گے
اور منجبر اور بانکے جتوئی بھی ان کے ساتھ ہوں گے ۔

ماجتہ چاپنولے بدیاں ءَ
وش هموهلک ءِ هوں مِتی گپتہ
چاکرءِ شتہ سشہ گوری جوتکہ

اس کے باوجود ہم دشمن پر جھپٹے ہم نے دان
سے اپنے خون کا انتقام لے لیا ۔
چاکر کے لئے اب تو ایک ہی کام رہ گیا ہے کہ کسی درخت سے ایک ٹہنی توڑ کر

داتگی وسلئیءَ پہ آگو کاں
سَرَوَ نگیں گاو میشاں بچارینی
دکھواں نرکیان حسن منتی
دستی شہ بازیں جچکاں لیئنت

بیلوں کو اس سے ہانکا کرے
یا سُرمہ جیسی کالی بھینسیں چرائے
حسن کا پیمار رہیان اس کے لئے دودھ بلوئے
دودھ بلوتے بلوتے اس کے ہاتھوں پر چھالے پڑ جائیں ۔

دکھراں کو ھو بارت پہ آمیرءَ
ہُمر نہ بندیت پہ نشتگیں ستان
آمزان پادیلیں جنءِ زو کان

اور کوہو میر چاکر کے لئے لسی مانگ لایا کرے
چاکر اب مجلسوں میں بیٹھ کر
یا بڑے جماعتوں والی اپنی بیوی کے سامنے شیخیں بگھار

جواب میں میر چاکر نے بھی ایک طویل نظم کہہ کر ایک ڈوم گویئے کے ذریعے میر گوالعلام کو بھیجی میر گواھرام سے مخاطب ہو کر میر چاکر نے کہا:۔

نیاہنئ اُد گواھرام اگوں مئے بڈّان	غارت ہو لے گواھرام! تم آنی ڈینگیں کیوں مارتے ہو؟
گوں بلوچی تیں نگھدہ و سڈّان	کیا کسی بلوچ کو للکارنے اور اس پر آوازے کسنے کا یہی طریقہ ہے؟
یکبرے ناز بیتئے وتی بازی	بس ایکدفعہ تجھے فتح حاصل ہوئی اور تیلی
بائی دات رِند و بارگیں تازی	تیزرفتار گھوڑیوں والے رند بازی ہار گئے
پہ ھما باندات ءَ گرا رِبیئے	اسی گذرے ہوئے دن پر تم آج تک ناز کرتے ہو،
روچ من گرانین پیہن و جنگے	اور اس سخت اور پسینے والی لڑائی کو بھول جاتے ہو جبکہ
تو گشتہ گوری پُرشگیں رُمبان	گور (ہرن) کیطرح چوکڑیاں بھرتے ہوئے تم بھاگ کھڑے ہوئے تھے
اش پدا رِندی گوندلاں دارتے	پیچھے سے رندوں کی خدنگیں
من سگوندان دبز ترین جاھاں	پتلی پشت اور موٹے کولہوں پر سہتے ہوئے
رُستے اش درپانی کلات زُرتے	داہوتی کے قلعہ سے تو تم بھاگے
گینت من مولائی دپ ءَ کشتی	تو مولا کے دہانے پر پہنچ کر سانس لینے کو رکے
	لیکن میں نے اس دن بھی
بلے من تراچہ شین ءَ نہ جت آھو	تجھ ایسے طعنے نہیں دیئے

شئیر بہ پرخاشاں نہ شستاتاں

اور نہ ہی تجھے کوئی ایسی ہتک آمیز
نظم بھیجی

پُسّو گوں چنگانی اُگھازیاں

جس کا جواب تم کسی گانے بجانے والے
کے ساتھ بھیجتے

داں تئی بالادءَ سہادیءَ
اَش منی چانُبولءَ مزاریءَ
تو مچلّے من گوشں بُن ءَ وارتے

میں نے تیرے قابلِ احترام قد و قامت کو
اس وقت بھی نہیں چھیڑا جب کہ
تو نے میرے شیر جیسے پنجوں کی
ایک چپت اپنی کنپٹی پر کھائی

سرترّ ھاں بیتے چو گرّگیں مادِ ھیاں
سرتہّر جءِ من آلم ءِ گنڈءَ

اور چکرا کر پھیری کیطرح جو بھاگے
تو اب تک دنیا کے گوشے گوشے میں
سرگرداں پھرتے ہو،

ڈلیءَ بوریں چادرءَ جلّے
من سرءَ سیاھیں اشکراں ڈھوئے
ماھما رِندو بارگیں بوردں
گاہے برزین و گاہ دری زیتوں

اپنے مٹیالے رنگ کی چادر میں ٹوپیہ جمع کرتے
اور اپنے سر پہ کالے مٹکے ڈھوتے ہو
ہم تو وہی پتلی گھوڑیوں والے رند ہیں۔
کبھی ہم زین پہ ہوتے ہیں
اور کبھی زین سے الگ

گاہے گوں تاوانءَ شریکداروں
گاہے گوں سیت ءَ سے سرءَ کالیوں

کبھی نقصان اُٹھاتے ہیں
اور کبھی تین گنا منافع کے ساتھ لوٹتے ہیں

ایک اور نظم میں بیرگو آھرام طعنے دیتے ہوئے میر چاکر سے
کہتا ہے :۔

چاکر! ترا مردی کجینگے مان نت
جہلّ ءِ گوں جہلاوپہ نگوار بتنے
سیخ گوں سنگوات ءِ نہ پر بتیتے

چاکر! تجھ میں اگر اتنی مردانگی تھی
تو جھل سے جہلاوان کیطرف نہ بھاگتے
اور اپنی گھوڑی سنگوات کو
مع ساز و سامان سمیت نہ چھوڑ جاتے

شاہ من ءِ بارہئے بدنت ہچے
آسی لایاں چہ دکنی گورت ءِ
بن گرنت گرا نبو لوگھ بکھانی
تو سنگ ءِ دلی ءِ ترک دل حکیم بنت

میری دعا ہے کہ خدا ایک دن وہ موقع دے
جب میں جنوب کی طوفانی ہواؤں کیطرح
تمہارے سرپہ اُمڈ آؤں
اور ایک ایسی آگ بھڑکاؤں
کہ تمہارے امیرانہ گھربار جل کر راکھ ہوجائیں
اور دھلی کا ترک بادشاہ بھی
اُسے بجھانے سے عاجز آجائے

چاکر! نہ جولیں کھنڈگاں بُرزبیت

چاکر! اُس دن تم گہری کھائی
سے اوپر کی طرف چڑھ کر بھاگے

کوشتی من درنچکانی برزیں سای ءِ
منتگیں گرکی اَشش پدا گندیت

اور پھر درختوں کے گھنے سائے میں:
تھکے ہوئے بھیڑیے کیطرح ٹھہر کر
پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتے رہے

ھر دیارے من حبشی ءِ ستیوی

اور اب سبّی کے مشہور شہر میں
تم روٹی کا ایک ایک لقمہ دکھ کیسا تھ کھاتے
ہو۔

چاکر! پہ ترندانیں گھمے زیریت

چاکر! اب بہتر ہے کہ تم
ان علاقوں میں چلے جاؤ

چاکرا نیں برہ ھما ملک ءُ کہ گوئن لُپشنت	جہاں گوئن پکتے ہیں
ھالُرءُ وانی شیرگت گواہ بنت	اور جہاں آلٹروؤں کا شیرہ
مس ءُ دپ وردیم و برنگنیں ریشاں	تمہارے چہرہ منہ اور گھنی ڈاڑھی پر چپک کر تیرے افلاس کی گواہی دیتا ہے
چک شریک بے ءُ گوں جت وگنڈ پاگگاں	اب تم سار بانوں اور گوالوں کے ساتھ رشتے ناطے کرو۔
تا الت پہ جاموٹی بگا لائنت	تاکہ تمہاری بیویاں جاموٹی (سرائیکی) زبان میں بات کریں
پُچکاں پہ جدگالی ءَ لیلا ئنت	اور اپنے بچوں کو جدگالی زبان میں لوریاں دیا کریں۔

اس طنزیہ نظم کے جواب میں میر چاکر نے ریک کی اس لڑائی کی طرف اشارہ کیا جس میں لاشاریوں کو شکست ہوئی تھی۔ اور میر گواہرام اپنا اہل و عیال چھوڑ کر بھاگا تھا۔ میر چاکر کہتا ہے۔ ے

گواھرام! اگر ترا مردی ءِ ٹیڑھے بیتین	گواھرام! اگر تم میں ذرا بھر بھی مردانگی ہوتی
تو دتی پت مات پچ نہ ءُ جینیے	تو تم اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر نہ بھاگتے
سُندت سرگند گوں زرگری سہتاں	(تمہاری سوتیلی ماں) سرکند زرگروں کے بنائے ہوئے زیورات سے لدی پھندی
گوں ھراتی ابریشمیں رکھتاں	ہرات کے ریشمی ملبوسات اور سونے
گوں چپّہ دپراہ کمنڈیں کنڈلیان	کی انگوٹھیاں اور گول سرخ والے کنگن پہنے

من شپیت وتی مُل ءِ کھیبریں ونگ ءَ	ہماری بندی نہ بنتی میں نے سرکند کو اپنی گھوڑی کی چوڑی بیٹھ پہ بیٹھایا
مُل ءَ من مہیلاداءَ ژلانگیثہ	اور مُوکَر میں اس کے زیورات کھنکتے اور بجتے رہے ۔

میر گواھرام نے اس کے جواب میں جو طنزیہ نظم کہی اس میں نلی کی لڑائی کا ذکر چھیڑا ۔ نلی کی لڑائی میں میر چاکر کو لاشاریوں کے ہاتھوں جو فیصلہ کن شکست ہوئی تھی اس کا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں میر گواھرام کی یہ نظم بلوچی کی طنزیہ شاعری میں اپنی نظیر نہیں رکھتی اس میں میر گواھرام کا زورِ بیان اُس کے جذبات کے طوفان کے ساتھ امڈتا چلا آتا ھے ، نظم طویل ہے ذیل میں اس سے بس ایک مختصر اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ھے ، میر چاکر سے خطاب کرکے میر گواھرام کہتا ھے کہ نلی کی لڑائی کے دن ! ؎

من کہ جو لَبش ءِ لہُکر ءَ رتستاں تئی سرءَ توپھانی ایر پرُشتاں تو وتی ساہ پہ اُرجنگ زیتے ءَ	میں ساون کی گھٹاؤں کی طرح پہنچا اور طوفان کی طرح تم پر ٹوٹ پڑا تم نے کھینچ تان کر اپنی زندگی مجھ سے چھین لی ۔
بورت پہ ڈور ءِ نیمگ ءَ تاچینت چو گُڈطو ءَ سر ءِ پہ تے مسری ورنگ ءَ	تم نے اپنا گھوڑا ندی کی طرف دوڑایا اور پہاڑی دنبے کی طرح اوپر کی چٹان سے تم چکرا کر گرے
نیلگیں گوزُمانی بُن ءَ کپتے ،	نیلے پانی کی جھیل میں

چوبٹ ءَ ٹبیگاں دراں بیتے
کپی شہ سبزیں سُتکن ءَ پٹت
شہ کباھانی بارگیں چیلان
شہ سگار ءِ تئی زرلشتیں مُشت ءَ

نیچے جھیل میں گر کر تم اس کی تہ میں پہنچ
اور مرغابی کی طرح ڈبکیاں لیتے ہو
جب باہر نکلے تو تمہاری سبز رنگ کی شلوار سے
تمہاری قبا کی شکنوں سے اور
تمہاری تلوار کے چاندی منڈھے دستے سے
پانی ٹپک رہا تھا

انگتہ تننگ ءَ تُختے لوگ ءَ
پہر نہ سندے نیں چیر نہ جنڈیں

لیکن تم پیاسے ہی گھر کو گئے
اب تم اپنی بہادری پر پھر کبھی فخر نہیں کرو گے
اور نہ ہی اس سرزمین پر پھیل پھول
سکو گے۔

ھپت زر و ھپتاد کوہ بگوازینے

چاکر! اگر تم سات سمندروں اور
ستر پہاڑوں کے پار بھی چلے جاؤ

سر بری استیناں چنے تخت ءَ
ڈھاڈر ءِ جُنبیاں پہ سرءَ زیرے
ترا اَرمیرھان ءِ بیل نہ بنت جنگی

بادلوں پر اپنا تخت بچھاؤ
ڈھاڈر کی پہاڑیوں کو اپنے سر پر اٹھاؤ
تب بھی میرھان زندہ ہو کر تمہاری
لڑائیوں کا ساتھی نہیں بنے گا

باز بمارے منی تشکلیں کاران
منی سگارانی شادہ ءِ روچان

میں نے تجھے جن مشکلوں میں پھنسایا
ہے انہیں تم بہت یاد کیا کرو گے۔
میری تلواروں کی خوشی کے دن کو

منی اسپرانی پیش کنزگ ءِ دھد ءَ

اور میری ڈھالوں کے آگے بڑھنے کی
گھڑی کو

تم کبھی نہیں بھول سکو گے

گوشتنت، چاکر شیہک چو سروءِ وانانت	لوگ کہتے تھے کہ شیہک کا بیٹا چاکر سرو کا ایک ایسا درخت ہے
من بُن ءَ ھُشک ءُ سرءَ سبزانت	جس کا تنا تو خشک ہے لیکن اوپر کی شاخیں سرسبز ہیں ۔
شاھے من ھندو شاھے من سندانت	اُس کی ایک شاخ ھند میں اور دوسری سندھ میں ہے ۔
چیرگتی دیوان ومراگاہ انت	اس کے نیچے مجلسیں اور محفلیں جمتی ھیں
چاکر ا ترا گدّلتہ منی پولادیں تبرزین ءَ	مگر چاکر! میری فولادی کلہاڑی نے اب تمہیں کاٹ کر پھینک دیا ہے
کپتگئے گوَرءَ پاندو نگوں دیما	تم اب زمین پر سینے کے بل پڑے ہو
نے نگواتئے بارت نئے مھارت ٹیلینت	نہ ہوا تمہیں اب ہلا سکتی ہے اور نہ سیلاب تمہیں بہا کر لے جا سکتا ہے
انگتہ گوں من وبیلانی رہ ترے	اگر اب بھی تم باز نہیں آؤ گے اور میرے اور میرے ساتھیوں کے راستے میں رکاوٹ بننے کی کوشش کرو گے ۔
پرکینگی کپئت بگلماشان	تو میں تربوز کی طرح تجھے دو ٹکڑے کردوں گا ۔

میر چاکر نے جواب میں ایک اور لڑائی کی طرف اشارہ کیا جس میں اگرچہ

رندوں کا شدید اتلاف جان ہُوا تھا۔ لیکن شکست لاشاریوں کو ہوئی تھ
چنانچہ میر چاکر کہتا ہے ؎

وت گلا، لاشاری تئی نام انت
اُو خود ستا لاشاری !
گواھرام تمہارا بھی نام ہے

کینگ و مردی زیح ترا چی نے
تم میں تو جوانمردوں کیطرح دشمنی
کرنے کا جوھر ہی نہیں

شہ منی شہاتاں سزاریاں
میری ایک شیرانہ چیت سے

تابلے سُ چیتیں گوش بن ءَ دارتئے
جو بائیں کنپٹی پر تم نے کھائی

پاگت برانی اش سرءَ کپتہ
تمہاری ریشمی پگڑی گر پڑی

اُش نلیاں و تنک دیمیں گٹان
میں نے تمہیں پہاڑی ندیوں
تنگ گھاٹیوں میں سے کسی ک

سن تراسیرئی ڈطور داتاں
مار بھگایا۔

تئی ترک کرو ھنتنت چو اسپری گواپاں
تمہارے ترک ربہادر لاشاری

کپتنت چو سرکنڈی تلیں داراں
ڈھال کی کڑیوں کی طرح کٹ گ

وڑ وڑ ووتیت چو وارثہ ئیں شاگ ءَ
سرکنڈے کی چری ہوئی لکڑی کیطرح
ٹوٹ کر گرے۔
اور شیشم کی خشک لکڑی کی طرح
ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے

بیئت ھما مرد کہ دھڈھی اتکہ
تمہارے سامنے وہ بہادر آئے

کذھی بیتہ بیتہ حسابانی
جس کی موت آئی ہوئی ہو
جس کی زندگی کا پیالہ لبریز ہو چکا ہو

من دی اُشش شاھیں کادرِ کوٹاں	میں بھی خدا سے سبتی کے ایک ہی
سوب اے پہ سیوی لوتریں رندان	دادے کی اولاد رندوں کے لئے
گیشتر شہ جیڑ پادوتنگ رلیشاں	چھوٹے پاؤں اور چھدری ڈاڑھیوں والے لاشاریوں پر فتح پانے کی دُعا
اُش پدا چک چین و منگل رہے پنت	مانگتا ہوں۔ آخر، ایک دن قندھار کی فوجوں کو
قندھاری پوجاں من سرءَ زیراں	ساتھ لے کر منگولوں کی طرح میں تمہارا قتلِ عام کرادوں گا۔
تی گرانزگی تچلان ءَ نہ پرداچان	اور تمہارے گھروں میں جھاڑو پھروا دونگا یہاں تک کہ پنگھوڑوں میں پڑے ہوئے تمہارے بچوں کو بھی معاف نہیں کرونگا

الغرض گوھر کی اونٹنیوں کے بہانے رند و لاشار تیس سال تک کچھی کے میدانوں میں اپنے گلے کاٹتے رہے۔ بالآخر میر چاکر نے ہرات کے بادشاہ سے امداد لے کر افغانوں کی طاقت سے بلوچوں کا قتلِ عام کرایا۔ میر چاکر اور اس کے ساتھ بچے کھچے لاشاریوں نے جان بچا کر سندھ میں پناہ لی۔ لیکن میر چاکر بھی اُن کے بعد زیادہ عرصہ کچھی میں نہ رہ سکا۔ تیس سالہ خانہ جنگی سے علاقہ میں جو تباہی پھیل چکی تھی اس کے اثرات شدید سے شدید تر ہوتے گئے بھوک اور افلاس نے آبادیوں کو گھیر لیا۔ بستیاں اُجڑ گئیں۔ گاؤں کے گاؤں بے چراغ پڑے رہے۔ چراگاہیں بنجر بن گئیں اور اسی طرح میر چاکر کو بھی کچھی سے رختِ سفر

باندھ کر ملتان کی راہ لینی پڑی۔

سمی کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہتے وقت میر چاکر کے دل پر جو کیفیت گذری اسے اس نے ایک نظم میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے جذبات سے مغلوب ہو کر میر چاکر کہتا ہے :-

بہلاں مرد لواشیں سمی	جوانمردوں کو پچھلنے والے سمی!
جئوریں بدانی مر گیوی	میں تجھے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔
سے رد چاں بیت گواھرام ءِ	میرے زہریلے دشمن کو موت آئے جنہوں نے تجھے سمی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ (یعنی گواھرام کا ماتم کرے)
گواھرام وجیں گنداوگ	گرد و غبار والے گنداواہ میں رہنے والے گواھرام نے
بنگے من زرءِ پرنیتگ	سمندر میں ایک ایسا پتھر پھینکا جس سے زہریلی موجیں اٹھیں
مپیاں لواشت ۔ لنجا ئنت	اور مچھلیاں گہرائیوں سے باہر آ کر تڑپنے لگیں
سی سال ءِ وت واشمار ءَ	گنتی کے پورے تیس ۳۰ سال
جان ءِ جابواں جنگی یم	ہم آپس میں لڑتے رہے
تیگھ چو بلگو ءَ ہونی ئیں	جنگی ترکشوں کے تیروں سے ہمارے جسم چھلنی ہو گئے
چو شت چو کند ءِ بوگان	ہماری تلواروں پر خون جم گیا

بُجگان ءَ نشتنت لمہڈیان
ورنایاں دو مندلیسان
لہڈمں دیروان ءَ رگستنت

پاگش پہ کپیج بستنت

مسکاں من بروتاں مشتنت
بوراں بے لگام ءَ تاکنت
دُرّدِشں دمبگاں میشانی
کہروالی شراب شرجوشیں
شاواں پہ نشاں یکے نیست
دستاں ہچ تگنت ہندیگاں
تیگہاں پہ ساہ ءَ زیرتاں
شرتاں داگلوں شومیاں
بچکی لوار بازیاں !
بگّش گردگیں بے شوان ہنت
یاگہی ئیں کلات بے رون ہنت

سیوی گھوڑوی گرداں بات

اور وہ گئے۔ کی گانٹھوں کیطرح ٹیڑھی ہو گئیں
اب وہ خوشنما میانوں میں نہیں پڑتیں
وہ نوجوان جو زرہ بکتر سے خود پہنا کرتے تھے
جو ڈھیروں میں ناز و نعمت میں پل کر
جوان ہوئے تھے۔

جو ایک خاص ادا سے
اپنی پگڑیاں باندھا کرتے۔

اور اپنی مونچھوں پر مشک ملتے تھے۔
جو تازی گھوڑوں کو لگام ڈالے بنا دوڑاتے
دُنبوں کی چکیاں کھاتے۔
اور عمدہ خانہ ساز شراب پیتے تھے
آج اُن میں سے ایک بھی نظر نہیں آتا
اُن سب کو ہندی تلواریں چاٹ چکی ہیں
وہ تلواروں کی تیز گھاٹ اُتر چکے ہیں
منحوس شرطوں نے بچگانہ لہو و لعب میں
ہم انہیں ہار چکے ہیں آج اُن کے
اونٹوں کے گلوں کا رکھوالا کوئی نہیں
اور نہ ہی باغی قلعوں کے سر کرنے والا
کوئی نوجوان باقی ہے
سبی گھڑ سواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں
سے اُٹھی ہوئی گرد میں کھو جائے۔

شومیں گوہرہو ھر جاں بات	بد نصیب گوھر غارت ہو
گواھرام نہ دو جائے جابات	اور گواھرام کو دو جگہوں میں سے ایک بھی نصیب نہ ہو۔
گوربات، نئے، ممیں گنداوہ	نہ اسے گنداوہ ملے اور نہ ہی قبر نصیب ہو

کہتے ہیں کہ بلوچستان سے نکل کر میر گواھرام سندھ پہنچا اور وہاں ہوم مری کے گرد نواح میں کہیں جاکر آباد ہوا۔ وطن کی محبت آسانی سے دل سے اٹھنے کی چیز نہیں ہوتی۔ سندھ میں میر گواھرام کو رہ رہ کر بلوچستان کی یاد ستاتی تھی چنانچہ کہتا ہے: سے

پہ سے چیاں تمام بارظیاں	تین چیزوں کے لئے میں بہت ترستا ہوں۔
درنگ ہو ساسراں سار تیناں	چٹانوں کی ٹھنڈی چھاؤں کے لئے
گوسُرکی دمیگاں تہلیناں	بروں کی چلتی کے کرٹنے گوشت کیلئے
نخینتی سور ڈی ئیں آپاں	اور پہاڑی ندیوں سے ریس ریس کر نکلنے والے کھارے پانی کے لئے
شما زینگنُت زوراکاں	جو طاقتور دشمنوں نے ہم سے چھین لئے ہیں۔

یہ تینوں چیزیں مادر وطن بلوچستان کے علاوہ میر گواھرام کو اور کہاں مل سکتی تھیں۔ لیکن ان کے لئے وہ پھر کبھی بلوچستان نہیں گیا البتہ اس کا بیٹا بگر ایکدفعہ گنداوہ آیا۔ مگر گنداواہ میں اب اس کے شہر لینے کی

نااَش نہیں تھی وہ زمینیں جو کسی وقت اُن کے قبیلے کے پاس تھیں اب دوسرے بلوچوں کے قبضے میں جا چکی تھیں لاشاریوں کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ ان حالات سے متاثر ہو کر میر تکرے نے کہا: ـــ

کچھی نہ بیرامے من رے	کچھی ! اب تو ہمیں راس نہیں آئے گی
شُھوز کنے تو خوشگاں	گوکہ تو اب بھی جواری کے خوشوں کو سُرخ رنگ دیتی ہے
شوری داں گنجیں مٹھڑی	لیکن، تیری یہ سرزمین شوری سے لے کر مٹھڑی تک کا زرخیز علاقہ
دُرسِتنش منی سُوز ءِ جونت	جو کسی وقت ہمارے گھوڑوں کیلئے جَو پیدا کرتا تھا۔
راجے ہنگتو اِشش کننت	اَب ان لوگوں کے قبضہ میں ہے
مور دا نگُنش مُنڈ بتیگنت	جو مگسی کہلاتے ہیں، جن کی انگلیاں ہمارے
مءُ کاسگانی چٹگ ءَ	برتن چاٹتے چاٹتے گھس گئی تھیں۔
تو ڑا سِلاح زیرنت منی	اور جو ہمارے ہتھیار اُٹھانے والے نوکر تھے
ملکاں ھما مرد وَرنت !	ان زمینوں کی پیداوار اب وہی کھاتے ہیں
دُوراں بلوچ ڈھلینت گنت	افسوس کہ زمانے نے بلوچوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے
گواھرام و چاکر پہ ذناں	گواھرام اور چاکر آپس میں لڑتے رہے
ھوناں پہ لاپ ءِ سلیری ءَ	اور اس طرح ان بہادروں نے ناقصوں
پِیلگُوں ھِرناں داتگنت	کو حوروں سمیت کھو دیا۔
نزکاں منی برات بنگویں	

	ترکوں نے میرے باغ کے پیچھے
بامی سراں اپر گیتنگنت	کو بام فلک سے فرش زمین پر پھینکا
لمبیں درباب دَرکینتگنت	اور ان سے دریائے زین عبور
دزگارنگنت کموم و کمبار	ہمارے قبیلے کے جوشیلے نوجوان جمع ہوئے۔
چندی سد و چندی هزار	سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں
گڈھ بلوچ ڈاہ داتگنت	بلوچوں (الاشاریوں) کو علی الصبح ان حملے کی خبر ملی
سُہبی تں دھنزیں دِگرہ	صبح سے غبار آلود عصر تک
لوت و مزن گواتیں سگر	تنومند جسموں اور پُرغرور سروں کو
تیغاں گڑبی رپتگنت	تلواریں جواری کی فصل کی طرح کاٹتی رہیں۔

دوسرا باب

۱- چار قول

بلوچوں کے قدیم شعرا کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر چاکر و میر گواھرام کے زمانے کے بلوچ ایک لاابالی طبیعت اور بانکپن رکھتے تھے۔ گوھر کی اونٹیوں پر میر چاکر و میر گواھرام کی آویزش سے قبل وہ غم روزگار سے بے نیاز تھے۔ رزم جوئی۔ عشق بازی، بزم آرائی اور شعرو شاعری کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ ان ہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن کچھ بانکے سجیلے رند میر چاکر کی مجلس میں بیٹھے مے نوشی سے دل بہلا رہے تھے۔ خدا جانے کیسے بات چل نکلی اور ان رند نوجوانوں نے اپنی اپنی بڑائی بہادری اور قول کی پابندی جتلانے کے لئے شیخیاں بگھارنی شروع کیں۔ شاعر کہتا ہے کہ سب سے پہلے میر چاکر نے ترنگ میں آکر کہا:۔ ؎

اکرار ئیت من ءَ ھم باور	یہ میرا وعدہ ہے اور مجھے اپنی ذات پہ پورا بھروسہ ہے
کہ زندگاں دنیا در	کہ جب تک میں دنیا میں زندہ رہوں گا
دروغ ءَ نہ براں ہچبر	جھوٹ کبھی نہیں بولوں گا

میر چاکر کے پاس ہی ببر کا البیلا بیٹا ھیبتان بیٹھا تھا۔ وہ کسی سے دبنے والا

کب تھا جھٹ بول اُٹھا:-

ہر کس ءِ اُشتر بیئت منی نگ ءَ — جس کا اونٹ بھی میرے اونٹوں کے گلے میں آکر ملے گا۔

کوّل انت من چہ کُش ءَ نہ دئیں گ ءَ — وعدہ ہے کہ میں اُسے اس کے مالک کو واپس کبھی نہیں دوں گا۔

جگ، دل حکیم بی اگرٹ دی نہ دگ ءَ — اگر ایک جہان بھی اُسے واپس لینے آئے تو وہ بھی مایوس ہو کر اسی راستے واپس

میر جلب کا بیٹا جاڑو، جو اپنی نڈرتا۔ جانبازی، اور مہم جوئی کے لئے بہت
تھا هیبتان کے مقابلے میں خاموش کیسے رہ سکتا تھا اپنی کالی ڈاڑھی پر تین بار ہاتھ پھیرتے
ہوئے اس نے کہا:-

ہر کہ منی ریش ءَ را بجنت دست ءَ — جو شخص بھی میری ڈاڑھی کو ہاتھ لگا
وعدہ ہے کہ میں اُسے ہرگز زندہ نہیں
زندگانی نیلاں پہ دل پُرکست ءَ — چھوڑوں گا۔

درویش صفت تھے مبارک کا عاشق مزاج بیٹا مُرید بھی اس مجلس میں تھا
اس نے بھی جام اٹھا کر قول کیا:-

کوّل انت من ءَ چو ھوتمر ءَ — میں عومر کی طرح قول کرتا ہوں
چو ھوتمر ءَ کوّل انت من ءَ — قول کرتا ہوں میں عومر کی طرح کہ
کتے بلوٹیت دادن ءَ — اگر کوئی مانگنے والا مجھ سے بخشش مانگے
من دادن ءَ گنداں نہ بال — بخشش دینے میں میرا ہاتھ کبھی نہیں رکے

بند بیگی مردے نہیاں	جس سا تھ کئے والا شخص نہیں ہوں ۔

اس طرح ان چار البیلے رندوں نے چار قول کئے ۔ وہ جو کہتے ہیں کہ قول مردان جان دارد، ان چار رندوں پر صادق آتا ہے ۔ جس طرح گوھر کی اونٹنیوں کے لئے تیس سالہ خانہ جنگی نے رند لاشار کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں ۔ اسی طرح ان چار رندوں کے اقوال نے بھی کئی گھرانے اجاڑ دیئے ، بلوچ شاعروں نے اس سلسلے میں جو واقعات بیان کئے ہیں وہ دلچسپی سے خالی نہیں ۔

ھیبتان کی آزمائش

کہتے ہیں کہ رندوں کے اس قول و اقرار کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ایک دن میر جاکر کی اونٹنیوں کا سانڈ بھاگ کر میر ھیبتان کے گلے میں جا ملا ۔ شاعر کہتا ہے :-

دیر نہ بیثہ کہ چاکرءِ لوکءَ جھتگ	دیر نہیں گذری کہ میر چاکر کی اونٹنیوں کا سانڈ بھاگا ۔
ھیبتان بیکر وشیں سیاہ گوانان شتگ	اور بھاگ کر ھیبتان بیبکر کے رات کی طرح کالے اونٹوں کے گلے میں جا ملا ۔
ھیبتان بیکر ءَ پہ پیسرءِ کَول ءَ جلتگ	ھیبتان نے اپنے قول کے مطابق اسے روک لیا ۔

اطلاع پاکر رند نوجوان میر چاکر کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ ہم آپ کی اونٹنیوں کے سانڈ کو ھیبتان کے پاس رہنے نہیں دیں گے ۔ ھیبتان یا تو اُسے خوشی سے واپس

کر دے یا ہم بزور بازو اُس سے سانڈ کو واپس لے آئیں گے ۔

میر چاکر ایک دور اندیش اور مدبر سردار تھا ۔ وہ جانتا تھا کہ ھیبتان ان نوجوانوں کی
بس آکر اپنے قول سے پھرنے والا شخص نہیں ہے ۔ وہ رندوں سے لڑے گا ۔ ایک اونٹ کے لیے
ھیبتان کو ناراض کرنا اور رندوں کو آپس میں کٹوانا دانشمندی نہیں ۔ میر چاکر نے ان مشتعل نوجوانوں
کو سمجھا دیا کہ اُن کا خیال درست نہیں ۔ ایک اونٹ کے لیے ھیبتان سے ہم نہیں لڑیں گے
میر چاکر نے کہا : ؎

چیذ بھالو کاں من پما شپ بوگیں گلان	ایسے کئی سانڈ راتوں کی محفلوں میں اپنا دل بہلانے کے لئے
پہ اگا زیگ وشا ئیریں ڈومباں دانگان	شاعروں اور ڈوم گویوں کو دیتا رہتا ہوں
پہ سوالیگ و رھگوزی مرداں بخشانگان	خیرات مانگنے والوں اور مسافروں کو بخش دیتا ہوں ۔
پہ نام اللہ ءَ من پھکیراں ءَ دا تگان	اور فقیروں کو خدا کے نام پر دے دیا کرتا ہوں

شاعر کہتا ہے کہ رند نوجوان ابتک میر چاکر کی مجلس میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک ساربان
بھاگتا ہوا آیا اور آکر اس نے اطلاع دی کہ ؎

بہلت او رنداں ! مجلس و میری کادیر داں	رندو ! اپنی مجلسوں اور امیرانہ محفلوں کو اب چھوڑ دو ،
دُردپی ڈلانی کنگ جمزانیاں	اپنی دُردھن بیوی کے ساتھ گھٹنے سے گھٹنا ملا کر بیٹھنا ترک کر دو ۔
بگ ، بدلیگاں چہ مکیں بلے نوذ تاں سگنت	دشمن تمہارے اونٹوں کے گلوں کو سرسبز چراگاہوں سے ہانک کر لے گئے ہیں

پھلگدیں گواھرام ءِ چوکاں نئبنگنت	خوش پوش گواحرام کے بھڑ تیلے نوجوان انہیں بھگا کر لے گئے ہیں ۔

رند آناً فاناً مسلح ہو کر اپنی سبک رفتار گھوڑیوں پر سوار ہوئے اور بہت جلد لاشاریوں کے تعاقب میں لپکے ۔ وہ زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ ندی ناڑی کے کنارے انہیں گرد اٹھتی نظر آئی اس گرد میں سے ھیتبان بیبکر اپنے ٹیڑھی پگڑیوں والے شہسواروں کے ساتھ نمودار ہُوا ۔ لیکن وہ میر چاکر کے لشکر کی طرف نہیں آیا ۔ بلکہ اُن سے ایک طرف ہٹ کر آگے نکل گیا اور آن واحد میں لاشاریوں کو جالیا ۔ تلواریں چمک اٹھیں اور اسے

ھیبتان ءَ چہ میرءِ گواھرام ءُ سُوب کت	ھیبتان نے میر گواحرام پر فتح پائی
چاکرءِ بگ ءَ چہ کمندیں گٹّاں زِتہ	اس نے چاکر کے اونٹوں کے گلوں کو اونچے پہاڑوں کے دامن میں اُن سے چھین لیا
گواھرام بے سوب ءُ پہ مجیں گنداوا شتہ	گواھرام ناکام و نامراد گرد و غبار والے گنداوہ کو واپس ہوا

ھیبتان بیبکر کی جوانمردی سے متاثر ہو کر میر چاکر نے اسی وقت رندوں سے مخاطب ہو کر کہا ؂

کینگ ءُ برات دمنگہ ءَ عالی بازنبیت	حسد اور دشمنی سے دوست زیادہ نہیں ہوتے اور سخاوت سے دولت نہیں بڑھتی
ھیبتان ءَ چوں پہ لاگریاں لکئے ئُہر کنتیں	ھیبتان کو میں کیسے ایک دُبلے سانڈ کیلئے ناراض کرتا ۔

بستگیں سُٹکے اُشتی دتی راج ءِ زھر کُتیں	اور اپنے قبیلہ کی ایک مستحکم شاخ کو ناراض کرکے
ماسک ءِ بو ریئتین دلدءِ آسے ماں کُتیں	اپنے بازوؤں کو خود توڑ کر جنگل کی آگ کو بھڑکاتا۔
سن کئے گو ئر گیر دلوان ءِ آرام کُتیں	اگر میں ایسا کرتا تو بتاؤ؟ آج میں کس کی پناہ ڈھونڈتا۔
من کئے چھتر ءِ سایگ ءِ ریچ ءِ ایر بُتین	اور کس کے چھتر کے سائے میں آرام سے اپنے دن گزارتا۔

لاشاریوں سے اونٹوں کے گلے چھین کر ھیبتان انہیں اپنے ڈیرے میں لے گیا۔ مگر ایک ہفتے کے بعد جب اس نے ان گلوں کو واپس میر چاکر کے ساربانوں کے سپرد کیا تو ان میں وہ سانڈ بھی موجود تھا۔ جو بھاگ کر ھیبتان کے اونٹوں کے گلے میں جا ملا تھا۔ اس پر میر چاکر بہت خوش ہوا اور اس نے میر ھیبتان کو:

انہام ءِ نارٹی داتگی میر بیحپ کر ءِ	انحام میں ناڑی کا علاقہ
ڈھاڈر ءِ نیمی دات گوں سیمی ءِ سیہک	ڈھاڈر کا نصف اور سبی کا تیسرا حصہ دیدیا

۲۔ جاڑو جلب کی آزمائش

کہتے ہیں کہ میر چاکر کو یہ شک گزرا کہ اس کے گلے کے سانڈ کو جاڑو نے ھیبتان کے اونٹوں کے گلے میں سلانے کی سازش کی ہے۔ اس بات کو دل میں رکھ کر میر چاکر نے جاڑو کو آزمائش میں ڈالنے کی صورت پر غور کیا۔ اور آخر کار جاڑو کے کم سن بیٹے کی دائی کو ورغلایا اور اس کام پر آمادہ کر لیا کہ ایک دن جب کہ میر چاکر بھی مجلس میں موجود ہوں دائی بچے کو لاکر جاڑو کی گود میں بٹھا دے اور اُسے یہ ترغیب دے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے باپ یعنی جاڑو کی ڈاڑھی کو ہاتھ لگائے۔ چنانچہ دائی نے ایسا ہی کیا اور جب نادان بچے نے ہاتھ بڑھا کر جاڑو کی ڈاڑھی پکڑی تو اس نے تلوار نکال کر اپنے بیٹے کا سر تن سے جدا کر دیا۔ شاعر کہتا ہے: ؎

جاڑو ءَ تلائیں نرّ ءُ	جاڑو نے اپنے نرینہ بیٹے کو
کشت پہ ھاتیرءِ ریشگ ءَ	ڈاڑھی کی خاطر مار ڈالا

مگر بات یہاں ختم نہیں ہوئی ھدہ رند میر چاکر کی بہن بی بی بانڑی کا شوہر اور جاڑو جلب کا بہت گہرا دوست تھا۔ اُن دونوں نے آپس میں قسم کھائی تھی کہ اگر کسی نے اُن میں سے ایک کو مار ڈالا۔ تو دوسرا اُس کا انتقام ضرور لے گا۔ یعنی قاتل کو قتل کرے گا چاہے وہ کوئی ہو۔ کہتے ہیں کہ میر چاکر نے ھدہ کو اُکسایا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ایک دن جاڑو کی ڈاڑھی کو ہاتھ لگائے۔ خدا جانے کیوں ھدہ اپنے جاڑو جیسے ایک دلی دوست کے ساتھ ایسی نازیبا

اور خطرناک حرکت کرنے پر آمادہ ہوا؟ ممکن ہے اُس کا یہ خیال ہو کہ اگر میں جس کے قاتل کو قتل کر
جاڑو نے قسم کھائی ہے اُس کی داڑھی سے پکڑوں گا۔ تو وُہ مجھے قتل نہیں کرے گا۔ کیونکہ
قتل کے ساتھ اُسے خود بھی خودکشی کرنی ہوگی۔ جو وُہ ہرگز نہیں کرے گا۔ الغرض
کی ترغیب اور اسی خیال خام کے برتے پر ھدّہ، اپنے دوستوں سے بے وفائی کرنے پر راضی ہوا۔
ایک دن جب کہ ھدّہ اور جاڑو کچھ اور دوستوں کے ساتھ گھوڑے دوڑانے جا رہے

کہ :- ے

ھدّہ ءِ یار ییّے کُتہ کچّا	ھدّہ نے جس کی یاری کچی تھی
گپتگی رِیش ءَ ڈُکّتی پُچ ءَ	جاڑو کی داڑھی پکڑ کر اسے مٹھی میں بھینچ لیا

جاڑو ست پٹا گیا گھوڑے کی باگ موڑ کر گھر پہنچا اور شاھو نامی اپنے بھتیجے کو تمام
سُنا کر اُس سے کہا کہ جب بھی اُسے موقع ملے ھدّہ کو مار ڈالے۔ آخر کار ایک دن اُ

ھدّہ ءُ شاھو بدیستہ	شاھو نے ھدّہ کو گھروں سے دُور دیکھا
دیری لوگاں ،مَن ڈگاراں	میں دیکھ لیا
گون اَتی ساںڈیں کمانے	ایک مضبوط کمان اُس کے ہاتھ میں تھی
جابہ پُر آشش تنگیناں	اور ترکش بھی عمدہ تیروں سے بھرا ہوا تھا
تیغی نوک سیخ دبروک ءُ ت	اس کی تلوار بھی سان پر تازہ تازہ تیز کی
	ہوئی اور بُرّندہ تھی۔
کارچ دکاتار جُتنگی ءَ	چھرا اور خنجر دونوں
مَن نیام بنداں جَتنی ءَ	اس کے کمربند میں لگے ہوئے تھے
پہ دِل ءِ کام ءُ کُت دکُشت	شاھو نے اُسے للکارا اور مار ڈالا
	شاھو نے اپنے دل کی مُراد پوری کرلی

ھدّہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد شاہو جب گھر پہنچا تو جارُو نے ھدّہ کے ساتھ اپنی قسم پوری کرنے کو اُس کا بھی سَر تن سے جُدا کر دیا اور پھر ھدّہ و شاہو دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کرا دیا۔

میر چاکر کو جب اطلاع ہوئی تو وُہ بہت پشیمان اور برہم ہُوا۔ اس نے جارُو کو دھمکی دی کہ: ؎

رِند منی کوھیں کلات ئُنت	رِند میرے پہاڑ سے قلعے ہیں
کشتگیں رِندءُ پہ گل نیست	کسی رِند کو مار ڈالنے والے کے لئے خوشی نہیں ہے۔
پہ لیب وچیتوئی گھڑو یان	یہ کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں
ھر دو دیما جان داریت	بے شک دونوں طرف سے جان رکھتے ہیں

جارُو نے میر چاکر کے جواب میں کہلا بھیجا: ؎

راست اِنت اُو میر منگہائی!	اے سخاوت شعار میر چاکر! یہ سچ ہے
راست اِنت اِو چاکر نوابیں!	اے نواب چاکر! آپ نے سچ سُنا ہے کہ
منی برجنیں ریش گپتگی ءَ	اُس ھدّہ نے جب میری گھنی ڈاڑھی پکڑ لی
بہوئیں ساھوں بگپتہ	تبھی کر اُس نے میری جان لے لی
ھدّہ طلان ءَ نیاتکہ	ھدّہ اب خراماں خراماں
پوپل وھیراں وَران ءَ	سپاری اور الائچی چباتا ہُوا
گور جو ءَ چار کھنگین ءَ	اس چار کھڑکیوں والے گھر میں
گور چاکرءِ دَرئیں گہارءَ	اپنی بیوی کی تک نہیں پہنچ پائے گا
گور بانڑی ءَ نیک زنین ءَ	اُس نیک عورت چاکر کی محترمہ بہن بانڑی کے نیچے

تنکیں هنزاناں سر زنند بیت — ران سے ران ملا کر نہیں بیٹھا
هدہ ءِ پول مں ڈگھار ءِ — چاکر! هدہ کو اب زمین کے اندر
هدہ مں گور ءِ دو مرد یں — هدہ کی قبر میں دو آدمی ہیں۔

کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد میر چاکر اور جاڑو کے درمیان مخالفت شدید
ہوتی گئی۔ آخر ایک دن میر چاکر اور جاڑو کی ایک میدان میں مڈبھیڑ ہو گئی شاعر کہتا

چاکر ءِ روچے بیر وتی گپتہ — چاکر نے ایک دن اپنا بدلہ لیا
مں پڑ ءِ جونگانی لوگ کُشتہ — اس نے میدان میں بہادروں کے
(جاڑو) کو مار ڈالا

جاڑو کو قتل کرنے کے بعد بھی میر چاکر کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا۔ وہاں سے وہ سیدھا
کے گھر گیا اور اس کی بیوی کو آواز دے کر جاڑو کی موت کی خبر سنائی۔ بقول شاعر

هانگار کُلائی گور ءِ گوشتیں — چاکر جان بوجھ کر گھروں کے پاس
(اور آواز دی)
اهو! براسندگ تئی کُشتیں — اے وہ عورت! تیرے دوست کو میں نے
مار ڈالا ہے۔
مائی ءِ، سوبائی منبا داتیں — مائی (جاڑو کی بیوی) نے سن کر
آ، منی براسندگ تئی برات ات — اس کامیابی پر اُسے مبارکباد دی
کم اِنت اِچ زردءِ تئی امیریں ءَ — اور پھر کہا، چاکر! اگر جاڑو میرا دوست
تو تیرا بھائی بھی تو تھا۔
یہ حرکت آپ جیسے ایک امیر کے شایانِ شان

نہتی ۔

باسک ءُ بور ریشتئے تو وتی راستیہا — آپنے اپنا دایاں بازو خود کاٹ لیا ہے ۔

جاڑو کی بیوی نے اس قدر کہنے کے بعد آگے بڑھ کر میر چاکر کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور اس سے کہا کہ کھانے کا وقت ہے کھانا کھلائے بغیر وہ اسے جانے نہ دیگی ۔ میر چاکر کو بھی اس کی دلجوئی منظور تھی ، اس کی دعوت قبول کر لی اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد شاعر کہتا ہے :۔

مائی ءَ گشتہ میش پہ مہمانی	مائی (جاڑو کی بیوی) نے ان کی مہمانی میں
دروی گوں رازی ئیں ڈلے داتیں	دُنبے ذبح کئے ۔
بچی گوں میر ءِ چاکر ءَ نیاستیں	اور خوشی خوشی انہیں کھانا کھلایا
گند نوا چیر کرِ خارءَ کوٹیت	اپنے بیٹے کو میر چاکر کے ساتھ دسترخوان پر بٹھا دیا
مں دل ءَ بیاریت حاچتے دروھی	تاکہ میر چاکر کو (جس کے دل میں خود کھوٹ ہے) کسی دھوکے کا خیال نہ گذرے
زندگنت دالکو نام بلوچانی	ایسی عورتوں کے طفیل اینک بلوچوں کا نام زندہ ہے ۔
جنت ءَ باتیں نیک زنیں نیاڑی	ایسی نیک عورتوں کو جنت نصیب ہو ۔
وشنت مہمان وشونت کلانی	مہمان کی خوشی ان کی خوشی ہے
سیری ءَ جوان ننت لاپ ءِ مزارانی	شکم سیری شیروں کے لئے بہتر ہے
نوکی ءَ جان ءَ جبر گنوکانی	نئے کپڑوں میں تو پاگل بھی بھلا لگتا ہے

۲- شے مُرید کی آزمائش

شے مبارک کا لڑکا مُرید ایک بانکا، سجیلا اور خوش پوش نوجوان تھا۔ لوگ کہتے تھے جو بلوچوں کا ایک درویش خاندان ہے۔ رند نہیں تھے البتہ رندوں کے ساتھ گہرے تعلق وابستہ رکھتے تھے۔ مُرید شعر و شاعری کا دلدادہ اور میر چاکر کے مصاحبوں میں سے تھا۔ اس کے اور میر چاکر کے درمیان گہرے تعلقات تھے۔ رند جو اپنے سردار کی طبیعت سے واقف تھے مُرید کو دیکھ کر اکثر ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے کہ:-

رند لوٹریں لے پلّو	لے کچھ نہ کہو،
بہل ئے کہ سردار سنگتیں	یہ تو سردار کا ساتھی ہے۔
سر بیبی مردے نہ انت	لیکن وُہ بھروسے کا آدمی نہیں۔
روچے من کا ھوئے کپیت	ایک نہ ایک دن یہ کسی مصیبت میں پڑ جائے گا۔

شاعر کہتا ہے کہ ایک دن میر چاکر شکار کو گئے، شے مُرید بھی ساتھ تھا۔ تین دن تک میدانوں، وادیوں اور جنگلوں میں شکار کھیلتے رہے، چوتھے دن میر چاکر شے مُرید کو ساتھ لے کر بستی کی طرف واپس روانہ ہُوا۔ دوسرے لوگ جو ساتھ تھے پیچھے رہ گئے تھے میر چاکر اور مُرید گھوڑے دوڑاتے چلے آ رہے تھے، کہ دُور سے انہیں ایک بستی نظر آئی، اور:-

لوگاں ھوٹلی بیتگنت	جب وُہ گھروں (بستی) کے قریب پہنچے
گوشتہ مریدءَ پھلگذین	تو خوش پوش مُرید نے کہا:-
میر چاکر! اُو سردار منی!	میر چاکر! اے میرے سردار!

راہ ءُ من ءُ تُنّ ءُ جتہ — مجھے بہت پیاس لگی ہے ۔

میرچاکر نے کہا چلو ان گھروں سے پانی پی آئیں ۔ مریدنے کہاکہ یہ بستی تشے کمیریوں کی ہے ، اور میری منگیتر ہانی یہاں رہتی ہے ۔ اس کے گھر تو میں نہیں جا سکتا ۔ کیونکہ ہانی میرے سامنے نہیں آئے گی ۔ مجھ سے پردہ کرتی ہے ۔ تب میرچاکر نے کہا کوئی بات نہیں میری منگیتر بھی انہی گھروں میں رہتی ہے ۔ تم اس کے گھر جاؤ اور میں ہانی کے گھر جاکر پانی پی لوں گا ۔ اور اسی طرح بقول شاعر : ۔ نے

کرڈ بیتگ دا ایکا لڑاں	دونوں جدا ہوکر الگ ہو گئے
ھانی لوگیں دَر کپیت	سلیقہ شعار ہانی گھر سے باہر آئی
میرچاکر ! او سردار منی !	میرچاکر لے ہمارے سردار !
گوئرا چی کارءَ اتکگے ءِ	ہمارے پاس آپ کس کام سے آئے ہیں ؟
گوگشتہ کوی یئں چاکرؔ ءَ	چاکر توانا نے جواب دیا
ھانی ! من ءُ تُنّ ءُ جتہ	ہانی مجھے پیاس لگی ہے ۔
ھانی پدی پاداں تشتہ	تب ہانی اُلٹے پاؤں واپس گئی
ماجیت تاسیں کدءِ	ایک پیتل کی کٹوری کو مانجھ کر دھویا
آپ کدہ ءَ ایر ریتکگنت	کٹوری کو پانی سے بھرا
بومُچ کتہ آپ داتگت	اور پانی میں تنکے ڈال کر اسے پیش کیا

پانی میں تنکے دیکھ کر میرچاکر نے بظاہر تو کچھ نہیں کہا اور آہستہ آہستہ گھونٹ گھونٹ کرکے پانی پیتا رہا ۔ لیکن دل ہی دل میں ہانی کی بدتمیزی پر بہت ناراض ہوا ۔ پانی پی کر جب میرچاکر واپس ہوا ۔ تو راستے میں اس نے تشے مرید کو پڑے پایا ۔ پوچھ کیا ماجرا ہے ۔ ؟

شے مُریدنے جواب دیا: ؎

میر چاکر! او سروار متی!	میر چاکر! اے میرے سردار
گند تو وتی کم اگل ءَ	اپنی کم عقل منگیتر کو دیکھ!
آپوں گنو کی دا تگنت	پاگل پنے سے اس نے مجھے پانی جو
آپ اسے دِل ءَ مان انکہ گنت	پانی ہے میرا دل پکڑا گیا۔
کوکھارزگاں من ءَ کشتگاں	میں نے قے کی اور سارا پانی باہر نکال دیا
آپاں من ءَ نادراہ کُتہ	پانی پی کر میں بیمار ہو گیا ہوں۔

شے مُرید کی حالت دیکھ کر میر چاکر کو پانی کی کٹوری میں تنکوں کی افادیت اب سمجھ میں آئی۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ پانی میں تنکے ڈالنے سے ہانی کا مطلب یہ تھا کہ میں یک لخت پانی نہ پی سکوں۔ جیسا کہ شے مُرید نے پیا اور بیمار پڑ گیا۔ میر چاکر کو اب ہانی کی ہوشیاری اور دُور اندیشی کی تعریف کرنی پڑی۔ شاعر کہتا ہے کہ اسی دن سے میر چاکر ہانی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہُوا اور: ؎

میر چاکر ءَ گنڈتی کُتہ	میر چاکر سوچ میں پڑ گیا کہ
بنداں من چوشیں آ نگلے	ایسی کوئی تجویز کروں جس سے
ہانی لموک ہمند گیں	اس سلیقہ شعار اور سمجھدار ہانی کو
آئی ءَ مُریدہ ءَ چہ پلان	شے مُرید سے چھین لوں۔

کہتے ہیں کہ میر چاکر کو اپنی تجربہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شے مرید نے رندوں کی مجلس میں یہ قول کیا تھا کہ وہ کسی بخشش مانگنے والے کو خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گا۔ میر چاکر نے ایک تیر سے دو شکار کے مصداق شے مرید کو آزمائش میں ڈالنا

کی شانی ایک دن عصر کے وقت جب کہ شے مرید مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا بیبرجا کر نے ڈُوڈُم گوتیوں کو سکھا پڑھا کر اُس کے پاس بھیجا ۔ شے مرید خود اپنی ایک نظم میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

من مسجد ءَ وَنتہ نماز	میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا ۔
پہ چار رکات پھرزءِ گذار	فرض کی چار رکعتیں ادا کر رہا تھا کہ ڈُوڈ
لانگوُ کہ کاتنت جپتنگ ءَ	گوتیے آئے
نِندنت منی راستیں کش ءَ	اور آ کر میری دائیں طرف کو بیٹھ گئے
من کہ سلام گردینگان ،	جب میں نے سلام پھیرا
لانگو ! بلوٹِت دادِن ءَ	تب اُن سے کہا، گوتیو ! مانگو جو مانگتے ہو
من داون ءَ بندنہ بان ،	میں بخشش دینے میں رکنے والا نہیں
زیرت منی جمازگ ءَ	میری سواری کا اونٹ لے جاؤ
زین ءِ ھزاری مرکب ءَ	میری زین کے نیچے کا ھزاری گھوڑا
تیغ ءَ گوں پھلیں اسپر ءَ	میری تلوار معہ ڈھال کے
تیر و کماں ، گوں جابو ءَ	میرے تیر و کمان معہ ترکش کے
کارچ و بروکیں خنجر ءَ	میرا چھُرا اور خنجر مُلتان جو بھی پسند ہو لے جاؤ

مگر گوتیوں نے کہا کہ ہمیں کوئی ایسی بخشش نہیں چاہیئے ۔ تب شے مرید نے اُن سے کہا کہ اب تم بولو کہ تمہیں کیا چاہیئے

گوُرُشتہ اگازی لانگوان	ڈوم گوتیوں نے کہا
روشوں دُرانی ھانی ءَ	ہم آپ سے خوشبوؤں میں بسی ہوئی ھانی مانگتے ہیں

شے مرید کہتا ہے کہ گوئیوں کا مطالبہ سُن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل

مَن بیبرے بہ منتگاں	میں ایکدفعہ ہکابکا رہ گیا
چہ زانگ ءَ ردکپتگاں	میرے ہوش اُڑ گئے
جستوں نہ کُتہ چہ ہچ کس ءَ	میں نے کسی سے بھی مشورہ نہیں کیا
نے ھانی گھاریں پت ءَ	یہاں تک کہ ھانی کے شریف النفس باپ سے بھی ۔
ھانی نہ بکشاں لانگواں	میں نے سوچا کہ اگر میں گوئیوں کو ھانی نہ دی
بدکوّل باں گوں چاکر ءَ	تو میر چاکر کے سامنے بد قول کہلاؤں گا

شے مرید کہتا ہے کہ اس وقت مجھے اس امر کا بھی احساس ہوا کہ : ـــ

چاکر ھندّوے زاھر ءَ	چاکر اب تو مرا علی الاعلان میرا دشمن
بازیگ دنت ھنیں سر ءَ	اب تک وہ مجھے محض دھوکا دیتا
پیش ھانی ءِ چم دیستہ گُتہ	ھانی کو دیکھنے کے بعد
رند ءَ سوالی پر گُتہ	اس نے ہی ان مانگنے والے گوئیوں کو میرے پاس بھیجا ہے ۔

لیکن، اب کیا ہو سکتا تھا ۔ شے مرید میر چاکر کے دام میں پھنس چکا تھا ۔ اب اس کے لئے دو ہی صورتیں تھیں اپنے قول سے پھر جانا اور ھانی سے ناطہ توڑنے سے انکار دینا اور اس طرح اپنے بانکے ہمسروں میں بدنام اور ہنسی مذاق کا ھدف بنتا ۔ یا پھر ھانی سے دستبردار ہو کر اپنے قول پر قائم رہتا ۔ اور ایسا کر کے ندامت و شرمندگی کی زندگی ہجر و فراق کی المناک موت کو ترجیح دیتا ۔ شے مرید نے بلاشبہ ایک بوجھ کی

اپنے قول سے پھر جانے پر دوسری صورت کو ترجیح دی اور گویوں سے کہا : ؎

زیرت ؤنانی ھانی ءَ	لے جاؤ! خوشبوؤں میں بسی ہوئی ھانی کو لے جاؤ!
دستاری ءِ نامی پرتت	وہ نام کو میری منگیتر تھی
اش من کہ چیرو اندر تیت	مجھ سے ہمیشہ پردہ میں رہتی تھی
راج ءَ من ءَ سی رسیت	قوم میں مجھے اس کا ثانی مل جائے گا

اس طرح شے مرید وھانی کی داستان عشق کی ابتداء ہوئی ۔ کہتے ہیں کہ ھانی جب شے مرید کی منگیتر نہ رہی تو میر چاکر نے اس کے باپ میر مندو کو پیغام بھیج کر ھانی کے ساتھ منگنی اور پھر شادی رچائی شے مرید ھانی کے عشق میں دیوانہ ہوکر سر بہ صحرا نکل گیا ۔ ھانی کے عشق میں اس نے جو اشعار کہے ہیں وہ آج تک بلوچ گویوں کو یاد ہیں ۔ آج بھی شبینہ محفلوں میں بلوچ مرید کی ان دکھ بھری نظموں کو گویوں سے سنتے اور سر دھنتے ہیں ۔

۴۔ میر چاکر کی آزمائش

میر چاکر کی آزمائش سے متعلق ہمارے شاعر خاموش ہیں۔ یا کم از کم ہمیں اب تک کوئی ایسی نظم نہیں ملی ہے جس میں میر چاکر کی آزمائش کا ذکر ہو۔ اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ میر گواھرام لاشاری کے ساتھ خانہ جنگی میں پھنس جانے کے بعد رندوں کو اس کی ضرورت ہی نہیں آئی کہ میر چاکر جیسے اپنے ایک محترم سردار کو لاشاریوں کے ساتھ لڑائی میں مصروف ہونے کے علاوہ کسی اور آزمائش میں ڈال دیں۔ یا یہ کہ ھیبتان جاڑو اور مرید کے بعد رندوں میں کوئی اور ایسا بانکا نوجوان تھا ہی نہیں جو میر چاکر کو آزمائش میں ڈالنے کی جرأت کرتا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میر چاکر کو آزمائش میں ڈالا گیا۔ لیکن بعد ازاں شاعروں اور گویوں نے احتراماً اس کی تشہیر کو مناسب نہ سمجھا ہو، بہرحال صورتِ حال جو بھی ہو ہمارے پاس اس ضمن میں کہنے کو کچھ نہیں۔

ھانی و شے مرید کی

داستانِ عشق !

بلوچستان کے علاقہ کچھی میں بیرجا کر دمیر گواھرام کے زمانے (پندرھویں صدی عیسوی) سے فقیروں اور درویشوں کا ایک مشہور و معروف طائفہ رہتا ہے جسے عُرف عام میں شے کھیری کہتے ہیں۔ روایت ہے کہ کسی زمانے میں ان درویشوں کے آباؤ اجداد میں سے کسی ایک نے کھیر کے درخت پر چڑھ کر اُسے گھوڑے کیطرح دوڑایا تھا۔ لہذا اُن کا نام کھیری پڑ گیا۔

شے مرید جسے بلوچوں کی عشقیہ داستانوں میں شہرت دوام حاصل ہے، شے مبارک کا بیٹا اور ذات کا شے کھیری تھا۔ بلوچی میں "شے" فقیر یا درویش کے معنوں بولا جاتا ہے، لبعض لوگ اسے "شیخ" کی بگڑی ہوئی صورت یا بلوچی سمجھتے ہیں۔ آج کل بلوچ ان فقیروں کو بھی "شے" کہتے ہیں جو سماع سے مست ہو کر آگ کے گرد ناچا کرتے ہیں۔ لبعض لوگ انہیں جنّی بھی کہتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ ان کے قبضے میں کوئی نہ کوئی جن ضرور ہوتا ہے۔ اور جب یہ "شے" سماع سے مست ہو کر آگ کے گرد ناچتے ہیں تو وہ جن جو ان کے تابع فرمان ہوتا ہے اُن کے جسموں میں حلول کر جاتا ہے۔ اور پھر یہی جن شے کی زبان میں باتیں کرتا ہے۔ بیمار کا علاج بتاتا۔ چوری کے مال کا کھوج دیتا اور حاجتمندوں کی حاجتیں پوری کرنے کا دلاسا دلاتا ہے، کسی زمانے میں بلوچستان میں ان جنّی فقیروں کا بڑا چرچا تھا لیکن اب تعلیم عام ہونیکی وجہ سے عوام الناس کا ان پر اعتقاد نہیں رہا ہے۔ توہم پرستی کے خاتمے کے ساتھ ساتھ یہ جنّی شے بھی مفقود

ہوتے جاتے ہیں۔

قدیم تاریخ کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا۔ کہ یہ سرزمین جو کبھی کہلاتی رہی ہے کسی زمانے میں مہاتما بدھ کے پیروؤں کا مسکن رہی ہے۔ بلوچستان کے بعض پہاڑوں میں جہاں کہیں بھی پانی کا کوئی خوشگوار چشمہ ہو گا۔ وہاں آپ کو آج کل بھی کسی پیر کا ٹھکانہ ضرور ملے گا۔ یہ ٹھکانے دراصل زمانۂ قدیم کے اُن بدھ بھکشوؤں یا راہبوں کی عبادت گاہیں ہیں۔ جو آبادیوں سے دُور یہاں بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ ان ٹھکانوں میں کہیں کہیں مہاتما بدھ کی مورتیاں بھی شکستہ و ریختہ حالت میں ملتی ہیں جن کو یہاں کے بلوچ عوام "منگلوں" یا "مغلوں" کے سر" کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کسی بزرگ نے (جس کے مزار پر یہ مورتیاں ہوں) بدعا دیکر ان کافروں کو پتھر بنا دیا ہے۔ یہ پیر اور بزرگ بھی جن سے ایسی کرامات منسوب ہیں۔ عموماً "شے" ہی ہوتے ہیں، مثلاً "شے حسن" "شے حیبی" "شے بلال۔ "شے رجب" "شے عومر" "شے سمائیل" اور شے بلاول وغیرہ۔ بلوچوں کے مشہور عام پیر ہیں۔

بلوچستان کے "شے" اپنے کو ان ہی پیروں اور بزرگوں کی اولاد سمجھتے ہیں، یہ لوگ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ دراصل بودھ بھکشو اور راہب تھے۔ جو عربوں کی آمد سے قبل اس ملک میں آباد تھے۔ جب عرب آئے تو یہ مسلمان ہو گئے۔ مگر اسی طرح کی درویشانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ جیسی کہ اسلام قبول کرنے سے قبل ان کی تھی۔

درویشوں کے اس بلوچ طائفے کے افراد میں بودھ مت کی بعض نشانیاں اور خصوصیات اب بھی ملتی ہیں۔ مثلاً یہ لوگ آبادیوں سے بہت دُور پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ کسی جاندار یہاں تک کہ چیونٹی کو مارنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کے کندھے پر ایک کاسہ گدائی (کچکول)، یا پشم اور سُوت سے بنا ہُوا ایک چھوٹا سا تھیلا ضرور ہوتا ہے جس میں وُہ روٹی اور آٹا وغیرہ مانگ کر رکھتا ہے۔ یہ درویش صفت افراد عام طور پر

پہاڑوں پر بکریاں پالتے اور اُن کے دودھ وغیرہ پہ گذر بسر کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے خاص افراد کا گذارہ صرف بھیک پر ہے۔ شاعری ان لوگوں کے گھر کی لونڈی ہے۔ زمانہ قدیم کے مایۂ ناز بلوچی شاعر جیسے "شے کلاتی" اور "شے عیسیٰ" اسی طائفہ میں سے تھے۔ اور شے مرید جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں بھی انہی درویشوں میں سے تھا۔

بلوچستان میں ان شیخوں اور درویشوں کے تین طائفے مشہور ہیں ا۔

اوّل۔ "شے زادگ" یہ طائفہ مکران اور ایرانی بلوچستان میں آباد ہے۔

دوئم۔ "شے زنگی" یہ طائفہ خاران، چاغی اور افغانی بلوچستان میں بود و باش رکھتا ہے۔

سوئم۔ "شے کہیری" یہ طائفہ کچھی علاقہ مری و بگٹی سندھ اور پنجاب تک پھیلا ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ ان "شے کہیریوں کے جدّ امجد نے کہیر کے جس درخت کو گھوڑے کی طرح دوڑایا تھا، وُہ اب تک کچھی میں اسی طرح سرسبز و توانا کھڑا ہے۔ شے مرید ان ہی شے کہیریوں میں سے تھا۔

شے مرید اور ہانی کی داستانِ عشق کے سلسلہ میں جو نظمیں شے مرید کے نام سے منسوب چلی آتی ہیں۔ وہ بیانیہ طرز سخن اور صیغۂ واحد متکلم میں ہیں اسی لئے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان نظموں کا کہنے والا خود شے مرید ہے۔ لیکن بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مختلف شاعروں نے بعد ازاں شے مرید کے نام سے یہ نظمیں کہی ہیں۔ لیکن صیغۂ واحد متکلم کا استعمال کیا ہے۔ جو قدیم بلوچی نظموں میں عام طور پہ پایا جاتا ہے۔ بہرحال زیادہ قرینِ قیاس پہلی صورت ہے، البتہ اس میں شک نہیں کہ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ ان اشعار میں ترمیم و تنسیخ اور قطع و بُرید ہوتی رہی ہے۔

یہاں پر یہ کہہ دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ آج کل بلوچوں میں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ جو شے مرید و ہانی کے اس تمام واقعہ کی حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔ وُہ کہتے

ہیں کہ یہ لاشاری شاعروں کی پھیلائی ہوئی ایک من گھڑت کہانی ہے۔ جو بیبرگ کو بدنام کرنے کے لئے گھڑی گئی ہے۔ لیکن یہ حضرات جو مرید و ھانی کی روایت کو تسلیم نہیں کرتے خود بھی اپنے دعویٰ کے حق میں کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے ان کا یہ دعویٰ بھی محض میر چاکر کے کردار کو بیداغ ثابت کرنے کی ایک بے بنیاد کوشش ہے۔ ورنہ شے مرید و ھانی کی روایت کو آسانی سے جھٹلانا ممکن نہیں ہے۔

بہر حال صورت جو بھی ہو، شاعر کی بات کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اپنی منگیتر سے دستبردار ہو کر شے مرید بعد میں بہت پچھتایا۔ رفتہ رفتہ اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ چنانچہ خود کہتا ہے :- ؎

من چہ سرء ہمنت گاں	میرا سر چکرا گیا
اَپ اکل و ہوش ء رپتگاں	میرے ہوش و حواس اڑ گئے
جلتی کمیر چل ء کتاں	میں نے جلد ہی ل کے بھس کو آگ میں سلگایا
بند بند وقی داگ داتگاں	اپنے عضو عضو پر اس سے داغ دیئے
ہپتاد و ہپت داگوں کنگ	کل ستتر داغ میں نے اپنے جسم پر دیئے

جب ھانی کو یہ معلوم ہوا کہ "شے مرید" نے نہ صرف اس سے ناطہ توڑ لیا ہے بلکہ اسے ڈوم گویوں پر بخش بھی دیا ہے۔ تو گریہ و زاری اور آہ و بکا کرنے لگی۔ مرید کہتا ہے : ؎

ھانی ء گب ء دھکگنت	ھانی کی چوڑیوں کی آواز آرہی ہے
لگنت بہ کوشیں زانسران	جو اس کی سفید رانوں پر لگتی ہیں۔
ارسی کستوری ئیں ریچنت	اس کے معطر آنسو
برز بہ انار ء کانی سرءَ	اس کے انار جیسے گالوں پر سے نیچے بہہ کر

جبل ءَ پہ دکانیں گوُرءَ ءَ
ھانی - زھیرہ نالیں بگھاں

کنت گوں اسلیں مرداں
چی مُت منی "شے" ءَ گناہ
بشکِت من ءَ پہ لانگوان
مردے دَتی میانءَ ھلگر ءَ
مزری کمان گوں جابو ءَ
زین ءِ ھزاری مرکب ءَ
دنت پہ دتی دش نامی ءَ

بے کس چشیں کارءَ نہ کنت !
شگیں پریں دوست ءَ نہ دنت

اس کی خوش نما چھاتیوں پر گرتے ہیں
ھانی دکھ بھری آوازیں آہ و فغاں
کرتی ہوئی
شریف زادیوں سے پوچھتی ہے
شے مرید کا میں نے کون سا گناہ کیا تھا کہ
اس نے مجھے ڈوم گویوں پر بخش دیا۔
ایک شخص اپنی میان کی تلوار کو
اپنی مصری کمان اور ترکش کو
یا اپنی زین کے نیچے کے ھزاری گھوڑے کو
اپنی شہرت و نیک نامی کے لئے
بے شک بخش دیتا ہے لیکن
کوئی شخص ایسا نہیں کرتا کہ
اپنی گرانقدر دوست کو کسی پر بخش دے،

کہتے ہیں کہ جب میر چاکر نے ھانی سے شادی کر لی اور ھانی اپنے گھر سے میر چاکر کے قلعہ میں منتقل ہوئی تو شے مرید شدت احساس سے دیوانہ ہو کر سر بہ صحرا نکل گیا اسے اب اس بات کا شدید احساس ہو چلا تھا۔ کہ ھانی سے دستبردار ہو کر اس نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔ ننگ بخشش میں دینے کی چیز نہیں ہوتی اسی لئے تو نودبندگ نے جو "زر زوال" یعنی دولت لٹانے والا کی صفت سے معروف تھا کہا ہے کہ

ترس ءَ مے گال ءِ کناں
مجھے ڈر اس بات کا ہے

چوشیں سو لیئے مئیت !	کہ ایسا کوئی مانگنے والا نہ آئے
مئیت و ٹلو ٹیت ھمر ش ءَ	اور آکر مجھ سے نہ مانگے
بوپ ءَ گوں حاتینیں کش ءَ	میرے پہلو میں گدے پر بیٹھی ہوئی اس خاتون کو
لے دادنی چیئے نہ اِنت	یہ دینے کی چیز نہیں ہے۔

بہر حال، شے مریدہ حانی کے عشق میں سرگردان دیوانوں کی طرح کوچہ بکوچہ سر بجو د بھٹکتا پھرتا رہا۔ نہ دن کو چین اور نہ رات کو قرار رو رو کر کہتا کہ آہ! یہ میں نے کیا کیا! ؎

ھانی من لیشکت لانگوان	میں نے حانی کو بخش دیا
پہ چنگ جنیں ریّا لوان	گانے بجانے والے ڈوم گویوں کو
گندانی ھنکین و بڈان	اب جو میں حانی کا گھر اور اس کے پاؤں کے نشان دیکھتا ہوں
کوراں چہ ھر دو دیدگان	تو دونوں آنکھوں سے اندھا ہو جاتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ شے مرید اب راتوں کو بیر چاکر کے قلعے کے گرد تمام رات پھرتا اور گاتا رہتا تھا۔ ایک رات جب حانی نے اس کی آواز سنی تو قلعے کے برج پر آکر لے دیکھنے لگی۔ شے مرید کی نظریں بھی اس سے چار ہوئیں اس وقت مرید کے دل پر جو کیفیت گذری اسے وُہ یوں بیان کرتا ہے ؎

دوشی کہ دہ ماہ چہار دھی	رات وُہ حسینہ اور چودھویں کا چاند

همکو بگی ادت تاتگنت د
چه ماه ءُ بگ ءِ رنگ شرترانت

کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے
چاند سے اس حسینہ کا رنگ ور روپ زیادہ اچھا ہے

ماه ءُ گبارے مں دپ ءُ
هانی چه شیراں شرترانت
شیراں کپه و بگی پهرنت

کیونکہ چاند کا چہرہ غبار آلود ہے
ھانی تو دودھ سے بھی اچھی ہے۔
دودھ پر بھی تو جھاگ آجاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جوں جوں شے مرید کا جنونِ عشق بڑھتا گیا توں توں ھانی کے دل پر بھی اس کے نالہ ہائے نیم شبی اپنا اثر دکھانے لگے۔ جنون نے شے مرید کے حوصلے اتنے بڑھائے کہ وہ بیرچاکر کے قلعے کے اندر جاکر ھانی سے ملنے کو خطرہ محسوس نہ کرتا۔ اپنی ایک طویل ولولہ انگیز نظم میں شے مرید کہتا ہے، ہے

بیائت منی شاہی مہذبیں یاران
آؤ، اے شاہی طبیعت رکھنے والے میرے ساتھیو!

من گل ءِ بے گانجیں گماں گارانت
میں اپنی پھول جیسی محبوبہ کے بے انتہا غموں میں کھو گیا ہوں۔

کن زهیرانی تنگوان ماران
اس کی یادیں تازیانوں کی طرح مجھ پر پڑتی ہیں

چیدوئیں ھانی در ءِ لشان داران
آؤ! میں تمھیں اپنی پیاری محبوبہ ہانی کی نشانیاں بتلاؤں:

مشک شنزنت چه مودیں پیکان
سنبل و لونگ مودیں گوراں مش بو

اس کے گھنے گیسوؤں سے مشک برستا ہے
اور اس کی سنبل جیسی ابھری ہوئی چھاتیوں سے خوشبوؤں کی لپٹ اٹھتی ہے۔

کنت کپیسے پہ ریھتگیں چمّان	وہ اپنی خوبصورت مخمور آنکھوں کو ایک دلفریب ادا سے مٹکاتی ہے.
ھردم ءُ رلیسنیت گوٹءِ درمّان	ہر آن وُہ اپنے گلے کے موتیوں کے ہار چھیڑتی رہتی ہے ۔
چمّ بے کپی کجلّ ءُ سیاہ تنت	اس کی آنکھیں کیچ کے کاجل کے بغیر سیاہ ہیں
لُنٹ بے مسواک ءُ گل ءِ کھرنت	اور اُس کے ہونٹ دنداسے کے بغیر سرخ ہیں

اس طرح اس خوبصورت پیرائے میں حانی کو متعارف کرانے کے بعد میر چاکر کے قلعہ کا ذکر کرتے ہوئے شے مرید کہتا ہے : ۔

است پچھلے کرھپت سرو دست انت	سات قد آدم جتنی اونچی ایک فصیل ہے
آ ملک گندیں چاکری مان انت	جس میں وُہ بادشاہ صفت چاکر رہتا ہے
من چدا مردی توکلے کُرتان	ایک رات میں نے توکّل مردانہ سے کام لے کر
لانچوں گوں ھوریں شُدَوال لبتاں	سرخ رنگ کی ریشمی چادر سے اپنی کمر کس لی
آکڑاں بیتاں پہ آسنیں میہان	اور لوہے کے کیلوں کے سہارے میں اس فصیل پر چڑھ گیا۔
پیچ کنان در بنداں ھساریناں	قلعے کے بند دریچے کھول کر میں اندر گیا۔
ھانی واپتت من ریھتگیں کٹ ءَ	میں نے دیکھا کہ حانی ایک رنگین پلنگ پر بچھے ہوئے
ریھتگیں کٹ ءَ دمنجہ ءُ ھورین	سرخ رنگ کے ریشمی گدّے پر سوئی ہوئی ہے
سر بیا بالشتاں گل ودخورتین	اس کا سر عورت کی خوشبو میں بسے ہوئے

	پھول جیسے تکیے پر تھا ۔
رپتگ دوش دشتءِ گوَرانی نشتان	آہستہ آہستہ جا کر میں اس کے پاس بیٹھ گیا
اَچ انارکانی گروھگے سنداں	میں نے اس کے انار جیسے گالوں کا بوسہ لیا ۔
پہ وتی تھاجیں دلءِ بندان	تاکہ میرے محتاج دل کو قرار آئے
دال چہ من کابُزگی ھڑے زرتہ	دہ محبوبہ خطرے کا احساس کرنے والی ہرنی کی طرح
دیر دگپتہ چو ڈاھوءِ نشتہ	اُچھل کر دُور جا کھڑی ہوئی ۔
گواتی گرگپتہ اسری شاریں	ہوا نے اس کے سر کا ریشمی دوپٹہ چھین لیا

اس خوبصورت پیرائے میں اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مرید کہتا ہے کہ دُور کھڑے ہو کر ھانی نے مجھے وہاں سے للکارا :- سے

لے چی مردے کہ سوھنی چار کھلّءَ کتہ	تم کون ہو جسے میرے گھر کا رخ کرنے کی جرأت ہوئی ہے ۔
اَچ منی کھلّءِ کابلی تُرکان ءِ ھنتر	میرے گھر آنے سے کابل کے ترکوں کو بھی ڈر لگتا ہے ۔
کہ جاکرءِ بیمءَ شیر دربیشت من جنگلءَ	جاکر کے خوف سے شیر جنگلوں میں چھپ جاتے ہیں ۔
پسّوش من پہ سردناگ داتہ	میں نے دبی زبان میں اس سے کہا ،
من مریدان ونیج مبارک ءَ	ھانی میں مرید ہوں ۔ مبارک کا بیٹا
آہگءُ دشءُ دش من گورءُ نشتہ	اب وہ آہستہ سے آکر میرے پاس بیٹھ گئی

هر دوکیں دستاں من گوَرءَ لبستہ
شُتے تئی کُربان دبلا ز یراں

اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کہتا کہ
مرید میں تجھ پر قربان ہو جاؤں
میں تیری بلائیں لے لوں ۔

چوش کا یے تو درپہیں کوٹاں

اس طرح تم کیوں ان دشوار گذار علاقوں میں
آتے ہو ۔

چاکر ءِ چوکی کشنگاں گردنت

جہاں چاکر کے پہرہ دار قلعے کے برجوں پر
ٹہلتے رہتے ہیں ۔

گوں کسا بانی کُہدَ میں کارچان
گوں خراسانءِ گوھریں تیغان

قصائیوں کے لغنوں جیسے چھروں
اور خراسان کی جوہر دار تلواروں سے
وہ مسلح رہتے ہیں ۔

ناگمان گہنگیریءَ سرت گندنت
ڈیل ءَ تئی زہریں کنڈاں بندنت
چو لُومتءِ بُرّنت تئیں دمیسٹانی
برز کلات ءِ من چیند رءَ ودرنجنت

اگر اچانک انہوں نے تجھے دیکھ لیا
تو تجھے ان کٹیلی تلواروں کی دھار پر رکھ دیں گے
تیرے اتیل دمیٹ میں لپے ہوئے سر کو کاٹ
کر قلعہ کی دیواروں پر لٹکا دیں گے ۔

عاشق کے لئے ڈر کے کیا معنی ؟ مرید جو ھانی کے عشق میں دیوانہ اور اپنی زندگی سے بیزار ہو چکا تھا ۔ ایسی باتوں کی پرواہ کرنے والا کب تھا ۔ اس کے لئے اب میر چاکر اور اس کی جاہ و حشم کی کوئی حیثیت نہیں تھی ۔ اسی لئے تو مرید کہتا ہے کہ میں نے ھانی سے جواب میں کہا : ــــ

پُر گرنوانی گُہیں ھانی !

پھول جیسی خوشبو والی ھانی ! ایسی
بات نہ کر

تو ملک سندد ءِ وحتگ ءَ لہڈیں	تم ملک سندھ کی لاڈلی بیٹی ہو۔
من مبارک ءِ لیشگاں سوُلیں	اور میں مبارک کا نونہال بیٹا ہوں۔
چو من ءَ مات ءَ شیر نہ میچینتہ	نہ تو ماں نے مجھے ایسا دودھ پلایا ہے
چو من ءَ دائی ءَ نہ لولینتہ	اور نہ ہی میری دایہ نے مجھے ایسی لوریاں دی ہیں
کہ سرتی شوہیں چاکر ءَ پلاں	کہ میں اس بدبخت چاکر سے اپنا سر چھپاتا پھروں

شے مرید کی اب لبقول کسے یہ حالت تھی کہ ؎

شب بکوئے یار بودم ——— روز در ویرانہ ؑ

رات دن مارا مارا پھرا کرتا تھا، اس دوران میں اس کی شاعری آتشِ عشق میں تپ کر کندن بن چکی تھی۔ ہمہ وقت ھانی کے عشق میں مست الست رہتا۔ اور دل کی آگ کو مزید بھڑکانے کے لئے ھانی کے سراپا اور حسن وجمال کی تعریف میں پُرسوز اشعار موزون کیا کرتا تھا۔ اسی دور کی ایک طویل نظم میں ھانی سے مخاطب ہو کر شے مرید کہتا ہے ؎

ھانی! ترا منت کناں	ھانی! میں تجھ سے التجا کرتا ہوں
منت وزاری ات کناں	ھانی! میں رو رو کر تجھ سے عرض کرتا ہوں کہ
اُچ من سرینگ ءَ چنڈ مکن	مجھے دیکھ کر دوپٹے کے پلّو سے اپنا چہرہ نہ چھپا
مارا پہ نیم چم ءَ مگند	مجھے دزدیدہ نظروں سے نہ دیکھ!
پھل کرھو پھلّ ءَ چناں	مجھے اجازت دے کہ میں تیرے گلستانِ حسن سے چند پھول چن لوں۔
چون ءَ گنوک دیوانگان	میں ویسے بھی تو تیرے لئے پاگل اور دیوانہ ہُوا ہوں۔
عشق ءَ تئی، پروانگان	اور تیرے عشق میں پروانہ بن کر جل چکا ہوں۔

ماراں پہ آ دست ءَ گِران	اب میری یہ حالت ہے کہ زہریلے سانپوں کو میں ہاتھ سے پکڑتا ہوں۔
سیاہ ماروں دست ءِ چابک بنت	کالے ناگ میرے ہاتھ میں چابک کی طرح ہوتے ہیں۔
ھانی! منی رھدیں گِروک	ھانی! اے ساون کے بادلوں میں کوندنے والی
سں تاہی نوداں جنوک	اے میری کڑکتی بجلی۔
لہیں غمانی دیر کنوک	اور اے میرے گہرے غموں کو دور کرنے والی
پوشیں من ءَ تیراں مجن	اپنے نوکِ مژگاں سے
شلیں نہاں من ءُ دبر ءَ	مجھے ایسے تیر نہ مار اور میرے سینے کو چھلنی نہ کر۔
ایرنگ منی ساہ نہ رَوت	اس طرح سے تو میں مروں گا نہیں!
زیر تو وَ نی جود ءِ جنگ ءَ	اپنے خاوند کی کمان
برات ءِ دو گوشیں خنجر ءَ	یا اپنے بھائی کا دو دھارا خنجر لے کر
ژِبیاں مئے منی پاکیں گُش ءَ	میرے پہلو میں اس طرح گھونپ دے کہ
ہر دو کشاں پار گوزیت	دونوں طرف آر پار ہو جائے۔
ہونوں ھُذگان ءَ رچنت	جب میرے منہ سے خون کی دھار ابل پڑے
پاک کن گوں شاریں پلّو ءَ	تب اپنے ریشمی دوپٹے کے پلّو
گوں ھِنی رجیں مور داتگان	اور اپنے مہندی رچے ہاتھوں سے اسے صاف کر دے۔
سہبی کہ بیاینت دسگہار	صبح کو جب تیری سہیلیاں
شاری و دابانی شلی!	شاری اور ناز و اداؤں والی شلّی آئیں۔

اَش تو ءِ پول ءَ کرت
شئے سنگریں کے ءَ جستہ

کس ءِ بدی ءَ آ نہ ات
اَش وت سیار ءَ دیر کنے
شئے پہ شپانی چرنگ ءَ
مارگوں سیاراں کپتہ
دشی ھے دھدی شپ ءَ
میر چاکر ءِ بور ءَ جتہ

اور تجھ سے پوچھیں کہ
اس صاحب ننگ و ناموس درویش کو
کس نے مارا ہے؟
جس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی
تب اپنے اوپر الزام نہ لے بلکہ
ان سے کہہ دے کہ شے مرید نے
راتوں کی اپنی آوارہ گردی سے
ہم کو بے آبرو کر رکھا تھا۔
کل رات گئے میر چاکر کے گھوڑے نے
اسے مار دیا ہے۔

روایت ہے کہ ایک دفعہ شے مرید رات کو تین بار میر چاکر کے قلعے کی فصیل کے نیچے سے گاتا ہوا گزرا۔ اور ہر بار ھانی اس کی آواز سن کر قلعے کے پہلے برج پر جاتی تاکہ شے مرید کی ایک جھلک دیکھ سکے۔ پہلی بار جب ھانی برج پر گئی تو وہ ننگے سر تھی دوسری بار جب گئی تو دوپٹے سے سر چھپائے ہوئے تھی۔ اور تیسری بار اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، جو کبھی کبھی ہوا کے جھونکوں سے اڑ کر اس کے حسین چہرے کو ڈھانپ لیتے تھے۔ میر چاکر بھی ہر بار ھانی کو چڑھتے اترتے دیکھتا رہا۔ لیکن اس وقت اس نے کچھ نہیں کہا۔ مگر دوسرے دن جس انداز سے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا اس سے شے مرید و ھانی کی وہ مشہور نظم تخلیق ہوئی۔ جس کی نظیر بلوچی شاعری میں بہت کم ملتی ہے۔

نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

پیری من زردیں دیگہ ءَ	پرسوں ڈھلتی عصر کے وقت
رندیں ءُ انت دیوان اُتنت	میر چاکر کے قلعے کے نیچے رند جمع تھے
میر چاکر ءِ کوٹ ءِ بُن ءَ	اُن کی مجلس جمی ہوئی تھی
بندے کرلبتہ چاکر ءَ	اس وقت رندوں کے توانا سردار
رند ءِ کوئی تیں نا جگ ءَ	میر چاکر نے ایک پہیلی کہی
دوشی گردکاں جنت پرڑی	رات کو سبی کے قلعے کے پہلے برج پر
سبی سری برُج ءَ جتہ ؟	کتنی بار بجلیاں کوندیں؟
رند بوجگ ءَ بہتگ انت	رند اسے بوجھنے سے عاجز رہے
کس ءَ نہ داتہ شاہدی	کوئی شخص گواہی نہ دے سکا۔
گوشتہ سلوک زنگیں کسان	ان میں دانا اشخاص نے کہا !
سردار! ٹیکہ جرطونے جترت	سردار! رات کو نہ گھٹائیں تھیں اور نہ ہی بادل
ڈگریں زمستاں ءِ شپ ئت	جاڑوں کی تازہ، صاف اور روشن رات تھی
بیدشہ جڑاں چوں بیت گروک؟	بادل کے بغیر بجلی کیسی !

مجلس میں شے مرید اور اس کے والد شے مبارک بھی بیٹھے تھے ۔جب سارے رند لاجواب ہو گئے اور ان میں سے کوئی بھی میر چاکر کے سوال کا جواب نہ دے سکا ۔تب شے مرید نے میر چاکر سے مخاطب ہو کر کہا :۔ سردار! اگر آپ اجازت دیں اور بعد میں مجھ سے گلہ بھی نہ کریں تو میں آپ کے سوال کا صحیح جواب عرض کر دوں گا ۔میر چاکر نے اسے اجازت دے دی ۔ تب شے مرید نے کہا : ؎

دوشی گردکاں ستے بر ءَ	رات سبی کے قلعے کے پہلے برج پر
سبی سری برُج ءَ جتہ،	تین بار بجلی چمکی

اولی برءُ، اشہا لوٹت — پہلی بار تیز روشنی ہوئی
دومی برءَ، رتّا لوٹت — دوسری بار، ڈھکی چھپی کچھ دھیمی دھیمی سی
سیمی برا اشیکاں تت — اور تیسری بار جب بجلی چمکی تو پتلے پتلے بادل بھی
چھائے ہوئے تھے۔

سوال کا جواب تو ہو چکا مگر خود شے مرید کی اس سے تسکین نہ ہوئی۔ اس نے اس کی تشریح بھی ضروری سمجھی۔ چنانچہ کہنے لگا کہ بجلی تو ضرور چمکی مگر وہ بادلوں میں چمکنے والی بجلی نہ تھی۔ بلکہ وہ تو: ؎

میر چاکرءِ ماھیں جنُ ئت — ھانی تھی، میر چاکر کی ماہ پیکر بیوی
ھانی، جنکانی سروک — ھانی، جو لڑکیوں کی سرتاج
سیاھیں شپءِ شہیں گروک — کالی راتوں کی چمکنے والی بجلی اور
وابیں دلاں، آگاہ کنوک — سوئے ہوئے دلوں کو جگانے والی ہے
گرنگ منءَ رسلِ گنوک — اور جس نے مجھے پاگل بنا رکھا ہے۔

شے مرید نے اس طرح کھل کر بات کر کے بلوچوں کی مجلس میں چاکر کی توہین کر دی۔ رواج کے مطابق میر چاکر کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ شے مرید کا سر قلم کر دے لیکن، قبیلے کے سردار ہونے کی حیثیت سے میر چاکر نے زہر کا یہ گھونٹ پی لیا۔ البتہ اُس نے مرید کے والد شے مبارک سے مخاطب ہو کر کہا: ؎

گندے مبارک! پتنگءُ — دیکھ لیے ہو مبارک! اپنے سپوت کو
گوں نار وائیں کنگءُ — اور سن لی اُس کی ہتک آمیز کہانی کو

برمجلس ءَ تنزانوں جنت

بھری مجلس میں مجھ پر طنز کرتا ہے۔

شئے مبارک جو ایک بوڑھا درویش تھا۔ اپنے بیٹے کی گستاخی سے سخت پریشان ہوا۔ پیر چاکر کا جواب سن کر اس نے مرید سے کہا: ۔

بہل او مرید! بہل او مرید!	چھوڑ دے اے مرید!
بدپیلی و بدراھی ءَ	چھوڑ دے اپنی ان بری حرکتوں کو اور اس بُرے راستے کو
اکل و سرءِ گمراھی ءَ	اپنی عقل و ھوش سے کام لے اور گمراہ نہ بن!
چاکر، تئی ءُ مئے نہ اِنت	چاکر تیرے برابر کا آدمی نہیں۔
لکھ و ھزار ءِ واجہ اِنت	وہ تو لاکھوں اور ھزاروں کا مالک ہے
زین ءِ سری کُل نُگرہ اِنت	اُس کے گھوڑے کی زین چاندی کی ہے
اسپءُ لگامءِ بیروزہ اِنت	اُس کے گھوڑے کی باگ پر فیروزے ٹکے ہوئے ہیں
زینی جبز و مروارد اِنت	اس کی زین پوش پر جواہرات اور موتی جڑے ہوئے ہیں۔
رودبندی لال و گوھر اِنت	اس کا رُود بند لعل و جواھر کا ہے۔
گوں چلّ ھزارءِ سواریت	وہ چالیس ھزار افراد کے (لشکر کے) ساتھ چڑھتا ہے۔
پوشندگ و تازی سوار	جو سب مسلح اور تازی گھوڑوں پر سوار رہتے ہیں
پھلیں پیادگ بے شمار	اس کے پیدل لشکر کا تو کوئی شمار ہی نہیں
تئی پھجگی ھند ءُ نہ اِنت	وہ تیری پہنچ سے باہر ہے

مگر شے مرید جو میر چاکر سے جلا بُھنا بیٹھا تھا۔ اور میر چاکر کے ہاتھ سے اس کے دل پر جو کاری زخم لگے تھے۔ اور جسے نشۂ عشق نے ڈر اور خوف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ شے مُبارک یا میر چاکر سے دبنے والا کب تھا۔ میر چاکر کا جاہ و حشم جس کے ذکر سے شے مبارک اسے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے تو اُس نے اپنے والد شے مُبارک سے کہا کہ میر چاکر اگر اتنا بڑا سردار ہے تو کیا ہُوا اسے

اُش من گُنڑے زیاد گ اِنت	مجھ سے بس ایک چوٹی بھر زیادہ ہے
سرداری ءِ نامی پر نت	صرف اس لئے کہ اسے سرداری کا نام حاصل ہے
آ، چاکر انت گرشیہک ءِ	وہ اگر شیہک کا بیٹا چاکر ہے
من دی مریداں پھلگدیں	تو میں بھی تو خوش پوش مرید ہوں
چم سہرو آشک دلبرین	میری بھی آنکھیں دلوں کو لبھانے والی اور آتش عشق سے سرخ ہیں۔
زیراں تتنکیں ڈنگرے	اگر میں ایک پتلی سی جھاڑی اُٹھا کر حملہ کر دوں
بندیر کلاتاں نہ یان	تو سنگین قلعے بھی مجھے روک نہیں سکیں گے

اس کے علاوہ شے مرید نے اپنے باپ سے کہا کہ میں ھانی کو کیسے بھول سکتا ہوں آپ جو ایسی باتیں کرتے ہیں۔ وہ محض اسی لئے کہ آپ نے ھانی کو دیکھا ہی نہیں۔ اگر سے

تو کر بدلیتیں دوست منی	آپ ھانی کو میرے دوست کو
ھانی گوں ہے دڈشیں گدان	اُجلے کپڑوں میں دیکھتے
کُٹیں سرو یوریں کلاہ !	تو نہ صرف اپنا یہ منڈا ہُوا سر اور
پر لگانش گار کتیں	اپنی مٹیالے رنگ کی ٹوپی
شلوار کے جنیڈ درکتیں	اس کے خرام ناز میں بھول جاتے

کین ءَ درائیں چاپ جُتین	بلکہ اپنی شلوار کا جیب بھی اتار کر پاگلوں کی طرح ننگا ناچتے

جب شئے مرید کی گستاخی اس حد تک بڑھ گئی۔ تو شئے مُبارک نے اپنا جوتا نکال کر اس کے سر پر دے مارا اس پر شئے مرید نے اپنے باپ سے کہا ؎

بشکنت کہ آ میں پت ءَ	آپ پر معاف ہے کہ آپ میرے باپ ہیں
لیڑ من ءَ تیسے جتین	لیکن اگر کوئی اور مجھے جوتا مارتا
رندان دو دیمی مارتیں	تو آج دونوں طرف سے رند زخموں سے چور ہو جاتے
حوناں ڈگار ءَ تریجگتیں	اور ان کے خون سے زمین سیراب ہو جاتی

یہ کہہ کر شئے مرید مجلس سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اور اپنے دل میں عہد کر لیا کہ ؎

گدَشتہ مبوتہ ءِ لیڑ ءَ	مبارک کے جوتے کھانے کے بعد
کنؤل انت کہ تراشاں جچوٹو ءَ	میں قول کرتا ہوں کہ اپنے گیسو منڈوا دوں گا۔
رمچے نہ منداں من جہ ءَ	ایک دن بھی گھر میں نہیں بیٹھوں گا
ہیکلباں ءَ زیت رواں	دور دراز منزلیں طے کر کے
من دیر سریا ملکے کپاں	دور کے کسی ملک کو چلا جاؤں گا
تہیک پہ حج ءَ رواں	بلاشبہ حج کے لئے جا کر
چیر مکہ ءِ جنڈیگ ءَ	مکہ کے فرش پر ان گنہگار ہاتھوں سے جھاڑو
گوں پرگن حین پنجگان	دوں گا۔

شاعر کہتا ہے کہ اسی رات کو ایک غیبی آواز نے شئے مرید سے کہا : ؎

پاڈا مریدا! پاڈا مریدا!	اُٹھ اے مرید! اب اُٹھ جا!
حاجی کری پیا حج ، رونت	حاجی جو حج کرنے جاتے ہیں ۔
سرحانا ش بنائنت تراشیں	وہ لکڑی کے تراشے ہوئے ٹکڑوں کو سرہانہ بناتے
واپ جا ارش پٹ استبد منگیں	چٹیل میدانوں پر سوتے
جوزانی کاسگ همره کنت	اور ناریل کے کاسے (کچکول) ہاتھ میں لے کر نکلتے ہیں ۔

اتفاق دیکھئے کہ دوسرے دن ہی نیم برہنہ درویشوں کی ایک ٹولی مکہ کو جاتی ہوئی سبی پہنچی ان ننگ دھڑنگ درویشوں کو دیکھ کر شئے مرید نے اپنے دوستوں سے کہا ؛ ؎

من کر ملنگ بان و گدا	میں ملنگ اور بھکاری بن کر
من چو تو د ہر شئے گڈ ئہ	اور ایک ہاتھ بھر کپڑے کا لنگوٹ باندھ کر
من گوں مے مرداں روان	ان لوگوں کے ساتھ ان ننگ دھڑنگ ساتھیوں کے ساتھ چلا جاؤں گا ۔

جب شئے مبارک کو معلوم ہوا کہ واقعی مرید "تارک الدنیا" ہو کر ان درویشوں کے ساتھ مکہ جا رہا ہے ۔ تو وہ بھاگا بھاگا اس کے پاس آیا اور اسے منتیں کیں ۔ کہ ؛ ؎

هڈاں گریب گور مکن	اے مرید! اپنی ہڈیوں کو پردیس میں دفن کرنے نہ لے جا

جان پہ شد و تن ءَ مکش
ماشے اُن دشاہی نہوں
بندوں وانامال دیدل
سایا ءَ میرے چاکرءِ

اپنی جان کو بھوک اور پیاس سے نہ مار
ہم درویش ہیں بادشاہ نہیں
میر چاکر کے سایۂ عافیت میں ہم رہتے
اور اس کی بخششوں پر گزارہ کرتے ہیں

گر شے مرید اب اس کی باتوں میں آکر اپنے ارادے سے باز آنے والا نہ تھا.
بالآخر باپ کی التجاؤں کو ٹھکرا کر اس نے اُن درویشوں کے ساتھ مکہ کی راہ لی.
لیکن عشق کی آگ جو اس کے دل میں لگی تھی وہ مکہ کی زیارت سے بھی بجھ نہ سکی.
ھانی کی یاد نے اسے وہاں پر بھی چین سے رہنے نہیں دیا۔ مکہ میں اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے شے مرید اپنی ایک نظم میں کہتا ہے کہ :—

من گونشاں براتاں گم زدی بارے گپتگاں

آدھی آدھی راتوں کو نیند سے بیدار ہو کر
میرے ہمدرد ساتھی مجھ سے پوچھتے ہیں.
شے ! آخر تمہیں یہ ہو کیا گیا ہے.
کہ ہمیشہ سرد آہیں بھرتے رہتے ہو.
میں اُن سے کہتا ہوں بھائیو ! میں
نے دکھوں کا ایک ایسا بوجھ اٹھایا ہے

نے جُھٹش زیرنت ونے دودنتا نش چپت کنت
لیٹرواش چتریں پہ ڈلے ناکامیں بُرُنت
آھنی پلک نت گوں منی بالاد ءَ جُھُنت

جسے نہ تو اونٹنیاں اٹھا سکتی ہیں
اور نہ ہی کم سن اونٹ
البتہ پکی عمر کے سانڈ شاید اُسے اٹھا کر
منزل تک پہنچا سکیں.
یہ دکھ لوہے کی تختیوں کی مانند

جیل وزمزریت پہ منی گٹ ءَ کپتگنت ۔	میری قامت کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں لوہے کی بیڑیوں اور زنجیروں کی طرح میرے گلے میں پڑے ہوئے ہیں
چاکر ءَ پہناتی من ءَ کاٹارے جنگ	چاکر نے ترچھا وار کرکے میرے سینے میں ایک ایسا کٹار گھونپا ہے
اَچ دل ءَ بندان چوُ ءَ چہ پشت ءَ دَر گتگ	جو میرے دل کو چیرتا ہُوا میری پیٹھ سے باھر نکل آیا ہے
تازگنت ٹپّش حون ھُذکان ئنت چہ دپ ءَ	وُہ زخم اب بھی تازہ ہے جبھی تو میرے مُنھ سے خون اُبلتا ھے ۔
ٹپ منی سرپوشنت ، گُبگُباریں دردے کنت	میرے زخم ڈھکے چھپے ہیں اور اُن میں ایک ہلکا ہلکا سا درد اُٹھتا ھے
ٹپّانی درمان ھانی ءِ بُچلیں کھند گنت	میرے زخموں کا علاج ھانی کی پھول جیسی ہنسی ہیں ھے
تیل وزھمیگش ھانگل ءِ ارسنت تروُنگیں	اور اُس کے اولوں جیسے آنسو اُن پر تیل ومرھم کا کام دیتے ھیں ۔

لبعض روایات کے مطابق تھے مُرید نے پہلی بار مکہ میں تیسؔ سال گزارے۔ لیکن اُس کی نظموں سے معلوم ہوتا ھے کہ وُہ پہلی بار وہاں صرف تین سال رہا۔ تیس ۳۰ اور تین کا اختلاف شاید بلوچی کے اعداد سی ۳ اور سی ۳۰ سے پیدا ہُوا ھے۔ جو گویّوں کی قرأت نظم میں در آیا ھے جیساکہ اس مصرعہ میں مُرید کہتا ھے " سے سال ھماں گوُہر گار کُتاں " یعنی میں نے تین سال وہاں ضائع کئے۔ اگر سے کو کوئی " سی " پڑھے تو بھی مصرع کے وزن میں فرق نہیں پڑتا

بہرحال مکہ میں شے مریدنے ہانی کے درد ہجر و فراق میں کئی پُرسوز نظمیں کہہ دیں۔ سبز کبوتر سے مخاطب ہو کر اس نے جو نظم کہی ہے، وہ ایک مشہور اور مقبول نظم ہے۔ اس میں شے مرید کہتا ہے:-

جی کپوت سبزیں، مکہ ءِ دربار ءِ کپوت	اے پیارے سبز کبوتر! اے مکہ کے دربار کے کبوتر
مکہ ءِ دربار ءِ کپوت نزاد ان مجّن !	اے مکہ کے دربار کے کبوتر تو زیادہ دیر نہ کر!
الگ دزنکاں پہ منی بالاد ءُ نگش	میرے دکھوں پر اس قدر زور
نگلی ڈیلاواں وپتگیں واب ءُ پاد مکن	میرے دل میں خوابیدہ امنگوں کو نہ جگا:
ھکیں دشتار ءِ پہ، کہریں دریاءُ کپتگاں	میں اپنی جائز منگیتر کے لئے
	بحرِ ظلمات میں گرا ہوا ہوں۔
من زرءِ گُبّ ءَ کپتگ، ھپت پشتیٔ تنتاں	سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں سات پشتوں
	تک کے لئے ڈوب چکا ہوں
جی کپوت سبزیں! بیا پرہ لال ءِ گندگ ءَ	اے پیارے سبز کبوتر! اب تو میرے پاس آجا
	اور میرا قاصد بن کر میرے لعل جیسے دوست
	سے ملنے کو چلا جا۔
چماں داراں سبے، ڈھاڈر دیبی نیمگ ءَ	ڈھاڈر اور سیبی کی طرف نظر جمائے رکھ
بُرز ءَ آسمان انت چیرگ ءَ نیلوئیں زرنت	تیرے اوپر صاف نیلا آسمان ہوگا
	اور نیچے نیلگوں سمندر
زامریں درچکے نیت، اشپی شپد رنگ ءُ گرے	زامر جیسا کوئی سبز درخت نہیں ہوگا۔
	جس پر تو رات کو ٹک سکے۔
سنگیں بچنے نیت۔ دتی بااللہ سُرتیئے	اور نہ ہی دور کوئی پہاڑی ہوگی۔
	جہاں بیٹھ کر تو اپنے پروں کو آرام پہنچا سکے

دھؤ دناد فلد اتوتن آدمیگ، گرُستے

مسلسل اُڑتے اُڑتے کسی نہ کسی وقت
سمندر کے اُس پار پہنچ جاؤ گے۔

شے مرید، اسی نظم میں آگے چل کر کبوتر سے سوال کرتا ہے کہ مانا کہ تم ستپی اور ڈھاڈر کو پہنچ گئے، لیکن وہاں ھانی کو پہچانو گے کیسے؟ اس لئے کہتا ہے کہ میرے اور زیادہ قریب آؤ کہ میں تمہیں ھانی کی نشانیاں بتلا دوں تاکہ تم اُسے پہچان سکو۔ ـــ

کوھسری گگلے پہ سبک گاماں ایر کنت
نستہیں مارے گربہی وکشیت گردن ءَ

ھانی ایک سبک خرام پہاڑی چکور کی طرح
ایک بے کینچلی کے سانپ کی مانند ہے
جو اپنی گردن اونچی اُٹھائے رکھتی ہے
وہ ایک ایسی ہرنی جیسی ہے جو
اپنی ہمجولیوں سے علیحدہ رہتی ہے۔

نلی کمر گوشے ھرزماں سرتاں چرِیت

وہ پہاڑ کے دامن کے ایک ایسے خرگوش جیسی ہے
جو بلندیوں پر چرتا ہے۔

گوات جتیں سیدے کرش اَ، سیا ھینڈاں سُریت

وہ شکاری کی بُو پا کر بھاگنے والی
اس پہاڑی بکری کی طرح ہے جو
کالی چٹانوں پر پھسلتی ہے

ترونگلیں آپے اَچہ شاھجواں تچیت

وہ اولوں جیسے ٹھنڈے اور پانی کی طرح ہے
جو تُرکی پہاڑی ندیوں میں بہتا ہے

نوذ کرندال بنت ھانی ءِ وزبیں سہرنت

رسّے کی طرح بل کھاتے ہوئے ھانی کے گیسو
(آسمان) پر چھائی ہوئی گھٹاؤں کی طرح ہیں

نوذ گوارار بنت ھانی ءِ اَرسّ نت ترونگلیں

اور اس کے آنسو

مینہ کی جھڑی کی طرح جو بادل سے گرے

مُریدؔ کبوتر کو خبردار کرتا ہے کہ جب تم بمبئی پہنچ کر ھانی کو پہچان لوگے تو دیکھنا اُسے
میر چاکر کی موجودگی میں اُس سے نہ ملنا۔ بلکہ :

چاکر ءِ ردء گننہ بما تہرتہ ءِ پادگ ءَ — میر چاکر کی آنکھ بچا کر
تو ھانی کے پلنگ کے سرہانے بیٹھ جانا

سک نہ ڈھبیں کرنا گماں آزار گیرتہ جل ءِ — ہاں! زور زور سے پکار کر اسے نہ بلانا
کہیں اسے دل کی بیماری لگ جائے۔

ٹُکرہ ئیں سُنٹ ءَ مس حریری درکمانی بجن — اپنی منقار سے اس کے گلے کے ھار کو
پکڑ کر آہستہ سے کھینچ لینا۔

جوزدیا دابیں چمئے چہ واب ءَ پچ بیت — اس کی بادامی آنکھیں کھُلیں گی

بیدار ہو کر جب ھانی تجھے دیکھ لے گی تو سمجھ لے گی کہ ہو نہ ہو یہ کسی کا قاصد ہے
تب وہ :-

دراج کنت دست ءُ گیرت ترا انگشتیں بازلاں — ہاتھ بڑھا کر تجھے تیرے منقش پروں
سے پکڑ لے گی۔

زیریت و روتیں اس وتی سار تیں گوات گر ءَ — اور تجھے اُٹھا کر اپنی ماڑی کے اندر لے جائے گی

چینکت ریچیت۔ من وتی شاربیں پلوّ ءَ — اپنے دوپٹے کا پلو بچھا کر تجھے چوگا دے گی

نیں ترا پرسیت، اکاہے چہ دیریں ھاہل ءَ — اور پھر تجھ سے پوچھے گی کہ :
اے کبوتر! کہیں دور سے آرہے ہو؟

بگوا کا بہ دوں شئے عرزی نہ ئیں سرگپتگاں — کہدینا ہاں! شے کا پیغام لے کر

بہت دُور سے آیا ہوں ۔
کل نہ پرسوں وہاں سے چلا ہوں

بانزلوں تَرّنت ءَ زرءِ لہراں گیپگنت
میرے پروں کو دیکھ ! تر ہیں ۔
سمندر کی موجوں کی وجہ سے

جان منی زُنڈانت، اگّا پنداں دءِ زرین
میرا جسم دیکھ ! تھکن سے چُور ہے
بہت دُور کی مسافت طے کرنے کی وجہ سے

چم منی سھور نت کہ من شپاں بے واب بیتگاں
اور میری آنکھوں کو دیکھ ! سُرخ ہیں
اس لئے کہ میں راتوں کو بے خواب رہا ہوں

مرید کبوتر سے کہتا ہے کہ جب تم ھانی کو یہ بتادو گے کہ تم شئے مرید کے قاصد ہو اور مکہ سے اُڑ کر آئے ہو تو اسے

تر ونگلیں اَرسی کانٹ من آ ءِ کی دیدگاں
تو اُس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں
اُولوں جیسے آنسو بھر آئیں گے

ارسانی مٹیں کہ ریہ انارکیں دیمانی سرءَ
لیکن خیال رکھنا کہ تم اس کے
آنسوؤں کو
اس کے انار جیسے سُرخ گالوں پر گرنے
نہ دینا ۔

اَیچ ھداں بال کن نند مں گیوار ءِ دپ ءَ
تم فوراً وہاں سے اُڑ کر اس کے سر پر
مانگ کے کنارے آ بیٹھنا

شرءَ مُں سنٹ ءِ چیر دءِ ارسانی بگیر
اور اپنی طلائی منقار سے اُس کے
آنسو پونچھ لینا ۔

ارسانی ہیٹیں کرے گل ءَ آزار ءَ دئیت	آنسوؤں کو بہنے نہ دینا کر ان سے اس کے پھول جیسے چہرے کو تکلیف پہنچے گی

شبو ترے اس قدر کہہ دینے کے بعد۔ مرید کو اچانک خیال آتا ہے کہ ھانی تو اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئی ہے۔ ھانی، اب تو میر چاکر جیسے ایک ذی شان سردار کے حرم میں ہے اس خیال کے آتے ہی مرید کے دل میں ایک ھوک سی اٹھتی ہے جذبۂ انتقام سے بے چین ہو کر چلا اٹھتا ہے۔

من مریدواں مکہ ءِ درسبز ءُ ڈوپ ءُ	میں مرید، مکہ کی درگاہ کے سامنے تبدیل ہو گیا ہوں۔
ھانی پُر چاکرءِ گوں مزن نامیں چاکرءَ	اور ھانی، نامور میر چاکر کے ساتھ خوش ہے
نہ من ءُ وا کہ گوں چاکر ءَ دعا دئے کنان	مجھ میں اتنی طاقت بھی نہیں کہ میر چاکر کے ساتھ لڑ سکوں۔
کوٹائی پرہ شان و ھانی چہ دستانی ءُ پیچ گران	لیکن اے میرے دیوانہ دل! اس کے
زبانے او دل کہ اُچ گل ءَ صیکیم نہ بئے	باوجود تم اس پھول جیسی محبوبہ سے دستبردار نہیں ہوتے۔
سکے چو سنگ ءَ پنبگ ءَ تیلیگ ءُ رجے	بیشک کہ تم پتھر کی طرح سخت ہو۔ لیکن دیئے کے تیل میں بھیگو کا پھول رومال کی طرح رات بھر جلتے بھی رہتے ہو۔
ھانی! ئیٔ نزیکی ءَ تئی دیری بہتر انت	اے ھانی! تیری قربت سے تیری دوری بہتر ہے۔
شپ شپاں کایے من خیالاں ءِ جشن کنان	ہر رات کو میرے خوابوں میں آتی ہو!

اور میں تیرے خیالوں میں ڈوب کر
جدائی کی راتوں کو سحر کر لیتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ تین سال مکہ میں گذارنے کے بعد شے مرید کے دل میں ہانی کو ایکبار پھر دیکھنے کی ہوس پیدا ہوئی۔ آخر وہ دن بھی آیا۔ جب مکہ کے حاجیوں کو لے کر ایک کشتی بلوچستان کے ساحل کی طرف روانہ ہوئی۔ اس کشتی میں شے مرید کے علاوہ افغانستان کو جانے والے کئی درویش اور بھی تھے۔ ہانی کہتی ہے :-

دوشی سرمنی سنگین ئت
پچھلی رات کو غم و فکر کے ہجوم سے
میرا سر بھاری تھا۔

نشتاں چاکرءِ ماڑیگ ءَ
میں میر چاکر کے محل کے بالا خانے پر
بیٹھی ہوئی تھی۔

برزءَ مں سری بادگیر ءَ
شام کو سمندری ہوائیں چلی تھیں
کوشت ں کپتہ بیگاہی
اور صبح کو کہر چھا گئی تھی۔
نوداں شنز تنگ بانگواہی
میرے کانوں کی بالیاں اور آویزے
دڑدں میتنت گوں بوجان
میرا باریک ریشمی دوپٹہ
مہناءِ سرءِ گوں بیکاں
اور میرے گیسو پھوار سے بھیگ چکے تھے
روچ کہ گوات سرد بیگاہ بیت
میری تو یہ حالت ہے کہ
جب دن ڈھلنے لگتا ہے اور شام
کا پہر آتا ہے۔

دل بریں زہیروں نیگلنت
تو دل کو چیرنے والی یادیں
مجھے رات بھر ستاتی رہتی ہیں۔

	پچھلی رات کے پچھلے پہر بھی
کپتوں ترانگ ءَ شپہگ ءَ	مجھے رہ رہ کر شئے مرید کا خیال آتا رہا
اَرسوں گلگلنت منی چماں	میری آنکھیں رات بھر آنسو برساتی رہیں
چو بشّامی نہ گورئیں نودان	ساون کے اُن بادلوں کی طرح
گوارنت دنہ بُرّنت پچھبہ	جو برسنے پر آتے ہیں تو تھمتے ہی نہیں

ای وجہ سے ھانی کہتی ہے کہ دوسرے دن صبح کو میری طبیعت بہت مغموم رہی خیال آیا کہ ذرا باھر دریا کے کنارے جاکر دل بہلاؤں۔ چند سہیلیوں کو ساتھ لے کر میں گھر سے نکلی اور دریا کے کنارے ایک ریت کے ٹیلے پر چڑھ کر میں نے دیکھا کہ

بوجیئے زِرءَ لڈان اِنت	ایک کشتی، سمندر میں ہچکولے کھاتی
	چلی آتی ہے۔
آچارے دوگوشیں مان اِنت	اُس کا دو گوشہ بادبان چڑھا ہوا ہے
بوجی گرّگی تزیزان اِنت	اور کشتی مچھیری کی طرح
	موجوں پر اُچھلتی۔ کودتی چلی آرہی ہے
واگان ناھدا داران اِنت	ناخدا نے اس کی باگیں تھام رکھی ہیں
سی گوازء تیاب ءَ اَتکہ	جب وُہ کشتی، تین ۳ گز پانی میں (ساحل پر)
لوھیں لنگرش پرینتگ	آئی۔ تو ناخدا نے لوہے کا لنگر ڈال دیا۔
مچھوگاں روڈو آ بیتگ	مچھیروں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں آنے جانے
	لگیں۔
میاں کابلی اِیر کپتنت	اس میں سے کابل کے درویش اُترنا
	شروع ہوئے۔

اس وقت ھانی کہتی ہے کہ میں نے ایک لیے درویش کو کشتی سے ساحل پر اترتے دیکھا جس پر مجھے شبہ ہوا کہ

آئے شے مبات گوں ملنگ ءَ
من پہ گمان ءُ شوبہ اوں
گیشتر پہ ڈیل و ملنگ ءَ
گیشتر پہ دست ءُ شانگ ءَ
ارساں مینگاں ووڑ کتت
گیشتر پہ لشاں جگرّ ان
ھوری نہ گورِت ابر ترونگل ءَ
پرسنت من ءَ جاں ءِ گہار

ھانی! ترا پہ بیگنت
گوں گشتاں، گہاراں، بہیل کنہت
درد ءِ من ءُ استیں دل ءَ
سردرد دیاں مئی گلگے

بیائت بترّوں ما پدا

کہیں وہ شے مرید تو نہیں !
مجھے اس کا قد و قامت اور رفتار دیکھ کر
اور کچھ کچھ اس کے ہاتھ ہلانے پر شک گزرا
میری حالت غیر ہوئی
میری آنکھوں سے آنسو پھوٹ بہے
ساون کے بادلوں کی بارش کی طرح نہیں
بلکہ اولوں کی طرح
میری یہ حالت دیکھ کر میری سہیلیوں نے
مجھ سے پوچھا !
ھانی تجھے ہو کیا گیا !
میں نے کہا ! سہیلیو ! مجھے معاف کرو
میرے دل میں درد ہو رہا ھے
مجھے صبح کی سردی لگی ھے
کھانسی اور دردِ سر بھی ھے
آؤ اب ھم واپس چلیں ۔

ھانی اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں واپس گھر پہنچی ۔ حاجی اور کابلی درویش جو کشتی میں آئے تھے ایک ایک کر کے ساحل پر اُترے اور پھر ڈولیوں میں اُنھوں نے شہر کا رخ کیا ۔ جب سب چلے گئے اور مرید اکیلا ساحل پر رہ گیا تب اس نے ۔

کچکول دھَا اش زرتگ — اپنا عصا اور کچکول اٹھایا

ریمپہ ھآنی ءِ چار کھل ءِ — اور ھانی کے گھر کی طرف چل پڑا

ھانی کے گھر کے دروازے پر

اَلّاءُ جتہ۔ ادشتاتہ — اس نے اللہ کی صدا لگائی اور کھڑا رہا

ھآنی کہتی ھے کہ درویش کو اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر میں اٹھی اور گندم سے کاسہ بھر کر اسے پیش کیا۔ لیکن درویش نے گندم لینے سے انکار کیا۔ میں اس کی منت سماجت کرنے لگی۔ تو درویش نے ایک ایسی آہ بھری کہ میرے دل کی دھڑکنیں تھم گئیں۔ اور بعد شکل اپنے پر قابو پا کر میں نے اس سے کہا:

اُچیّار اُں مجن پہ جان ءِ — اے درویش خدا کے لیے میرے سامنے سرد آہیں نہ بھرا کر

جانوں سہتگ ویران ءِ — میرا دل پہلے سے جل کر کباب ہو چکا ہے

گاروں پہ دانگءُ ورتگ ءِ — میں اس ذرّہ یک دانہ کے لیے برباد ہو چکی ہوں۔

پہ دیم ءِ گندگ ءِ تحنا جاں — اس چہرے کو ایکبار دیکھنے کیلئے ترس رہی ہوں

لیکن ھانی کہتی ہے کہ درویش نے اس کے باوجود مجھے کوئی جواب نہیں دیا بس خاموش کھڑا گھور گھور کر مجھے دیکھتا رہا۔ تب میں نے اس سے پوچھا:

کایے چہ مکہ ءِ دربند ءِ — اے درویش! اگر تم مکہ کی درگاہ سے آرہے ہو

گل کن، اِدے من ءِ احوالے — تو پھر مجھے ایک خبر سنا کر نہال کر دو

مبیائے زند لیتے چوشیں :
ھنچو کرتئیں درنائے
نامی شئے مرید، وتیگ انت

کیا تم نے وہاں مکہ میں ایک ایسا درویش
نہیں دیکھا جو بالکل تم جیسا ایک جوان ہے
اور شمشیر زن مرید جس کا نام ہے

میرے اس سوال پر ھانی کہتی ہے کہ درویش کا چہرہ کھل گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی دلربا کشش پیدا ہوئی جو مجھے مسحور کر گئی۔ میری دلی کیفیت بھانپ کر درویش نے مجھ سے پوچھا کہ مرید تم کو چھوڑ کر کیوں چلا گیا۔ تب میں نے اس سے "رندوں کے چار قول" اور میر چاکر کی گمنا ؤنی سازش کا ذکر کیا۔ اور اُسے یہ بھی بتا دیا کہ مرید نے کس طرح اپنی منگیتر کو یعنی مجھے میر چاکر کے بھیجے ہوئے ڈوم گویوں پر بخش دیا۔ اور خود درویش بن کر مکہ کی زیارت کو چلا گیا۔ جب میں نے یہ تمام باتیں بلا کم و کاست اس سے کہہ دیں تب اس نے ایک شان بے نیازی سے مجھ سے کہا: ؎

بی بی! دریاءُ تہ ءِ لے گوازانت

بی بی! جس طرح کہ سمندر کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں ؟

سیاں مکہ ءِ سک بازانت
بلے چوشیں مرد پراداں نیستں
کہ نامی شئے مُرید و تیگ انت

اسی طرح مکہ میں درویشوں کا بھی کوئی شمار نہیں البتہ میں نے وہاں کوئی ایسا درویش نہیں دیکھا جس کا نام شمشیر زن مرید ہو۔

درویش کا یہ جواب سُن کر ھانی کہتی ہے کہ: ؎

دردے نا پگاڈئں گپیتہ
اُپھارے جتہ ارنشتان

میری ناف سے ایک درد اُٹھا
اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر میں بیٹھ گئی

ھائے افسوس!

کہ ہمن چاکرءِ ھرچیان انت

وہ میر چاکر کی شامتوں کا مارا ہوا تھا

گیشتر بمنی سے روچان — یا تو میرے سوگ میں مر چکا ہے
نیل بوئیں زرءِ ادگارِ نت — یا نیلے سمندر کی گہرائیوں میں کہیں ڈوب چکا ہے

ھانی کہتی ہے کہ میری پریشانی کو دیکھ کر درویش نے مجھ سے سوال کیا کہ: ؎

ٹئے بوکس ترا سوج ءِ دنت — اگر کوئی شخص تجھے شہ مرید کا پتہ بتائے
بستاگ ءِ دیئے تو چیئے — تو تم اسے انعام میں کیا دو گی ؟

ایک آہ سرد بھر کر ھانی نے کہا : ؎

گوش ءِ گوانزلوکیں دُراں — اپنے کانوں کی جھولنے والی بالیاں
دست ءِ سنگوان سیبیگیں — اپنے ہاتھوں کے سیپی کے بنے ہوئے کنگن
پونز ءِ پُلک دگرانزلیگان — اپنی ناک کی نتھ اور موکھی
پاد ءِ مارسریں پادینکان — اپنے پاؤں کے جھانجھر
جن کے کنارے سانپ کے سر جیسے ھیں
کمش گوں سی ھزاری گنجان — اپنا گھر تیس ھزار روپے کے اثاثہ کے ساتھ
اور میر چاکر کو بھی
چاکر گوں سلاہ وسنجان — اس کے ہتھیاروں اور گھوڑے کی طلائی زین کے ساتھ.
اسے بخش دوں گی
انگت، سرءَ قربان انت — اور ان کے علاوہ اپنا سر بھی قربان کردوں گی

ھانی یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور درویش کی بہت منت سماجت کرنے لگی کہ اس کی جیش

کی ہوئی خیرات قبول کرلے لیکن درویش نے انکار کرتے ہوئے کہا: ؎

بی بی! من نہ زیراں و صاماں	بی بی! مجھے خیرات میں غلہ نہیں چاہیئے
سیاں ئے نہ یاں شام پنڈیں	میں بھیک مانگنے والا کوئی فقیر نہیں ہوں
پتن پکیں چنڈے بیار	مجھے پکی ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا لا دے
	اور اس پانی سے جس میں تو نے اپنے
	معطر گیسوؤں کو دھویا ہے
لوگھا رٹیں سرءِ شو دوکان	ایک پیالہ بھر کر مجھے پلا دے۔

شاعر کہتا ہے کہ اتنے میں میر چاکر کی بہن وہاں آپہنچی۔ اس کے ساتھ حرا فہ زینب بھی تھی۔ چاکر کی بہن نے حانی کو بہت لعنت ملامت کی کہ وہ اس درویش کو جس کی نظریں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں۔ خیرات لینے کو منت سماجت کیوں کر رہی ہے۔ یہ کوئی درویش تھوڑا ہے یہ تو کابل کا کوئی مشہور ٹھگ اور دھوکہ باز لگتا ہے اسے ڈانٹ کر چلتا کرے۔ چاکر کی بہن کی تلخ و تیز باتیں سن کر درویش نے کہا: ؎

سیاں پر شئے ھر جان اپنت	یہ درویش تو تمہاری شامتوں کا مارا ہوا ہے
شُرّیں چاکر ءِ سے رد چان	جو بدبخت چاکر کا ماتم کرتا پھرتا ہے (اے حرافہ خوب جان لے کر)
سیاں ئے نہ یاں شہرانی	میں شہروں میں گھومنے پھرنے والا کوئی فقیر نہیں ہوں۔
جوگیاں ھے کُنلانی	بلکہ ان ہی گھروں کا جوگی ہوں۔
شارو و شَرّی اش ماں ئنت	جہاں، شارو، شری اور حسن حانی رہتی ہے

سیمی، گوُمنڈکیں ھـــانی اِنت
پہ دیم ءِ گِندگ ءَ تحتاجاں
چم ءِ چارگ ءَ شیداں

ھانی جس کی شکل دیکھنے کو میں ترستا ہوں
اور جسے ایک نظر دیکھنے کے لئے میں دیوانہ
بن چکا ہوں۔

اتنا کہہ کر درویش پلٹ گیا۔ ھانی کہتی ہے کہ اس کی رفتار اور ہاتھ ہلانے کے
انداز سے میں پہچان گئی کہ: ؎

اے مردِ شے مریدءِ وتیگ انت
من پہ لمگاں دُرست گرتاں
میری لمگ دا آستینکاں

یہ شخص تو شمشیر زن مرید ہے
میں نے اس کی رفتار سے
اس کی امیرانہ چال اور آستینوں کے
جھول سے اُسے پہچان لیا

کور بانت منی دوئیں چم
منڈ بانت منی ہر دو دست
شے وَ من نہ زانت شاہین ءَ

ہائے میری دونوں آنکھیں پھوٹ جائیں
میرے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں کہ
میں بادشاہ صفت، شے مرید کو
پہلی نظر میں کیوں نہ پہچان سکی

پشکوں لانچنگ تاں کونڈاں

اب گھٹنوں تک میں نے اپنا دامن
چڑھا لیا۔

دیرکاں زرتگاں پہ رند ءَ
مٹے ءِ رپتگاں انباز ءَ
پھلی داشتنی من گرانزان
ماجہ چندن ءِ بو ءَ کنت

اور چھلانگیں لگاتی ہوئی اس کے پیچھے بھاگی
تاکہ شے کو میں اپنی آغوش میں لے لوں
اور اسے پھول کی طرح اپنے نتھنوں کے
قریب لے جاکر
اس کی خوشبو سونگھ لوں۔

میرے مالک سے چندن کی خوشبو آتی ہے

تنگیں دل ءَ بوءَ دنت — جو میرے دل کو توانائی بخشتی ہے

لیکن ھانی کی گریہ و زاری اور منت و سماجت کے باوجود شے مُرید رکا نہیں ھانی کو وہیں چھوڑ کر بغیر کچھ کہے سُنے جس طرف سے آیا تھا اسی طرف کو واپس چلا گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ ھانی ساحل پر کھڑی با چشم گریاں دیکھتی رہی کہ : ؎

شے پرلوچی ءَ ایر کپتہ — شے مرید، جاکر کشتی میں بیٹھ گیا

شومیں ناھُدا ءَ زپتہ — ناخدا بدبخت نے لنگر اُٹھا لیا

دیمپہ کعبتہ اللہ رپتہ — اور کشتی پھر کعبتہ اللہ کی طرف روانہ ہو گئی

شے مرید کے جانے کے بعد اس کے لئے ھانی کی بے چینی زیادہ بڑھ گئی جس کا وُہ ایک دلکش انداز سے اشعار میں اظہار کرتی رہی ہے۔ ایک دفعہ جبکہ بادل آئے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تو ھانی کو سمندر کی ناپیدا کنار وسعتوں اور جزر لیتہ ان کی جھلس دینے والی گرمی میں شے مرید کی حالت زار کا خیال آیا تو، بادلوں سے مخاطب ہو کر گویا ہوئی ؎

نوداں بگوں شما سوالیگاں — اے بادلو! میں تم سے عرض کرتی ہوں کہ

بلہت گوارگاں زمیناں — اپنی ہلکی ہلکی پھوار یہاں پر برسانا چھوڑ دو

گوارت من ءُ زیدءُ گہرین ءَ — یہاں سے جاؤ اور جاکر طوفان بدوش سمندر پر برسو!

یا بر مکہ ءِ دربند ءَ — یا پھر مکہ کی درگاہ پر مینہ برساؤ

نوخشتاں شے ءِ میسنیت — اور شے مرید کے سبزۂ خط کو

شے ءَ چو لٹاں جتنیا صیناں
نا ں ہارکنت دہ صیناں
آگاہ کنت وا بیناں
سر سایگ سر و پاگاں بت

اور اُن کے اُن کالے گیسوؤں کو
جو تندرستوں کو بیمار اور سوئے
ہوؤں کو بیدار کر دیتے ہیں۔ جگر دو
اور اس کے سر اور پگڑی پر چھاؤں کرو

اس دفعہ مکہ جا کر، شے مرید تقریباً پچپن سال وہاں رہا اور اس دوران میں اس نے حانی کے فراق میں پچپن نظمیں کہیں۔ چنانچہ خود کہتا ہے کہ : سے

پنجاہ پنج سال گشتگاں
پنجاہ پنج شیر گوُشتگاں
او میتں، گرشت اش کناں

پچپن سال میں نے وہاں قیام کیا۔
اور پچپن نظمیں کہیں۔
اُمید ہے کہ ساٹھ نظمیں، پوری کر لوں گا

لیکن شے مرید ساٹھ نظمیں پوری نہ کہہ سکا۔ غالباً بہت جلد بعد اُسے درویشوں کی ایک ٹولی کے ساتھ پھر وطن کی طرف کوچ کرنا پڑا
درویشوں کی یہ ٹولی۔ جن کے ساتھ شے مرید بھی تھا۔ جب سیبی پہنچی تو بقول شاعر اُس وقت : سے

میر چاکر ءِ کوٹ ءِ بُن ءَ
مند جم اَتنت، شر ترش جتنت
نگر انش نے آدِتت

میر چاکر کے قلعے کے پائین میں
رند جمع تھے۔
انہوں نے طغرے کا نشانہ رکھا ہوا تھا
اور تیروکمان سے شرط لگا رہے تھے۔

شے مرید کو یہ سماں دیکھ کر اپنی جوانی یاد آ گئی۔ اُن دنوں کا نقشہ اُس کی آنکھوں

کے سامنے پھر گیا جبکہ وہ اپنے لوہے کی کمان پر چلہ چڑھا کر نشانے پر تمام رندوں سے بہتر تیر ماتا۔ اور بازی جیت جاتا تھا۔ آج پھر اس کے دل میں کمان سے تیر چلانے کا شوق پیدا ہُوا اور اس نے ان نشانہ باز رندوں سے کہا کہ مجھے بھی ایک کمان دے دو تاکہ میں بھی ایک تیر چلا کر دیکھ لوں۔ رند جو اس وقت تک مُرید کو بھول چکے تھے اُسے پہچان نہ سکے۔ تب اُن میں سے ایک نے کہا ہاں! درویش کو ایک کمان دیدو کہ اپنا شوق پورا کرے۔ رند نوجوان ہنس پڑے اور پھر اُنھوں نے تفریحِ طبع کے لئے ایک تیر اور کمان شئے مُرید کو پکڑا دی۔ شاعر اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ۔ ۔

اولی اِش دانتت پہ ملستڈ	پہلی بار اُنھوں نے مذاق اُڑانے کے لئے اسے ایک کمان دی
پرُشتہ کمان، بیتہ کلنڈ	لیکن جب مرید نے اسے کھینچا تو کمان ٹوٹ کر ناکارہ ہو گئی
دومی اِش دانتت پہ ہُنر	دوسری بار انہوں نے سوچ کر اسے ایک کمان دی۔
پرُشتہ کمان ءِ بند وسر	اس کمان کی تانت ٹوٹ گئی
سمی اِش دانتت پہ گمان	تیسری بار اُنھوں نے مشکوک حالت میں اسے ایک کمان دی۔
سے ٹکرُت پیش ءُ کمان	یہ کمان ایسی ٹوٹی، جیسا کہ پہلے سے اس کے تین ٹکڑے ہوئے ہوں۔

رند اب پریشان ہوئے ان کے پاس شئے مرید کی لوہے کی کمان کے علاوہ اور کوئی ایسا مضبوط کمان نہ تھی۔ جو اس درویش کی تاب لا سکتی۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ

درویش صاحبِ کرامت ہے۔ شے مرید کی کمان کے بغیر اور کوئی کمان اس کی تاب نہ لاسکے گی شے مرید کی کمان لاکر اسے دیدو! چنانچہ ایک شخص بھاگم بھاگ جاکر مرید کی کمان اُٹھا لایا شاعر کہتا ہے:

آرتش مُریدئے شے ءِ کمان	اب وہ مرید کی کمان لے آئے
چک ءُ شپنکاں دِرکتت	جو کہیں بکریوں کے باڑے میں پڑی ہوئی تھی اور جس پر لیلے اُچھل کود چکے تھے
دُراہ مورچگ و زنگا جتت	جو زنگ آلودہ اور داغدار تھی۔
بند چوروان ریپینتگت	جس کی تانت کو بچوں نے چھیڑا اور خراب کیا تھا۔
جی جی کناں، زیارت کُتی	شے مرید نے اسے پیار سے اُٹھایا
سرچکت وچماں کُتی	پہلے چوما اور پھر آنکھوں پر رکھا۔
ایرجیگ ءِت و جیگش کُتی	(تانت) ڈھیلی تھی اس کا چلہ چڑھا دیا
دھپت تیر نشان ءُ راجت	پھر اس نے سات تیر ہدف پر چلائے
تیراں من تیرءُ ٹِکت کُتہ	ہر تیر دوسرے تیر کے نشان پر لگا۔
رِنداں چمید ءُ کیس کُتہ	اس سے رندوں نے قیاس کرلیا کہ
اے مرد مُریدانت پچّل گُدیں	ہو نہ ہو یہ درویش وہی خوشپوش مرید ہے
ودھیں کمان ءِ واجہ انت	جو اس لوہے کی کمان کا مالک ہے۔
گپت و مرید سوگ کُتہ	تب انہوں نے مرید کو مضبوطی سے پکڑ لیا

شے مرید کے ماں باپ اگرچہ اب تک زندہ تھے لیکن شے مبارک اس کے فراق میں اپنی بینائی کھو چکا تھا۔ اس کی والدہ ضعیف اور چلنے پھرنے سے معذور

تھی۔ شاعر کہتا ہے کہ جس وقت شے مرید نے اپنی کمان سے تیر چلائے تو تیروں کی سنسناہٹ اس کے ماں باپ کے کانوں تک پہنچی اور وہ پکار اُٹھے ؎

اے تخے مُرید ءِ گونڈ لنت	یہ شے مرید کے تیروں کی آواز ہے
وھیں جُگ ءَ درکپتگنت	جو وہ اپنی لچے کی کمان سے چلا رہا ہے

رندوں نے درویش کو شے مرید کے شبہ میں پکڑ تو لیا لیکن اب اسے پہچاننے والا کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا۔ جس نے زمانۂ جوانی میں اسے دیکھا ہو، آخر انہوں نے ایک دایہ کو بُلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ ھانی کے پاس جا کر اس سے شے مرید کو پہچاننے کے نقش و نشان دریافت کرے۔ دایہ بھاگی بھاگی گئی اور ھانی سے جا کر اس نے کہا کہ ؎

بیا کہ شے آسکہ درست زیت	اے ھانی! سُن کہ شے مرید آیا ہُوا ہے مگر پہچانا نہیں جاتا۔
اے چوٹو اش پیچ وارتگنت	اُس کے بل کھائے ہوئے لمبے گیسو
پادءِ کرونگاں کپتگنت	پاؤں کی ایڑیوں تک جا پہنچے ہیں
شیریں بروتش رستگنت	اس کی شیر جیسی مونچھیں بڑھ کر حد سے گذر چکی ہیں۔
برزچہ تیزءَ گوشتگنت	(ذرا یہ تو بتا دو) کہ جب بچپن میں
شما کہ کسانی لیب کتیں	تم دونوں ایک ساتھ کھیلتے رہے
نشک و نشانی چے اتیں	اُس کے جسم پر نقش و نشان کیا تھے؟

شاعر کہتا ہے کہ شے مرید کے آنے کی خوشخبری سُن کر ھانی نے پہلے تو

شاریں سریگ ءَ راسر ءَ	اپنے سرکا ریشمی دوپٹہ
دست ءِ تلائیں سنگوان	اور ہاتھوں کے طلائی کنگن
داتی ھمے مستاگر ءَ	خوش خبری سُنانے والی دایہ کو انعام میں دیئے

اور پھر شے مرید کے جسم پر نقش و نشان بتلاتے ہوئے اُس نے کہا کہ مشہور یہ ہے

کہ تب ایک

ماکہ کسانی لیب کتیں	بچپن میں ہم دونوں ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے تو ایکدفعہ میں نے
من دستے تزانتی در نزتیں	انجانے میں اپنا ہاتھ جھٹک دیا
مُندری مزائیں چیر شتیں	میری بڑی انگوٹھی اُسے لگی
پٹی مئُ بروان ءِ پدانت	جس کے زخم کا نشان اس کی ابرو کی پشت پر ہے۔

جب رندوں نے یہ نشان دیکھا تو واقعی اس درویش کی ابرو کی لپشت پر اس زخم کا نشان موجود تھا۔ جس سے اُنہیں یقین ہوگیا کہ یہ درویش بلاشبہ شے مرید ہی ہے۔ اب وہ شے مرید کو ساتھ لے کر میر چاکر کے پاس گئے اور اس سے درخواست کی کہ

چاکر! تہ مئے گپ ءَ بزیر	اے چاکر! ہمارا کہا مان لو
نین تو ہمے کارءَ بکن	اور اب ایک کام کرو
ھانی ءِ سے مہراں بدے	ھانی کو ثلاثہ طلاق دیدو
ھڈی گوں شے ءِ ھڈاں کپنت	تاکہ اس کی ھڈیاں شے مرید کی ھڈیوں کے ساتھ پڑتی رہیں۔

گوری گوں گور ءُ یک بیت — اور اس کی قبر شے مرید کی قبر کے ساتھ ہو۔

ئے مرید نے جب رندوں کا یہ مطالبہ سُنا تو بہت برہم ہُوا۔ اس نے رندوں پر طنز کرتے ہوئے کہا: ؎

ھانی بئی پکاروں نہ اِنت	رندو! مجھے اب ھانی کی ضرورت نہیں ہے
رو چیکہ پکارُت من ءُ	جب مجھے اُس کی ضرورت تھی
رنداں من ءُ ھانی نہ دات	تو، تم نے مجھے ھانی نہیں دلائی۔
براتاں من ءُ برات نہ کرُت	بھائیوں نے مجھے اپنا بھائی نہیں سمجھا۔
مئ بیرواں گوانکوں رجت	اور اپنی مجلسوں میں مجھے نہیں بلایا۔
	(کہ چاکر کے ساتھ میرا فیصلہ کرتے)

اور اب جب کہ مجھے ھانی کی ضرورت نہیں رہی ہے تم ھانی کو میر چاکر سے طلاق دلا کر مجھے دینا چاہتے ہو۔ یہ ایک ان ہونی بات ہے۔ میں اسے ہرگز قبول نہیں کروں گا پھر اس نے ھانی سے مخاطب ہو کر کہا: ؎

ھانی! مکن زورا وری	اے ھانی! اب تو بھی ضد نہ کر
میر چاکر ءُ نگراں مکن	میر چاکر کو ناراض کرنا اب بے سُود ہے
آتیر کہ من پیشی ءُ جتت	وُہ تیر جو میں پہلے چلایا کرتا تھا
من پہ تئیگاں گار کُتہ	وُہ سب میں تیرے فراق میں کھو چکا ہوں
مردی دِ ردکاری نہیاں	اب میں مرد، اور فرائض کا وظیفہ ادا کرنے
بردوں رواں سولری نیاں	کے قابل نہیں رہا ہوں۔

ھشک ءُ تمیگ ءُ سُتکگان	میرے پاؤں اب رکابوں میں نہیں جم سکتے۔
جان ءُ بسل ءُ پیلوشتگان	تیرے عشق میں، میں جل چکا ہوں۔ ایسا جلا ہوں کہ میرے جسم کی کھال بھی جل چکی ہے
بند بند دتی داگھ داتگاں	اپنے عضو عضو کو میں نے داغ دیا ہے
اَچ سنگتاں کردوں ٹکن	مجھے، اب میرے ساتھیوں سے تو جدا نہ کر
اَچ دیدگاں کوروں مکن	اور میری آنکھوں کا نور نہ چھین
باندا ھدا روچے بخت	انشاءاللہ کل جب دن ہوگا۔ اپنے اونٹوں کے گلے سے
کاراں جرٹے جمازباں	میں ایک کمسن اونٹ لے آؤں گا
جہلا کریا بالا رواں	اور اس پر چڑھ کر نیچے کی طرف یا اوپر کی سمت کی طرف کہیں چلا جاؤں گا

روایت ہے کہ دوسرے دن شے مرید اپنے باپ کے اونٹوں کے گلے میں سے سفید رنگ کا ایک کم سن اونٹ لے آیا۔ رندوں کو الوداع کہہ کر اس پر چڑھا اور پلک جھپکتے ہی نظروں سے غائب ہو گیا۔

بلوچوں کو اب تک یقین ہے کہ شے مُرید زندہ ہے۔ ھانی کے عشق کی آگ میں تپ کر نکلنے کے بعد وُہ لافانی ہو چکا ہے۔ اس کا سفید اونٹ بھی اسی طرح نوجوان ہے اور شے مرید کی باطنی کرامات سے نادیدہ فضاؤں میں اُڑتا پھرتا ہے۔ کئی بلوچ گواہی دیتے ہیں کہ اگرچہ شے مرید عام انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے لیکن صاحبِ کرامات

ہستیاں نیک لوگ، مجاہدین اور عاشقان صادق اُسے دیکھ سکتے ہیں۔ کئی بزرگوں نے اسے سفید اونٹ پر سوار فضاؤں سے نیچے اُترتے اور مساجد میں نمازیں پڑھتے دیکھا ہے۔ الغرض شے مرید کو بلوچوں میں وہی مقام حاصل ہے۔ جو عربوں کی روایات میں خواجہ خضر کا ہے۔ جبھی تو بلوچ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ : ؎

تاں جہان است	جب تک جہان ہے
شے مرید مست	شراب عشق سے مست شے مرید بھی ہے

اکثر بلوچوں کا یہ خیال بھی ہے کہ بلوچستان میں سردار میر چاکر رند کی تباہی و بربادی کا باعث بھی شے مرید کی بد دعائیں ہوئی ہیں۔ چنانچہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن شے مرید نے پورے جوش و جذبے کے ساتھ میر چاکر کو بد دعا دی کہ : ؎

پتح پور و برُز یں کلات	فتح پور کا یہ اونچا قلعہ
بُتّ بات وشتیٔ ئے روات	ویران ہو، اور ویران رہے
چاکر بمانیت، نئیکہ کوٹے	چاکر رہے اور نہ ہی اس کی اونچی فصیل رہے
بوری بمانیت، نئیکہ دوست	اس کے گھوڑے رہیں اور نہ ہی اُس کے دوست رہیں۔
بھینگی ئہ دُکنت من جہ ئے	اس کا گھر ایسے اُجڑے کہ وہاں کُتے بھی نہ بھونکیں

اسی طرح حقانی نے بھی کہتے ہیں کہ ایکدفعہ میر چاکر کو بد دُعا دی اور کہا : ؎

چاکر! تئی میری بُنگرات	اے چاکر! تیرا محل جل جائے
لوگ ئے تئی آسے کپات	تیرے گھر میں آگ لگے

بورءُ تئی دُزّے برات	تیرے گھوڑے کو چور لے جائیں
دست ءِ نشانی گار ببات	تیرا نام و نشان مٹ جائے۔
دل تئی گُناھاں بار ببات	تیرا دل گناھوں سے بار ہو۔

میر چاکر کو شئے مرید اور ھانی کی بد دعائیں لگیں یا نہیں اس سے بحث نہیں بلکہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب تک جہان ہے شئے مرید بلوچوں کی دنیائے شعر و شاعری میں زندہ و پائندہ رہے گا۔ اور میر چاکر ھدفِ ملامت ہر دور اور ہر زمانے میں شئے مرید کی داستانِ عشق اور شاعرانہ سحر انگیزیوں سے بلوچ محظوظ ہوتے رہیں گے۔ نوجوان اس کے اشعار گا گا کر سر دھنتے اور محبوبائیں آنسو بہاتی رہیں گی۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ:۔

ع:۔ **تا جہان است، شئے مُریدؔ مست**

تیسرا باب

۱۔ بیبگر کے رومان

میر چاکر کے بانکے رندوں میں بیبگر بہت مشہور شخص گذرا ہے، بعض لوگ اُسے بیورگ، بعض بی برگ اور بعضے بی بگر بھی کہتے ہیں۔ لیکن بلوچی زبان: مناسبت سے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا صحیح نام بی بگر ہے جو عربی نام ابو بکر یا ابی بکر کا بلوچی تلفظ ہے۔

بیبگر میر چاکر رند کا بھانجا اور بہار خان رند کا بیٹا تھا۔ رند اور لاشار کی تیس ۳۰ سالہ خانہ جنگی میں بیبگر اگرچہ رندوں کی طرف سے میر چاکر کے دوش بدوش لڑتا رہا لیکن اس کے باوجود جب بھی اسے موقعہ ملا رند و لاشار کے درمیان امن و صلح کی فضا قائم کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ یہ بیبگر ہی تھا جس نے گوہر کی اونٹنیوں کے واقعہ پر بحث کے دوران رندوں سے کہا: ـ

پجوش مانہ جنوں ھالم ءَ — ایک جیتنی کی اونٹنیوں کے لئے ہم
پجتنی ءُ اُشتر ءَ — لوگوں اس طرح نہیں ماریں گے

اور جب میر چاکر اور اس کے رند معتبروں نے اس کی بات نہیں مانی اور لشکر لے کر لاشاریوں کے خلاف لڑنے کو نکلے تو یہ بیبگر ہی تھا جس نے آخری بار میر چاکر کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اسے کہا: ـ

چاکر! پر پچ ءُ بے سارے — چاکر! دیوانہ کیوں ہو رہے ہو۔

براساں مں زرد ء گنت دارے
بھائیوں کو سمندر میں کیوں دھکیلتے ہو

سردار! کینگاں کوتاہ کن!
سردار! بُغض و کینہ چھوڑ دو

برزیں، کھنڈگاں چشم چار کن!
پہاڑوں کی اُن اونچی گھاٹیوں کو اچھی طرح دیکھ لو۔

پیش کنزگ ترا گراں چاریت
جہاں صرف نوحانی ایک ہزار مرد میدان جنگ ہیں۔

پد کنزگ پراداں ھیب انت
اور تیغ زن لاشاری دو تواں کے علاوہ ہیں۔
وہ سب ایک ساتھ تمہارے مقابلے میں کھڑے ہیں

دیمار پتن ء نکھان انت
جب تم اُن سے ٹکراؤ گے تب آگے بڑھنا
تمہارے لئے دریائے خون میں تیرنا ہوگا

براسانی کُشگ تاوان انت
اور پیچھے ہٹنا اُن کے لئے عیب کی بات ہوگی
پیشقدمی کرنے میں تمہارا نقصان ہوگا
اور بھائیوں کو مارنے میں بہت بڑا خسارہ

دُنیا گردش و گردان انت
یہ دنیائے فانی جو گردش میں ہے

ترا پا دار نہ بیت لے پانی
تمہارے ساتھ بھی پائیدار نہیں رہیگی
اپنی اس حرکت سے باز آجاؤ

تانکہ زندگیء ارمانی
ورنہ، زندگی بھر کفِ افسوس ملتے رہو گے

کہتے ہیں کہ میر چاکر نے اس دفعہ بھی بیبگر کی بات نہیں مانی، جاڑو، میر ھان اور دوسرے نوجوان رندوں نے اُسے بزدلی کے طعنے دیئے۔ تب بیبگر نے میر چاکر کے گھوڑے کی باگ چھوڑ دی۔ اور لشکر میں سب سے آگے آگے رہا۔ اس لڑائی میں جونلی کی جنگ کے مسم سے

مشہور ہے۔ میرحان رند مارا گیا۔ رندوں کو شکست فاش ہوئی اور میر چاکر کو بادِ چیان سے بھاگ کر ہرات کے بادشاہ کی امداد لینی پڑی۔

بیبگر ضلع جُو اور مدبر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک لا اُبالی عاشق اور نغز گفتار شاعر بھی تھا۔ اس نے اپنے عشق و عاشقی کے کئی واقعات اس خوبصورتی سے نظم کئے ہیں کہ سننے والا پھڑک اٹھتا ہے۔ بلوچوں کی شبینہ محفلوں میں آج بھی اُس کی شاعری کی دھوم ہے۔ بلوچ گویئے آج بھی اُس کی عشقیہ نظمیں سناتے اور محفلوں کو محظوظ کرتے ہیں۔

بیبگر و گرانؔ ناز!

بیبگر کی عشقیہ داستانوں میں گران ناز یا گراناز کے ساتھ اُس کا معاشقہ بہت مشہور ہے اس کے بیان میں جو نظم کہی گئی ہے وہ بھی بہت مقبول ہے اس طویل نظم میں بیبگر تفصیل بیان کرتا ہے کہ کسطرح وہ قندھار پہنچا، گرفتار ہوا اور پھر کسطرح اس کی نظر قندھار کے بادشاہ امیر شجاع الدین زنون کی لڑکی گرانؔ ناز پر پڑی اور پھر کسطرح وہ گرانؔ ناز کو وہاں سے اُٹھا کر ساتھ لے آیا۔ یہ واقعہ غالباً ۱۴۹۵ء میں ہوا۔ کہانی میں لطف بیبگر کی زبان سے آتا ہے جو ایک دل نشین انداز میں اسے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

کندھار باگھے یا مرا گاھے
قندھار ایک باغ ہے
یا ایک ایسی جگہ ہے جہاں مدام میلہ سا لگا رہتا ہے۔

بادشاہانی ھندو	
جلگہی سیل و رتہ	بادشاہوں کا پایہ تخت اور رہنے کی جگہ سے ایکدفعہ میں اس سرسبز اور شاداب زمین کی سیر کو گیا

قندھار میں خدا جانے بیبگر سے
اُسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ اس وانی حرکت سرزد ہوئی کہ بادشاہ نے

سرمنی کپتگ حاکمی کیئزان	کہ صرف اتنا کہتا ہے کہ بد
بادشاھانی تاڑو تیلا نکان	ہد میں پڑا
	ہم و ستم کا شکار ہوا

اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ جس جگہ بیبگر کو قید
سے قریب تھا۔ بیبگر کہتا ہے کہ ایکدن محل کی طرف آیا کا محل وہاں
تو محل کا ایک دریچہ مجھے کھلا نظر آیا اور اس میں: سے ہنے دیکھا

من جنے سیاھار چوٹیں دلیتہ	میں نے کالی ناگن جیسی ایک عورت دیکھی
ھندی من میری چیتی محل انت	جو بادشاہ کے محل کی ساتویں وہ اتنی حسین تھی کہ
چو منیں مرد سے پہ گندگا ئی نسات آ	مجھ جیسا ایک شخص اُسے دیکھ کر ... محل کے دریچہ میں سے
گردن ءُ کشیت چہ چیجویں محل ءُ	اُس نے اپنی لمبی گردن باہر نکالی
گردن ءُ کشیت دمے حرِلاں بیت	اُس کا اپنی لمبی گرد ر باھر نکال ...

میرا دل اُس پہ آگیا

پھری پریزنت چو کمبریں مارئے — اُس کی زلفیں سانپ کیطرح بل کھائے ہوئے تھیں

بیبکر جیسا ایک عاشق مزاج شخص ایک ایسی حسینہ کو دیکھنے کے بعد آرام سے بیٹھنے والا کب تھا شاعر تو وہ تھا ہی اور اس کے ساتھ آواز بھی ایسی پُرسوز و اثر انگیز پائی تھی کہ سُن کر راہ چلتے لوگوں پر بھی سکتہ کی سی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی اس عورت کو جو بعد میں معلوم ہوا کہ شہزادی تھی، دل دے بیٹھنے کے بعد بیبکر کئی دن تک قید خانے میں تڑپتا رہا اب اس نے ہر رات بڑی دلکش آواز میں فارسی زبان میں غزلیں گانا اپنا معمول بنا لیا چنانچہ کہتا ہے: ۔

گوں مُگلیں کو ہی جلستگیں مردان — مغل بادشاہ کے قید خانے میں محبوس افراد کے ساتھ میں بھی

سن دی پرسیتانی جناں شیراں — ہر رات سیستانی (فارسی) زبان میں غزلیں گانے لگا۔

چو تپوڑی بیُں مردمے نادزان — اور بخار میں مبتلا کسی شخص کی طرح تڑپتا اور فریاد کرتا رہا۔

بالآخر اُس کا عشق رنگ لایا اور شہزادی نے جو ہر رات اُس کی درد بھری آواز سنا کرتی تھی ایک دن بادشاہ سے کہا: ۔

بلوچ ھمے بندی ءُ بلوچیں ءُ — اس بلوچ قیدی کو رہا کر دو!

نیم شپ ءُ زہیں زاریاں کشیت — یہ آدھی رات کو درد بھری فریاد کیا کرتا

ہے ۔

مارا پہ داب ءَ غبار دِھان کھلیت — اور ہمیں آرام سے بیٹھے نہیں رہنے دیتی ہے

بیبگر کہتا ہے کہ دوسرے دن بادشاہ نے مجھے قید سے رہا کر دیا لیکن اس کی محبوبہ سے ملنے کا اضطراب ہیں قندھار چھوڑنے والا کب تھا گئی دن اسی فکر میں پریشان در بدر میں قندھار کی گلیوں اور کوچوں میں گھومتا رہا کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ میں اس محبوبہ سے مل سکوں ۔ آخر ایک دن جب میں بادشاہ کے محل کے نیچے سے گذر رہا تھا کہ میری

پاری لٹوز ءَ گرانگ جتہ لال ءَ — اس پیاری محبوبہ نے مجھے آواز دی اور کہا :

بیا بلوچ ، مردی توکل ءَ بالا — اے بلوچ توکل مردانہ سے کام لے

گوں سگار ءُ دیمگیں ڈھال ءَ — اور اپنی تلوار اور طِلا کار ڈھال لے کر اوپر آجا ۔

دن کا وقت اور قلعے کی اونچی فصیل جس پر چاروں سمت پہریدار گشت کرتے تھے ۔ بیبگر کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اس ماہ پیکر کے بلاوے پر اوپر محل میں جاتا ۔ بادل نخواستہ وہاں سے چلا آیا اور جیسا کہ کہتا ہے : ۔

من دی گوں لوھارے رواں نندان — میں بھی ایک لوہار کے پاس جا کر بیٹھ گیا

تے دچار طلیں میخ گڑائینان — اور اس سے دو ہی کی میں چار نوک دار کیلیں بنوائیں ۔

جب رات کا پہلا پہر گذر گیا ۔ تب اپنے سبک رفتار گھوڑے پر چڑھ کر بیبگر محل کی طرف گیا ۔ گھوڑے کو کسی پوشیدہ مقام پر باندھ کر جب وہ محل کے قریب پہنچا تو ،

کہتا ہے ا ــے

نیں کرمن ماڑی پۂ تن ءُ کایاں	جب میں محل کے نیچے آیا
گینگنت جاگیگاں اُٹکنیگا ن	تو اس انمول حسینہ کے محل کے پہرہ داروں نے مجھے پکڑ لیا
تے وچار سُھور ءِ اشرپی کشان	میں نے سونے کی تین چار اشرفیاں نکال کر ان کو دیں
زیرنت زرّان ءُ وچہل جنت چمّاں	انہوں نے اشرفیاں لے کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیں ۔

بیبگر کہتا ہے کہ پہرہ داروں کے چلے جانے کے بعد : ــے

ن آکُنں بیتاں آہ ن سیجان	میں لوہے کی کیلوں کے ذریعے
چر تلاران د پا چنی راحا ن	محل کی دیوار پر چڑھنے لگا ۔
نیں کرمن ماڑی پۂ نیم گونزءِ کایاں	جیسے پہاڑی بکرے چٹانوں پر چڑھتے ہیں
جان منی غیبی ھر پرسے زرتہ	جب میں محل کی دیوار کے آدھے حصے تک آیا
	تو میرے جسم پر (مجلس سماع میں مست) درویشوں کی سی کپکپی طاری ہوئی ۔
ھکلے واناں دل ھیالان ءَ	میں نے اپنے اندیشوں سے بھرے ہوئے دل کو للکارا :۔
گنہ نواچنڈ سے سرمڑایانی	دیکھ اے دِل ! کہیں میرے بلند توشوں والے سر کو چکرا نہ دینا ۔

اے چکر از نے ت

چھنڈگ ءَ بالاد ءَ بڑاینے	تم میری ندامت بالا کو چور چور کردو گے۔

بالآخر بیبگر کہتا ہے کہ دیوار پر چڑھ کر جب میں محل کی ساتویں منزل میں داخل ہوا تو :-

اَچ مَنی پاد درگُشتاں مزاری ہمبنا	میرے پاؤں کی تھرانہ آہٹ سے
ترا جس کنگ زہر میہرپا بند ست ءَ	زنجیریں جیسی زلفوں والی میری محبوبہ اچھل پڑی
کئی اشتنگ گوں بجھلیں لوپ ءَ	بخملیں گدے والی پلنگ کو چھوڑ کر
	دُور جا کھڑی ہوئی۔
دیر لرزیت من یک گدءِ نوک ءَ	اور ایک دوپٹے کے اندر کانپتی رہی
دیر لرزیت ءِ نگدماں دنتوں	کانپتے ہوئے اس نے مجھے دباں سے آواز دی
گبرو! تکدیر ءَ ترا آرتہ	اے گبرو! تجھے تقدیر یہاں کھینچ لائی ہے
ترک تئی گنجیریں سرءَ برّنت	ترک تیرا یہ باغی سر کاٹ کر
من کلات ءِ دروازگ ءَ درنجنت	قلعے کے دروازے پر لٹکا دیں گے۔

بیبگر ترکوں سے ڈرنے والا کب تھا۔ اس لئے کہتا ہے کہ میں نے آہستہ سے اُس حسینہ کو جواب دیا :-

آمزن چیریں رند من ءَ گجنت	اے حسینہ! جب تک وہ بلند حوصلوں والے رند
	جو میرے ذہن میں ہیں
چاکر و میرھان ءِ زبان زونگین	اور جب تک مضبوط اور تنومند گھوڑوں والے
	چاکر اور میرھان سلامت ہیں۔

کے منی سانڈی گردن ءَ گڈیت
من کلات ءِ درواز ءِ در ءَ ٹنگیت
من نہیاں پُژکاں چہ شدیکیناں
کارچاں کشنت و گرونت میش ءَ
ءِ ماگ ءَ میشیءَ دُمبگ ءَ لوڈنت
من ھما بیبگراں کلا ما فی!
تو منی بیلی ءِ سلا ما فی!

کون میری سانڈ جیسی گردن کو کاٹ کر
قلعے کے دروازے پر لٹکا سکتا ہے
میں ان بھوکے چوروں میں سے نہیں ہوں
جو چھُرے نکال کر دنبوں کو گھیر لیتے ہیں
اور ان کی چکتیاں کاٹ کر کچا چبا لیتے ہیں
میں تو بیبگر ہوں!
وہی بیبگر جس کا ذکر اشعار میں ہوتا ہے
اور تم میری وہ محبوبہ ہو،
جس نے مجھے خود سلام بھیجا ہے

اب گراں ناز سمجھ گئی کہ یہ تو وہی بلوچ ہے جسے میں نے خود ادھر آنے کی دعوت دی تھی۔ جب گراں ناز نے اسے پہچان لیا تو آگے اس سے بغلگیر ہوئی۔ بیبگر کہتا ہے کہ آخر کار:

گال کتہ ہنچو ھاکلیں لال ءَ
سوتہ و سرتاجی شکرگال ءَ
بیبگر ھاں وڈیرا مڑا یا نی!
گوں من ءِ شاہ ءَ دوستیں زبانی
گِندنوا مُڈاہ گیرتی آناگاہ ءَ

اُس دانا و مہ پیکر محبوبہ نے
جو خوبصورتی اور شیریں کلامی میں
سب حسیناؤں کی سرتاج تھی
مجھ سے کہا:
اے بلند حوصلہ و باہمت بیبگر!
بادشاہ کو مجھ سے زیادہ محبت ہے
دیکھ! کہیں ایسا نہ ہو کہ اُسے
معلوم ہو جائے۔

	اگر اسے معلوم ہو گیا تو
ماھر دوناں نئیلت زندگءِ ڈراہءَ	ہم دونوں کو زندہ وسلامت نہیں چھوڑے گا
آگہ ترا مردی توکلے ماں انت	تب ، اگر تجھ میں مردانہ توکل ہے تو
من ءَ وتی ڈیہہ ءَ دربرگءَ آں انت	بہتر یہی ہے کہ مجھے یہاں سے نکال کر اپنے وطن لے چل ۔
برؤں ھموداں کہ ملک بلوچی انت	چلو ! وہاں چلیں جو بلوچوں کا وطن ہے
ملک بلوچی وشہر سیبی انت	بلوچوں کا وطن جہاں سیبی کا شہر ہے ۔

بیبگر کہتا ہے کہ مجھے گران ناز کی یہ بات پسند آئی - اسی وقت اُسے ساتھ لے کر میں محل سے نکلا اور : ـــہ

کلوں چہ ماڑی ءَ رءَ تین ءَ بوتکاں	محل کے نیچے سے میں نے اپنے گھوڑے کو کھولا ۔
دوست ءَ من سیاہ ءِ مدءَ بستاں	اپنی محبوبہ کو، مشکی گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھایا
کندھار شہر ءَ چہ میر حَبءَ زرتاں	شہزادی کو قندھار کے شہر سے نکال کر
دیم ھمو ءِ بولان ءَ پدا داتاں	میں نے واپس بولان کا رُخ کیا ۔

راستے میں گران ناز نے بیبگر سے کہا کہ وہاں بلوچستان میں ان کی طاقت کتنی ہے ۔ کیا سر و سامان اور کتنی فوج ہے ۔ آیا، بادشاہ اگر اُن کے تعاقب میں آئے تو اُن میں اتنی طاقت ہے کہ بادشاہ کی فوج کا مقابلہ کر سکیں ؟

بیبگر کہتا ہے کہ میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا : ـــہ

چل ھزار رِندگوں بارگیں بوران	ہم چالیس ہزار تازی گھوڑیوں والے رند ہیں
نی ھزار میر ھانی بہادر ئنت	تیس ہزار بہادر میر ساتی رہیا ۔
دہ ھزار راپچی ئی مئے گوانگ ئے ئنت	دس ہزار خدمت گار قبائلی بھی ہماری آواز پر جمع ہو جاتے ہیں ۔
پنجاہ ھزار گواھرام ءِ لڑیں تیگینت	اور پچاس ہزار میر گواھرام کے تیغزن لاشاری ہیں ۔

گران ناز نے حساب لگا کر کہا :—

عرو بنگا ھاں چہ بادشاہ زور ئنت	تمہارے ان دونوں فوجی ڈیروں سے بادشاہ طاقت در ہے
بادشاہ کئیت گوں ھژدہ لکھاں	بادشاہ تو اٹھارہ لاکھ کی فوج کے ساتھ آئے گا ۔

گران ناز نے پھر ہیبکر سے پوچھا :- اچھا یہ تو بتاؤ کہ میر چاکر اور میر گوھرام میں سے کون تمہارا دوست اور کون تمہارا دشمن ہے ؟ ہیبکر کہتا ہے :—

من جواب دات لڑگا نیگ ءَ	میں نے اُس شبک خرام محبوبہ کو
بانگ ءِ مشک رمیلانیگ ءَ	مہلب اور مشک میں بسی ہوئی اُس بالوں کو جواب دیا کہ
چاکر ئے دوست انت گواھرام ئے دشمن	چاکر ہمارا دوست اور گواھرام ہمارا دشمن ہے

گراں ناز جو ایک زیرک و دانا خاتون تھی کچھ توقف کے بعد بیبگر سے کہنے لگی: ؎

بیا روئں گواھرام ءَ لڑیں تیگ ءَ	آؤ ہم تیغ زن گواھرام کے پاس چلیں
چاکر ءَ ت آرام نہ کنت لوگ ءَ	چاکر خود آرام سے گھر نہیں بیٹھے گا۔

بیبگر نے گراں ناز کی بات مان لی - اگرچہ رند و لاشار قبائل میں شدید کشیدگی اور عداوت تھی - لیکن اس کے باوجود بیبگر کو یقین تھا کہ میر گواھرام لاشار کا بلوچی "میار" میں آکر اُسے ضرور پناہ دے گا - اور اس طرح رند و لاشار کے دونوں قبائل قندھار کے بادشاہ کے خلاف اس کی امداد کو آئیں گے۔ چنانچہ بیبگر درہ بولان سے نکل کر میر گواھرام لاشاری کے پاس گنداواہ پہنچا۔ کہتا ہے کہ وہاں جاکر: ؎

میں نے کہا:

گوئشتگاں گواھرام ھان مرابانی	لے بلند حوصلہ و باہمت گواھرام!
کار نہ کپتت من ءَ گوں تو ءَ وانی	اب تک مجھے آپ سے کوئی کام نہیں پڑا تھا
گوں انت من ءَ آدار بادشاہانی	لیکن آج بادشاہ کا ایک جھگڑا میرے ساتھ ھے۔
اگہ من ءَ دارے گوں تو ءَ زندان	اگر مجھے پناہ دو گے تو میں تمہارے ساتھ ہونگا اگر پناہ نہیں دو گے
گر نہ دارے تہ تی پڑے گندان	تو اپنے لئے کوئی اور پناہ تلاش کروں گا

میر گواھرام لاشاری جو اوّل و آخر ایک باغیرت بلوچ تھا ۔ بیبگر کو پناہ کیسے نہ دیتا ۔ گو کہ وُہ یہ بھی جانتا تھا کہ بیبگر کو پناہ دے کر وُہ ایک بادشاہ سے لڑائی کا خطرہ مول لے رہا ھے ۔ اور اس طرح اپنے قبیلے کو تباھی و بربادی کی طرف لے جا رہا ھے ۔ لیکن بحیثیت ایک نجیب بلوچ کے اُسے وقت کی اس دعوتِ مبارزت کو قبول کرنا ھی تھا ۔ بیبگر کہتا ھے کہ یوں ہی میں نے بات کہہ دی کہ : ۔

تر ھڈ کتہ گواھرام دلڑیں تیگ ءَ	تیغ زن گواھرام اپنی جگہ سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا ۔
	اور مجھ سے کہنے لگا :
بیا نہ بیا آھتے میر بلوچا فی	خوش آمدید اے بلوچوں کے میر !
گوں دتی دوست ءَ پہ چیر و آمانی	بیشک اپنے دوست کے ساتھ یہاں رہو
ھردم ءَ سیری شادھاں باتے	ہر آن دولھا اور دولہن کیطرح خوش و شادمان رہو !
پہ بلوچگیں چتر ءِ ننگ ءَ	یہاں تمہیں امن چین ملے گا ۔
	(میں وعدہ کرتا ہوں کہ)
	اپنے بلوچی فرض کی لاج رکھنے کیلئے
بادشاہ ءَ گوں من دیاں جنگ ءَ	تمہاری خاطر میں بادشاہ سے بھی لڑوں گا

اُسی دم میر گواھرام نے ایک مکان خالی کروا کر بیبگر اور اس کی محبوبہ کو رہنے کے لئے دیا ۔ ان کے کھانے پینے کا شاھانہ انتظام کیا ۔ لیکن جب کھانا آتا تو بیبگر اسے ہاتھ نہیں لگاتا تھا ۔ آخر گراں ناز نے ایکدن اس سے پوچھا کہ وہ کھانا کیوں

نہیں کھاتا۔ بیبگر نے جواب دیا : ؎

نہ وَراں میرءِ گُنگھے نان ءَ	میر گواھرام کی روٹی سے میں ایک لقمہ بھی نہیں کھاؤں گا
من نمکوار بیاں پہ ھمے تران ءَ	کیونکہ اس کا کھانا کھا کر میں اس کا نمکخوار بن جاؤں گا۔
بلکیں من رَوچے بہ کناں شورمے	ممکن ہے کسی دن میرے اور اس کے درمیان لڑائی ہو،
بانگہ ءَ جائے دشمنی زورے	دشمنی اور زور آزمائی تک نوبت آئے آج جو میں اُس کا نمک کھالوں
نیں وراں واداءِ وادحراماں	تو کل نمک حرام کہلاؤں گا۔
وادحرام بنت دکور کنت چماں	نمک حرام ہو کر انسان کو اندھا کردیتا ہے۔

اس زمانے میں بلوچستان میں تجارت و دکانداری کرنے والے زیادہ تر میمن ہوا کرتے تھے، بیبگر نے ان میں سے ایک میمن کو بلا بھیجا اور اس سے کہا کہ آئندہ وہ اُن کے لئے کھانا پکا کر لایا کرے۔ اس دوران میں میر گواھرام نے آدمی بھیج کر میر چاکر کو بھی اطلاع کردی۔

بیاکہ بیبگرءَ لبتہ یک بارے	اے چاکر! یہاں آکر دیکھ کہ بیبگر نے ایک ایسا بوجھ اپنے سر پہ اُٹھایا ہے۔
چیری شانگے نہ شلیوی ھارے	جو کسی ندی نالے کے سیلاب کا نہیں بلکہ ایک طوفان کا پیش خیمہ ھے

نکیہ لیبے نہ چوردی کارے — یہ کوئی کھیل نہیں ہے۔
اور نہ ہی کوئی بچگانہ حرکت ہے
بادشاھانی گوں انت آوارے — وُہ تو بادشاہ کا ایک بھگوڑا ساتھ
لے آیا ہے۔

اس عرصہ میں قندھار کا بادشاہ امیر شجاع الدین ذلنوں بھی ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ بیبگر کے تعاقب میں بولان سے گذر کر ڈھاڈر کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ میر چاکر رند اور میر گواھرام لاشاری اپنا بلوچی لشکر لے کر اس کے مقابلے کو نکلے۔ لڑائی کی تدبیریں سوچی جانے لگیں۔ مناسب معلوم ہوا کہ ایک ھوشیار جاسوس جاکر بادشاہ کی فوج کی صحیح تعداد اور اس کے ارادوں کے متعلق معلومات حاصل کر آئے۔ بیبگر نے اپنے کو خود اس کام کے لئے پیش کیا۔

دراصل بیبگر کو اب اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ اور وُہ بہت نادم تھا کہ اس کی ایک غلط حرکت سے کل میدان جنگ میں سینکڑوں انسانوں کا خون بہے گا۔ سینکڑوں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں گے۔ سرسبز کھیتیاں گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے روندی جائیں گی۔ بستیاں اُجڑ جائیں گی۔ اور اس تمام تباھی و بربادی کا ذمہ دار وُہ ہو گا۔ اس حقیقت کو پا جانے کے بعد اُس نے یہ طے کر لیا تھا۔ کہ چاہے کچھ بھی ہو۔ وُہ ان دونوں لشکروں کو آپس میں ٹکرانے نہیں دے گا۔ اس لئے جب جاسوس بھیجنے کی بات آئی تو اُسے یہ موقع ملا کہ اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا اقدام کرے۔ اور اُس نے خود اپنا نام پیش کر دیا۔

الغرض، میر چاکر اور میر گواھرام کی اجازت سے بیبگر بھیس بدل کر

خفیہ راستے سے بادشاہ کے لشکر کی طرف روانہ ہوا۔ اس واقعہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے ۔

رپتگاں ھیلاءِ ھدائی ءَ	خدا پر بھروسہ کرکے
گوں وتی ملءِ بادشاھی ءَ	اور اپنے گھوڑے پر چڑھ کر
	میں بادشاہ کے ڈیرے کی طرف چل پڑا
آتکگ وارُو ءِ سرگروں گپتگ	ڈیرے کے اگلے سرے پہ پہنچ کر
مل من اُرد ءِ پلو ءَ بستگ	میں نے اپنے گھوڑے کو ایک طرف باندھا
رپتگاں وت گوں جوھری تیگ ءَ	اور اپنی جوھردار تلوار کے ساتھ آگے بڑھا
آتکگ زنبو ءِ کنار گپتگ	جب میں بادشاہ کے خیمے کے پاس پہنچا
دیستگاں جاگوگ ءِ بی ترکیناں ءَ	تو میں نے اس ترک بادشاہ کے پہرہ دار
	کو دیکھا ۔
من وتی میان ءِ جوھری ھندی	اپنے میان کی جوھردار ھندی تلوار سے
چون ءَ ، پہ نے جیڈر ءِ جگل داناں	میں نے اس طرح اچانک اس پر وار کیا
	جیسے بادلوں میں بجلی کوندتی ہو۔
گوئتہ چو گرندوک ءِ سینگ ءَ	ظاہر ہوا کہ تلوار کا وار پڑنے
	سے قبل ہی
سا برتہ شاہ ءِ من راہ ءَ چوری ءَ	اللہ میاں نے اس کی روح قبض کرلی

پہرہ دار کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد خیمے کی قنات کاٹ کر بیبگر خیمے کے اندر داخل ہوا۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ ترکوں کا بادشاہ پلنگ پر پڑا بے خبر سو رہا ہے۔ بیبگر نے آگے بڑھ کر اُسے ہاتھ سے پکڑ کر جگایا ۔ بادشاہ کی جب

آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ایک اجنبی جوان ننگی تلوار ہاتھ میں لئے اُس کے سرہانے کھڑا ہے بیبگر کہتا ہے کہ بادشاہ پہلے تو بہت گھبرایا لیکن تھوڑی دیر بعد اپنے اوسان مجتمع کر کے اس نے مجھ سے پوچھا:-

تو کُجام ھوت ءُ بنگلیں ورنا	اے خوبصورت نوجوان!
	تم کون سے بہادروں میں سے
تو کجام گیاوان ءِ مزارانے	اور کس بیابان کے شیروں میں سے ہو

بیبگر کہتا ہے کہ میں نے بادشاہ کو تسلی دیتے ہوئے بہت نرمی اور شائستگی سے کہا:-

من ھما بیبگراں کلامانی	اے بادشاہ میں بیبگر ہوں وہی بیبگر جس کا ذکر شاعروں کے اشعار میں ملتا ہے۔
من گو رُءُ کارے بیتہ شیتانی	مجھ سے ایک شیطانی حرکت سرزد ہوئی ہے۔
بشکگی میرات انت بادشاھانی	خطا کاروں کو معافی دینا بادشاہوں کا کام ہے۔
اگر نہ بشکے دی کار تئی دستیں	اگر آپ مجھے معاف نہ کریں تو بھی آپ کو اختیار ہے۔ جو سزا چاہیں مجھے دیں۔
آ انت تئی تیگ ءُ ایش انت منی گردن	وہ رہی آپ کی تلوار اور یہ رہی میری گردن

بیبگر کی ایسی دلیری، جوانمردی اور راست بازی دیکھ کر بادشاہ دنگ رہ گیا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بادشاہ نے بیبگر کو عزت کے ساتھ اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور پھر اُس نے اپنے فوجی افسروں۔ وزیروں اور مصاحبوں کو بلا کر اُن سے کہا کہ آج رات میری زندگی اس نوجوان بلوچ کے قبضے میں تھی۔ وہ اگر چاہتا تو اپنی تلوار کے ایک ہی وار سے میرا سر تن سے جُدا کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور میری زندگی مجھے واپس بخش دی۔ نہ صرف یہ کہ اُس نے میری جان بخش دی ہے۔ بلکہ نہایت مردانگی سے اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔ اور میرے سامنے سر جھکا دیا ہے۔ میں اس بہادر اور راست باز بلوچ نوجوان کو نہ صرف معاف کرتا ہوں بلکہ اُسے اپنی دامادی میں بھی قبول کرنے پر اپنی خوشنودی اور فخر کا اظہار کرتا ہوں۔ بیبگر کہتا ہے کہ تب بادشاہ نے :— ے

بشکنتہ تازیئے کُلم گوشیں	مجھے ایک تیز رفتار قلم گوش گھوڑا انعام میں دینے کے علاوہ
جان منی پٹّاں سھور کنائینتہ	سرخ ریشم کے پٹے دار ملبوسات سے بھی میرا تن ڈھانپ دیا۔
پشتنت تمبو ء تناب سکّیں	اور پھر بادشاہ نے اسی وقت اپنے لشکر کو اپنے خیموں کی مضبوط طنابیں اکھاڑنے کا حکم دیا۔
دیم پہا بولان ءُ پدا داتنت	اور بولان کے راستے واپس چلا گیا

بیبگر کہتا ہے کہ بادشاہ کو الوداع کہنے کے بعد میں واپس سبی آیا

اور میر چاکر و میر گواہرام کو تمام حال کہہ سنایا ۔ یہ بھی بہت خوش ہوئے اور میری تعریفیں کرنے لگے ۔ اس طرح :ـــ

نے من ءُ مردی توڑھے بیتگ	نہ تو میری مردانگی پر حرف آیا
نے من رنداں پہ پیسے داتاں	اور نہ ہی میں نے لاشاریوں کو جنگ میں مروایا
نے من لاشاریں پہ جنگ کشاینتہ	اب میں اپنی محبوبہ کے ساتھ خوش و خرم بیٹھا
دش دل ءَ ننداں نیں گوں تئی لذتواں	اس کی گردن کے سنہری ہار سے
لئیب انت منی دوست ءِ گوں ءَ نگویں ھاریں	کھیلا کرتا ہوں ۔

بیبکر و سدو !

خدا جانے اس میں کہاں تک صداقت ہے مگر چونکہ شاعر کہتا ہے اس لئے ہم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ میر چاکر کے زمانے میں اُن دنوں جبکہ بیبکر صرف ایک البیلا نوجوان تھا لاشاریوں میں ایک بیاہتا عورت بڑی خوبصورت ۔ دلربا اور ناز و اداؤں والی مشہور تھی اس کے خاوند کا نام پیر علی تھا ۔ بیبکر نے اس لاشاری حسینہ کو کہیں دیکھ لیا اور دیکھتے ہی اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوا ۔ ایک سلیس اور روان نظم میں سادگی کے ساتھ اپنے عشق کی داستان بیان کرتے ہوئے بیبکر کہتا ھے :ـــ

پیلہ ئیں ششماہی مشاں کھتاں	پورے چھ ماہ تک خط لکھ کر
داتاں پہ مہلنج ءَ برد آراں	قاصدوں کے ذریعے میں اُس ماہ جبیں کو بھجواتا رہا ۔
نے ءُ دوست منّیت کردش کناں زرد ءَ	نہ وہ محبوبہ میری بات مانتی ھے کہ میرا دل خوش ہو

نیکہ کنت ناھے من ھانزانی بہلاں	اور نہ صاف انکار کرتی ہے کہ میں اس کا خیال چھوڑ دوں ۔
مارا من نیام پُر گمبلاں داشتہ	مجھے اس نے درمیان میں آسمان سے نیچے اور
پُرزی نودان و بارگیں شیئکان	مدھم کہر اور بادلوں سے اوپر لٹکا رکھا ہے ۔

چھ مہینے بعد آخر ایکدن بیبگر کی مُراد بر آئی اور اس محبوبہ نے اسے قاصد بھیج کر دعوت وصل دی چنانچہ بیبگر کہتا ہے : ؎

من شکارانی پلوء کایاں	میں شکار سے لوٹ رہا تھا کہ
آنگ وستاگ گپت من ءَ ڈومبء	ڈوم نے آکر مجھے خوشخبری سُنائی
ھیَ دھیا کہ منتگ دوست ءَ	ھیا ھیا کہ میری محبوبہ مان گئی ہے
بیگہی موکل انت تو ءَ و تیگ ءَ	اس نے تجھے پیغام کیا ہے کہ آج رات تمہاری دعوت ہے
شپ تیَ انت وردچ ہمبایانی	رات تمہاری ہے اور دن تمہارے دشمنوں کا

بیبگر یہ بھی جانتا تھا کہ اس طرح رات کے وقت سدو کے پاس جانا کوئی کھیل نہیں اس میں نوجوان کی بازی لگے گی ۔ اس لئے اس نے مناسب سمجھا کہ میر چاکر کو بھی اطلاع دیدے کہ اگر کہیں وہ کسی مصیبت میں پڑ جائے تو میر چاکر اس کی مدد کو پہنچ سکے ۔ اس بات سے بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ بیبگر نے میر چاکر کے کہنے پر ہی سدو کے ساتھ عشق لڑانے کا سلسلہ شروع کیا تھا ، غالباً اس سے اُس کا مُدعا میر گواھرام لاشاری سے ایک ایسی ہی ناشائستہ حرکت کا بدلہ لینا تھا ۔ بہرحال بیبگر کہتا ہے کہ سدو کا پیغام پاکر : ؎

لانگوے شنتاں ھما دھدءَ	میں نے اسی وقت ایک غلام بھیج کر
چاکر مالمیدار کناں ئیتاں	میر چاکر کو اطلاع دے دی۔
	اور اُسے کہلا بھیجا کہ:
بیاتئی کنول ءِ موکگ ءِ ریچ آتہ	آجا! اے چاکر تجھ سے اپنا وعدہ نبھانے
	کا وقت آگیا!
اگہ نیایے نہ شاہ منی وھارانت	اگر نہیں آؤگے تو بھی مجھے کوئی اندیشہ
	نہیں ہوگا کیونکہ
	خدا میرا مددگار ہے۔
مارتی سرءِ کھنڈگ ءِ داتہ	میں نے اپنے سر کو خطرے میں ڈال دیا ہے
	مجھے اب خوشبوؤں میں لپی ہوئی اور حسین
داھوں گوں بوانی سدّو لال ءَ	سدّو کی فکر لگی ہوئی ہے۔
	اے چاکر اٹھ کر
شیہری بیبگر ءِ لڑءِ خبر نیست	اسد تلوار کے دھنی بیبگر کی خبر نہیں
	شاید وہ تمہارے آباد اور خوشبوؤں سے معطر
دیروی ھنبو مئیں دلیل لوان	ڈیرے میں آکر
	کسی کے عشق میں برملا اشعار
گیت پہ رھشیں نہ جنت شیہران	پھر کبھی نہ گا سکے۔

جب رات کا پہلا پہر ڈھل گیا تو بیبگر اپنے وعدے کے مطابق سدّو کے ہاں پہنچا۔ تمام رات اس کے ساتھ دادِ عیش دیتا رہا۔ اور پھر اسے

چارمی پاس ءَ آستگ بام ءَ	رات کے چوتھے پہر جب سپیدۂ سحر نمودار ہوا

درکپیت تہب ءُ روشنیں استار
کئیت چو تیر دوُری جلشکان ءَ

اور صبح کا تیز چمکتا ہوا تارا طلوع ہوکر
تیز کی رفتار سے اوپر چڑھنے لگا۔

آھستگ ءُ چکیت دست برباھیگان
دولاں گوں ھوشیشی کلاہیان
دست چو گنگوئی بلوٹ بلیت۔

اُس (سدو) نے آہستہ سے
اپنا کنگنوں والا اور ہاتھی دانت کیطرح سفید
ہاتھ میرے سر کے نیچے سے کھینچ لیا۔
اور پھر اس نے گونگوں کی طرح ہاتھ کے
اشارے سے مجھے بتایا کہ اے

پادا اُو بیبگر اک آتگ بامی
من و تو ھردو مردموں نامی

صبح ہوگئی ہے اے بیبگر!
کہ ہم اور تم دونوں مشہور افراد ہیں۔
پہچانے جائیں گے۔

بانگھو ءُ لاشاری تراگندنت
تیں و مبیٹانی چو ٹِت بُرنت

دن کو اگر لاشاریوں نے تمہیں دیکھ لیا
تو تمہارے اس خوشبوؤں سے معطر سر کو
کاٹ لیں گے۔

مگر بیبگر اس سے صرف رات کی تاریکی میں لطف اندوز ہونے نہیں آیا تھا بلکہ وُہ تو اپنے اس فعل کی تشہیر بھی چاہتا تھا۔ تاکہ اس کا وُہ مقصد بھی حاصل ہو جائے جس کے لئے اس نے اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالا تھا۔ اس لئے اب وُہ مُنہ اندھیرے میں چھپ کر جانے والا کب تھا چنانچہ اس نے سدّو سے صاف صاف کہہ دیا کہ: ؎

اے تیُ ھاریں پت ءُ ھیل نُنت
دوست ءُ کلیت وگد ٹکنت لوگ ءَ

یہ تو تیرے بزرگ باپ کی عادت ہے کہ
محبوبہ کو گھر میں چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے
میں تو یہاں سے

من نہ کنزاں چہ موزگی پینزءُ	اپنی ایڑی کو بھی پیچھے نہیں ہٹاؤں گا لڑکوں کی طرح
چوردی پدکنزگ من ءَ عیب انت	دوست کو چھوڑ کر بھاگ جانا میرے لئے عیب کی بات ہے۔

الغرض بیبگر وہاں ستدو کے پاس ہی ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ سورج نکل آیا۔ اور دن کی روشنی پھیل گئی۔ بیبگر کہتا ہے کہ اب میں اٹھا اور ا سے

جہدوماں گانیزی و لے داتاں	میں نے اپنے لمبے گیسوؤں کو اپنے سر کے گرد مضبوط لپیٹ لیا
زمدظمن پیشدار ءِ بنُ ءَ داتان	دروازے کے سامنے والے ستون کے نیچے میں نے اپنے گھٹنے ٹیک دیئے
تیر منی موزتیں جابگ ءَ چار ئنت	میرے کالے رنگ کے ترکش میں چار تیر ہیں
چار ئنت کہ چیترپیں لیٹرو ءِ بار ئنت	چار، جو ایک نوجوان اونٹ کے بار جتنے تیروں کے برابر ہیں۔
دوازده[۱۲] بنت۔ دہلی ءِ ترک دل ھیکم بنت	اگر میرے پاس بارہ[۱۲] تیر ہوتے
بئیت ھامرد کہ و ھدے آئمگ	تو دہلی کا ترک بادشاہ بھی مجھ تک نہ پہنچ سکتا اور مایوس ہو کر واپس چلا جاتا۔
	میں نے کہا وہ اب میرے پاس وہ
پیالہے پُربیتہ حابانی	شخص آئے جس کی موت آئی ہو۔ اور وہ شخص میرے پاس آنے کی خواہش کرے
گڈامنی ھنداءِ اُنکن ءَ بئیتن	جس کی زندگی کا پیالہ لبریز ہو چکا ہو۔

شاعر کہتا ہے کہ سدو کے خاوند بیبر دلی کو جب معلوم ہوا کہ بیبگر اس کی بیوی کے خیمے میں ہے۔ تو وہ تلوار لے کر بیبگر کو مار ڈالنے کے ارادے سے نکلا اُسے دیکھ کر بیبگر نے کہا : ـــہ

من تئی بجود ءُ زھر کن ءُ گندان	میں تمہارے خاوند بیبر دلی کو سڑے
پیبر دلی انت گوں تراشتگیں لوڈ ءُ	ہوئے سر کے ساتھ دیکھ رہا ہوں
	وہ غصے سے بھرا ہوا ہے
پنچ کیسائی پھاڈے من دست ءُ	پانچ ٹکے کی ایک تلوار اس کے ہاتھ میں ہے
دنت زڑیلے وجیا بہے کلیت	اور بکواس کے تیر چلاتا ہے۔
گگالی من لے آہیں دپ ءُ ایش گشت	وہ بکواس یہ کہہ رہا ہے کہ
من کشاں بیبگر ءُ ملوکیں ءُ	میں دانشمند بیبگر کو
میر بہار کھان ءِ تنگویں بچ ءُ	میر بہار خان کے زرجبین بیٹے کو
	مار ڈالوں گا۔

بہر حال شاعر کہتا ہے کہ بیبر دلی کو بیبگر کے سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوئی اتنے میں ـــہ

دھنڑے اُچ میلائی دپ ءُ رستگ	درہ مولہ کے دہانے سے ایک گرد اٹھی
سرکتہ میریں چاکر ءِ پوجیان	میر چاکر کا لشکر نمودار ہوا۔
اُچ سر ءِ میرھان ء مُرید کا تکنت	میرھان اور مُرید لشکر کے آگے آگے تھے

جب میر چاکر وہاں پہنچا تو صلح جو افراد درمیان میں آ گئے۔ اور بیبر دلی کو اس بات پر آمادہ کر لیا گیا کہ وہ "میار" لے کر سدو کو طلاق دیدے۔ بیبگر سدو کو اپنے ساتھ

ر کر واپس ہوا ۔

بیبکر و ملّیٰ !

شاعر کہتا ہے کہ ایکدن میرچاکر نے بیبکر سے کہا: ۔

من گو زرے زیبائیں چجے دلبستہ	میں نے ایک جگہ ایک بڑی حسین عورت دیکھی ہے
تر سر دیبے هیب وکمان میانے	جس کا چہرہ چودھویں کے چاند کیطرح گول
دیی گر دانت چو چار دھی ماہ ءَ	اور کمر کمان کی طرح پتلی ہے ۔
هیب نیستیں ءِ من چینز ودنتاں ءَ	اس کے (خدوخال) میں کوئی عیب نہیں اس کی ناک اور اس کے دانت بے عیب ہیں
کدہ ئیں چمّی جو بامی استار ءَ	اس کی کٹورا سی آنکھیں ستارۂ صبح کی طرح روشن
گردن چو گنڈی لستہ ئیں مار ءَ	اور اسکی گردن بے کینچلی کے سانپ کیطرح ہے
زیگی تا پادل کیچی گلکار انت	اس کی قمیص کا گلا، جیب تک کیچ کی سوزن کاری سے منقش ہے
شیگیں پنیزانی پلو سوار انت	اس کی ستواں ناک پر نتھ چڑھی ہوئی ہے

شاعر کہتا ہے کہ بیبکر جو اس قسم کی رومانوی مہمات سر کرنے کا شیدائی تھا میر چاکر کا اشارہ پاکر قسمت آزمانے کو جھٹ تیار ہو گیا ۔ بیبکر خود کہتا ہے : ۔

من دتی ناکوءِ جبر گپتیں
نیلگءَ بے راھیں سرءَ شانتیں

میں نے اپنے بچے کی بات مان لی
اور اپنی نیلی گھوڑی کو ایک ان دیکھے
راستے پر ڈال دیا۔

سر منی کاشیں کڈّلے کپتیں
کڈّلءَ پیریں بلگے بیتیں

میں خس کی ایک جھگی میں پہنچا۔
اس جھگی میں ایک بڑھیا رہتی تھی

بڑھیا کو کچھ دے دلا کر راضی کر لینے کے بعد بیبگر نے اُس سے پوچھا کہ اس گاؤں میں حسینہ کس گھر میں رہتی ھے۔ جس کی تعریف میر چاکر نے کی ھے اور جس سے ملنے کے لئے میں یہاں آیا ھوں۔ بڑھیا نے جواب دیا کہ اگر یہ بات ھے تو تم ابھی جا کر میمن کی دکان پہ ویکر بیٹھ جاؤ۔ وہ حسینہ خود وہاں چلی آئے گی۔ بیبگر نے بڑھیا کے گھر کے سامنے سے اپنی گھوڑی کھول کر میمن کی دکان کے سامنے لے جا کر باندھ دی۔ اور خود سائے میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

بیبگر کہتا ھے کہ:—

ھےَ نہ بیتہ کہ ساھتے گوستہ
بانک ءِ پادینکاں ڈیڑنگ زرتہ
پہ سرءَ سیاھیں مولدے بیتہ
میمن ءِ دکان ءِ تہ ءَ گوستہ
تنک دھمزان ءَ گوں بانک ءَ نشتہ

(مجھے وہاں بیٹھے) زیادہ دیر نہیں ہوئی کہ
بانو کے پازیبوں کی جھنکار سنائی دی
اُس کے آگے آگے ایک کالی کلوٹی کنیز تھی
وہ میمن کی دکان میں جا داخل ہوئی۔
اور وہاں کنیز، بانو کے ساتھ گھٹنے سے
گھٹنا ملا کر بیٹھ گئی۔

بیبگر بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر دکان میں گیا وھاں اُس نے دیکھا کہ ۴۱

دتی پہ شاریں پدول ءَ بشپیتہ

بانو نے اپنی ریشمی قمیص میں ہاتھ ڈال کر

کشتی دہ زرءِ مسک بہا زُرتی
من دتی گیوارءِ دپ ءَ مُشتی
جیگ ءِ پدّولی ھر دو پشکپتنت

چاندی کے دس سکے دیئے
اور اُن کا مشک خریدا ۔
مشک خرید کر اس نے اپنی مانگ پر ملا
لیکن اس کی قمیص کا گلا اور جیب (مشک
سے بنا) رہ گئے

بیبگر کہتا ہے کہ جب وُہ حسینہ مشک خرید چکی تو اُسے

سرءِ بی راھیں گنوک بیتہ
دست من رندی کیسگ ءَ شپتان
کشتاں دہ ٹکہ مپک بہا گپتان
بسکاں من زرءِ کدہ ءَ میتاں
پیترے تعام ولذت ءَ گپتاں
من دتی کنڈی ءِ پُ بروت مشتاں
الپرو پاگ ءَ کندھاریاں
کدہ ءِ بُن، من مولد ءَ داتاں

میرا بھٹکا ہُوا سر دیوانہ ہو گیا ۔
میں نے اپنے رندی کیسے میں ہاتھ ڈالا
اور دس اشرفیاں نکال کر مشک خریدا
پھر انہیں چاندی کے کٹورے میں بھگو دیا
ایک دفعہ مشک کی خوشبو سونگھی
پھر اپنی تابدار مونچھوں اور
اپنے قندھاری طرہ و دستار پر اُسے ملا
کٹورے میں جو تلچھٹ بچی
وُہ میں نے کنیز کو دے دی

بیبگر کے یہ انداز دیکھ کر وُہ حسینہ بلوچ جھٹک کر اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ بیبگر کی نگاہیں اس وقت تک اس کا تعاقب کرتی رہیں ۔ جب تک وُہ اپنے گھر نہ پہنچی ۔ اب بیبگر نے اپنی گھوڑی کو دکان کے سامنے سے کھول کر اس حسینہ کے گھر کے سامنے لے جا کر باندھ دیا ۔ جب رات ہوئی تو بیبگر کہتا ہے :—

پُچ کناں ڈیہی شاعراں بیاراں
میں نے گاؤں کے غزل گو شاعروں کو جمع کیا۔

من جناں شیراں پہ دل ءِ سوک ءَ
پہ مزن پادینکیں جن ءِ زوک ءَ
شعر و شاعری کی محفل جمائی اور میں بھی بڑے بڑے کولہے والی حسینہ کی محبت میں سرشار ہوکر اپنے جذبات کا اظہار اشعار میں کرتا رہا

اس طرح سات دن اور سات راتیں بیبگر نے وہاں گانے بجانے میں اسی حسینہ کے گھر کے سامنے گذار دیئے۔ لیکن اس حسینہ کی طرف سے بظاہر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جس سے بیبگر یہ سمجھتا کہ وہ حسینۂ دلربا اس کی طرف مائل ہو چکی ہے۔ آخر عاجز آ کر بیبگر نے ڈوم گویوں اور شاعروں سے کہا دوستو! کوئی ایسی تجویز کرو جس سے یہ بے نیاز اور مغرور حسینہ میری طرف مائل ہو۔ گویّوں سے تو خیر کوئی تجویز نہیں بنی البتہ بیبگر نے خود ایک تجویز سوچ لی اور پھر اس نے اُن گویوں سے کہا اسے

زیرھت منی لانگ بند ءَ ھلیلیں ءَ
یہ میری سُرخ ریشمی چادر لے لو

بندت منی آسکی ھردوئیں چماں
اور اس سے میری ہرن جیسی خوبصورت آنکھوں پر پٹی باندھ دو

دردی مان انت دنیا دھیں ارمان
(اور گاؤں میں یہ مشہور کر دو کہ) میری آنکھوں میں شدید درد اور جلن ہو رہی ہے۔ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ میرا علاج کرنے والا کوئی نہیں

نے منی ماتءَ گہار کجنت دَرمان	نہ میری ماں یہاں ہے نہ میری بہن کہ میری آنکھوں کا علاج کرتیں

بیبگر کے ہمنواگوئیوں نے ایسا ہی کیا اور گاؤں میں یہ بات پھیلا دی کہ اجنبی مسافر کی آنکھوں میں شدید درد ہو رہا ہے۔ لیکن اُس غریب کا علاج کرنے والا کوئی نہیں۔ بیبگر کہتا ہے کہ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ، ــــ

رسِتہ مولِدگوں دارو و درمان	وہی کنیز دواؤں کے ساتھ پہنچ گئی میں نے کہا: اے کنیز!
مولِد امن ءُ گپتءَ ھور دیئیں چمّاں	میری آنکھیں بیشک دُکھ رہی ہیں
دردی ماں انت ءُ زیاد ھیں آرمان	ان میں شدید درد اور جلن بھی ہے
پہ مولِدی دستاں نہ بنت درمان	لیکن ان کا علاج کنیز کے کھردرے ہاتھوں سے ممکن نہیں
لوٹنت تئی بانُک ءِ آجوئیں دستاں	علاج کے لئے تیری بانو کے نرم و گداز ہاتھوں کی ضرورت ہے

کنیز اُٹھ کر واپس چلی گئی لیکن بیبگر کہتا ہے کہ تھوڑی دیر بعد، ــــ

بانُک گوں صاہاں ھمدا رستہ	وُہ حسین بانو دوائیوں کے ساتھ پہنچ گئی
من منی راستیں نیمگ ءَ نشتہ	اور آکر میری دائیں طرف کو بیٹھ گئی
شُدّ ءِ ھوشاریں لیغی لیٹیفتہ	پھر اس نے میری ریشمی چادر کا کنارہ ہٹا کر میری آنکھوں کو دیکھا۔
پاکیں گنت ءُ چم چو کدہ عمساپ ءِ نت	میری آنکھیں بلور کی پیالی کیطرح صاف تھیں

دست من کنجی گردنائی رشپتاں — میں نے اس کی ہنس جیسی گردن میں اپنے ہاتھ حمائل کر دیئے۔

واسے چہ ھیبرواریں دپائی گپتان — اور میں نے اس کے الائچی کھا نے والے دہن کا بوسہ لے لیا۔

در مُنزتہ دست ءُ بانک پاداَھتہ — میرے ہاتھ جھٹک کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی کہ

بخت تئی کپتہ یا تا لیہت گشتہ — اے جوان! تیرا بخت روٹھ گیا ہے تیری تقدیر اُلٹ گئی ہے۔

کدّھت کئیل بیتہ یا حیاتانی — یا پھر تیری زندگی کا پیالہ لبریز ہو چکا ہے

وہ بانو تو روٹھ کر واپس چلی گئی۔ لیکن بیبگر کہتا ہے کہ میں وہاں بیٹھ کر سورج غروب ہونے کا انتظار کرنے لگا اور جب: ؎

روچ کہ چہ زردیں دیگرءُ کزتیں — سورج عصر کے زردی مائل اُفق سے نیچے لڑھک گیا۔

موچڑو سبزی تیگ دُتی زرتیں — تو میں نے اپنے جوتے پہن لئے اپنی مصری تلوار کمر سے باندھ کر

بیڑے پہ بادگیرءُ دپءُ حانیں — اس حسین بانو کے بالا خانے کے دروازے کی طرف لپکا

بہر حال، بیبگر کی مراد بر آئی۔ تمام رات اس مہوش کے ساتھ دادِ عیش دینے کے بعد بیبگر کہتا ہے کہ: ؎

چارمی پاس ئے د ملائی بانگ ئے — رات کے چوتھے پہر میں
ملاّ کی اذان کے وقت

گل من ئے تو ھینتہ پہ ھمے واھم ئے — اس حسینہ نے گھبرائی ہوئی حالت میں مجھے جگایا
اور مجھے جگا کر کہنے لگی۔

پادا اُو ورنا اِکہ آستہ بام ئے — اُٹھ اے جوان اکہ سپیدۂ سحر نمودار ہوا ہے
ھنگیں ئی ٹیں کائنت پہ آس ئے — بوڑھی کنیزیں چلم کے لیے تمباکو لینے
پہ چلیم ئے وزینت تمباک ئے — اور آگ جلانے کو اب آتی ہی ہوں گی
مار اگیندنت تئی چادر ئے چیر ئے — مجھے تیری چادر کے تلے دیکھ کر
تئی لوا ڈیل ئے رابد رو ھینت — شاید وہ تجھے کوئی دھوکا دے جائیں

نوٹ:۔ یہاں پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بلوچوں کے اس دَور کے سماجی اور معاشی حالات غالباً یورپ کے اس دور سے مختلف نہ تھے۔ جس کا ذکر اینگلز نے اپنی کتاب "خاندان۔ ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز" میں کیا ہے۔ اینگلز کہتا ہے کہ ۔

"جنسی محبت کی پہلی صورت جو عشق بن کر اُٹھی، ایک ایسا عشق جس میں مبتلا ہو جانا حق ہر شخص کو اکم از کم حکمران طبقہ کے ہر شخص کو حاصل تھا۔ اور جذبہ جنسی کی اعلیٰ ترین شکل بھی جاتی تھی اور یہی اُس کی اصلی خصوصیت بھی تھی۔ یہ پہلی صورت عہد وسطیٰ کے سورماؤں کی یہ فدا کارانہ محبت، ازدواجی محبت ہرگز نہیں تھی اس کے برعکس فرانس کے پروونسال لوگوں میں جہاں سورماؤں کے اس عشق کی اصلی شکل ملتی ہے۔ یہ عشق بیاہتا عورت کے ساتھ اعلانیہ زناکاری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے شاعر اسی کے گیت گاتے تھے۔ ایسا گیت جو

اتنے میں ایک بوڑھی کنیز گھر کے اندر چلی آئی ایک اجنبی کو اپنی بانو کے ساتھ

دیکھ کر: سے

چھم رنگا منا ان دو مولد شت دا رہی	آنکھیں ملتی اور فریاد کرتی ہوئی وہ کنیز شکایت کرنے کو پلٹ گئی
	ہائے! ہائے!
کہ گوری گوری مسکان ان انگوری بُرتہ	ہماری مشک بیز بانو کو گویا لے گیا۔

لیکن دوسری کنیز نے جو بانو کی رازدار تھی اسے سمجھایا کہ شور مت کرو ایہ شخص جسے تم بانو کے ساتھ دیکھ رہی ہو کوئی مجرم اور گویا نہیں بلکہ: سے

اے نزانت ڈوب ولا نگھے الیس کن!	یہ تو بیکر ہے
اے ھیا بیکر انت اکلا ما لی !	وہ بیکر جس کا ذکر اشعار میں ہوتا ہے

---

۳۴ بقیہ نوٹ :-

جرمن میں [illegible] آگیا یعنی نغمات سحر یہ دو نسال لوگوں کی عشقیہ شاعری کا بے شاداب پھول ہے ان گیتوں میں بڑی رنگینی کے ساتھ یہ داستان سنائی گئی ہے کہ عاشق اپنی محبوبہ کے ساتھ جو کسی اور کی بیوی ہے سو رہا ہے اور دربان جو باہر کھڑا پہرہ دے رہا ہے ۔ سحر کی پہلی مدھم کرن (Alba) کے پھوٹتے ہی عاشق کو آواز دیتا ہے کہ وہ چپ چاپ نکل جائے اور تب جدائی کی گھڑی آتی ہے ۔ جو پورے قصے کا نقطہ عروج ہے ۔"

(اردو ترجمہ صفحہ ۱۳۵، ۱۳۶ مطبوعہ ماسکو)

اب خاموشی ہو!
یہ کوئی ڈوم اور گویا نہیں

شاعر کو جواب کہ اس دلربا حسینہ اور مشک بیز بالوں کا نام ملی تھا ؛

بیبکر کے نصائح

بیبکر نے بلوچ سوسائٹی میں جہاں عشق و عاشقی، شعر و شاعری اور رزم و بزم میں نام پیدا کیا اور ایک بانکپن کا ثبوت دیا ہے، اور جب مردانہ شکوہ اور خودداری کے اندر بے نیازی سے اپنی زندگی گزاری ہے۔ وہاں مسائل زلیت سے متعلق اُس کی نادر تجربے ہوئے ہیں۔ اپنی ان سرگذشتوں اور تجربوں کو اس وقت جبکہ اس پر بڑھاپے کا اثر پڑنا شروع ہُوا تھا۔ بیبکر نے اشعار کے جامے پہنا کر آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے گو کہ بیبکر نے اس ضمن میں جتنا کچھ کہا ہے وہ تمام احاطۂ تحریر میں نہ آنے کی وجہ سے محفوظ نہیں رہ سکا اور بہت کچھ فراموش ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود بھی اس میں سے جتنا کچھ اب تک گوئیوں کو یاد رہ سکا ہے وُہ بیبکر کے فہم و فراست، خود آگاہی و خودداری، باریک بینی و رمز شناسی اور اس کی بے مثال بزرجیت کے اظہار کے لئے کافی ہے۔ بیبکر کے طبعی رجحان اور فکری صلاحیتوں کو سمجھنے کے لئے اُن میں سے چند ایک کا ذکر کرنا بے سود نہ ہوگا

ماں اپنے بیٹے کو لوریاں دیتی ہے اور دل دعاؤں کے ساتھ اس سے کہتی ہے کہ بیٹا! خدا تجھے لمبی عمر دے۔ مجھے بڑھاپا دیکھنا نصیب ہو۔ بیبکر یہ سن کر یوں التماس کرے :-

پیری ءَ بولیاں مدے بچ ءَ
بگو کہ زہمن وڈا تارہ دیکّی باتے

اے نیک بخت!
بیٹے کو بوڑھا ہونے کی دعائیں نہ سنا
اُس سے یہ نہ کہہ کہ بڑا ہو کر بڑھاپا دیکھے
بلکہ اس سے کہہ دے کہ
بڑا ہو کر تیغ زن، نامور اور سخی بنے۔

کہ پیری ءَ ہیبے من گندگیں دیستہ

کیونکہ میں نے بڑھاپے میں کئی بُرے
عیب دیکھے ہیں۔

دست لرزنت چہ سیمرغیں واگاں
پاد، چہ مہمیزاں زیاناں
چکیں دنتاں چہ پوپلیں رکاں

ہاتھ، گھوڑے کی باگ پکڑنے سے
پاؤں مہمیزوں میں ڈالنے سے
اور سیب جیسے دانت
سپاری جیسے ہونٹوں پر کانپنے لگتے ہیں

چم چہ دیریں گندگاں کشتنت

اور آنکھیں دُور دیکھنے سے رہ جاتی ہیں۔

اس قسم کی ایک اور نظم میں شریف زادیوں کو نصیحت کرتے ہوئے بیبگر کہتا ہے:

من جنان جوانیناں دیاں پنتے

میں اچھی عورتوں کو نصیحت کرتا ہوں
اے شریف زادیو!

شما دتی بچ ءُ ننگ نزار دارت

اپنے ناموس کی سختی سے حفاظت کرو۔
کہیں ایسا نہ ہو کہ

نوا چور دنا جاتے بپرامیت

کوئی لونڈا۔ کوئی بدچلن شخص
یا گھنگریالے بالوں والا کوئی غلام زادہ

تمبروئے گوں ہشیش گلا ٹکاں

تمہیں دھوکا دے جائے۔ اور

نے بہ بات جت شکی ستا نیا د وہ دیوانو	تمہارے بھائیوں کو جلسوں اور محفلوں میں شرمندہ ہونا پڑے

ایک اور نظم میں نوجوانوں سے مخاطب ہو کر ببکر کہتا ہے :۔

ذہ وبت او ربنایاں کبھینیاں !	ہوشیار اے اچھے نوجوانو !
دسترس کی بالا دی مہ مجینہت	جہاں تک ممکن ہو سکے اپنی قامت بالا کو محروم نہ رکھو
کہ من کوئی عیسی سر نہ رجبنینگ	کہ میں نے کبھی اپنے آپ کو محروم نہیں رکھا
پہ بہاوالی چنڈنین زیناں	نوجوان گھوڑیوں کی چندن جیسی زین سے
پہ کشکانی کاگدیں رکان	لڑکیوں کے کاغذی ہونٹوں سے
پہ امیرانی نیا د و دیوانان	امیروں کی مجلسوں اور محفلوں سے
پہ کتارانی پکنیں خڈگان	اور پہاڑی دنبوں کی کمر کے گوشت کے کباب سے

ببکر مال و دولت جمع کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ اسے کمینہ فطرت اور ذلیل لوگوں کا پیشہ خیال کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ دولت ہاتھ کی میل ہے۔ شرفاء پر لازم ہے کہ اس میل سے اپنے ہاتھوں کو ہمیشہ پاک و صاف رکھیں۔ دولت کے پیچھے بھاگنا اور اس سے قارون کی طرح خزانے بھر لینے سے یہ بہتر ہے کہ اپنے دائیں ہاتھ (طاقت) سے اُسے حاصل کیا جائے اور بائیں ہاتھ (یعنی سخاوت) سے اُسے عزیزوں میں تقسیم کر کے خرچ کیا جائے۔ چنانچہ، اس ضمن میں وہ کہتا ہے :۔

پڑدیں پہ لورانی بہا گیچان	میں ریشمی ملبوسات یعنی
من وکمسا د ورتانیان	ململ، خاصہ اور دوسرا ہم ارچہ جات

گراں بہائیں گرچہ میمنیں مرداں	تازی گھوڑوں کے بچوں، بہت مہنگے داموں میمن تاجروں سے خریدتا
ھپتگے شیشگیں ل من وجان ءَ	لیکن انہیں صرف ایک ہفتہ پہن کر
راتاں من چرزگیں ءَ گازیان	میں انہیں اپنی بلوچی شان قائم رکھنے کیلئے
پھدئیں تاموت ءَ بلوچیں ءَ	گھوڑے چرانے والے گویوں کو بخش دیتا
دیہہ ءِ دوست جنش کنت کاڈاں	گاؤں کی خوبصورت عورتیں
داتگاں بیکر بوملوکیں	ان عطیات کو جو میں بخش دیتا
دیرہ من دگانی دپ گربرتگان	ان کو دوں سے ہاتھوں ہاتھ لے لیتیں۔
باھڑ بو منڈی ءَ بی گانجیں ءَ	عین چوراہے پر میں اپنا کیمپ لگاتا
	اور بہار کا بے حساب مال و دولت لٹا دیتا۔
پرات من ءَ پلنت کہ گار مکن لالان	بھائی مجھے ہدایت کرتے کہ مال و دولت یوں ضائع نہ کرو
ستر ابنت وگیشترا بوجنت	جمع رکھو کہ زیادہ ہوں اور ان سے تمہیں زیادہ منافع ملے۔
دا کو من ءَ کہ وند ءُ ننگا نیا انت	میں کہتا کہ جب تک میرے پر خدا کی نظر نیک ہے
نزانت من دکسے وتہم بازیں	مجھے زیادہ مال و دولت جمع کرنے کی ہوس نہیں۔
مرد بلوچ انت تاں منی کونڈ انت	اگر کوئی اور بلوچ دولتمند بھی ہو تب بھی وہ میرے گھٹنے کے برابر ہے
جا کر ءِ رتیں سانی پاگ انت	میر جاکر کی ٹھنڈی چھاؤں میری پگڑی کی زینت ہے

بیبگر ایک ایسے واقعے کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جب کہ اسے اپنی جوانی یاد آتی ہے۔

کہتا ہے:۔

بلیتاں پیتر گجے من دیرو ءَ نیام ءَ	گاؤں بھر میں سرو جیسی ایک لڑکی دیکھی
نقرہ ئیں گوں تنگویں سہتان	چاندی کے زیورات میں وہ بہت ہی اچھی لگ رہی تھی۔
گی چو سریان ءَ سگار ریخا	وہ تر و تازہ نتھی سی ہرنی کی طرح اچھلتی پھرتی تھی۔
گوں من و پران ، آنہ درجائی	مگر اس نے میری طرف
بلکن منی پیری ءَ چاریان گندیت	میرے ، ریشمی ملبوسات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی
من برو تان و برنگیں ریشاں	شاید اس نے مجھ میں مری مونچھوں اور میری گھنی داڑھی میں بڑھاپے کے جاسوس دیکھ لئے ہوں۔
کرلے بلا زیرءِ جنگ انت گوں ایشاں	اُس کم بخت (بڑھاپے) کی لڑائی ہی داڑھی
ریش و گوں دنتاں و برو تانی	مونچھ اور دانتوں سے ہے۔ ھائے افسوس!
دعا ہاں ! اُو ورنائی خدیلیا فی	اے میری جوانی ! اب تیری صرف یاد باقی ہے

یہ دنیا فانی ہے۔ یہاں پر کسی چیز کو دوام نہیں۔ شاعروں نے اس موضوع پر دیوان کے دیوان کہہ ڈالے ہیں۔ لیکن بیبگر کا انداز بیان کچھ اور ہی ہے۔ کہتا ہے :-

جستر و گورے من مہتریں نسبی	ایک دفعہ میں بھی چند منتخب رند
کو نکلاں گوں رندی [illegible] چیدگیں سواران	شہسواروں کے ساتھ

سنگت گوں بستگان پہ دیما بی ئے
پرستہ ما، چہ کپتگیں سنگان

جب میں ان تھکن کا بیٹا دیکھان بن تھا.
پھر نے بھرلتے ہیں مجھ چھنر تشم بوسئرے
ہم نے ان پتھروں سے پوچھا،

گوئستگیں روچانی دہت جالان!

اے پتھرو! ہمیں گذرے دنوں کا
حال سناؤ

سنگ پہ آرمانیں دلے گالنت
چہ ئے تو پرسے او میر بلوچانی!
گوستگنت آزلی ھوت گلامانی
دگہ نہ پادانت مرد ء بیرانی
دوز کلات نہ تیریں گرے

پتھر ارمان بھرے دل سے گویا ہوئے،
اے بلوچوں کے میر ہم سے کیوں پوچھتے ہو؛
پچھلے زمانے کے جوانمرد گذر گئے.
جوانمردی و شہسواری کا زمانہ سلامت نہیں رہتا
کیونکہ زمانہ نہ تو ایک ناقابل تسخیر قلعہ ہے.
اور نہ ہی ایک عظیم پہاڑ (پہاڑ جو
اپنی جگہ سے نہ ہل سکے)

دور گوں گواھرام ئے نہ اوشتاتگ
نے رگوں میئے سردار ئے گوری چین ئے
نے زرگوں سہر ریشیں سلام کماں ئے

زمانے نے گواھرام (لاشاری) کا ساتھ نہیں دیا.
نہ بہادر متقی سردار چاکر کے ساتھ وفا کی
اور نہ ہی سرخ ڈاڑھی والے سلام خان کی
اس نے پرواہ کی.

نے کہ گوں میر ئے ھدھے گوشتیت

یہی حال تمہارا بھی ہوگا.

۲۔ شاہداد چاکر کی روایات

(۱) تخلیقِ عالم

میر شاہداد میر چاکر رند کا بیٹا جو عربی فارسی کا ایک بڑا عالم گزرا ہے۔ وہ بلوچی کا بھی ایک عمدہ شاعر اور علوم دینی سے واقفیت تامہ رکھتا تھا۔ مسٹر لانگورتھ ڈیمز۔ تاریخ فرشتہ کے حوالے سے اپنی کتاب "بلوچوں کی عوامی شاعری" میں لکھتا ہے کہ:-
میر شاہداد سیبی بلوچستان سے اپنے والد کے ساتھ نقل مکانی کر کے ملتان آیا اور یہاں پر آباد ہوا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے ملتان میں تشیع کا پرچار کیا اور اسے پھیلایا۔ اس سے ملتان اور گرد و نواح کے علاقوں میں اسے ایک روحانی پیشوا کا مقام حاصل ہوا۔

میر شاہداد نے تخلیق عالم سے متعلق ایک بلوچی نظم لکھی ہے۔ جس کی زبان میں فارسی کی آمیزش بہت زیادہ ہے۔ اس نظم سے اس کی قدرت زبان کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی علم معرفت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دیومالائی تاریخ پر بھی اس کی نظر رہی ہے۔ اس نظم میں عجیب بات یہ ہے کہ میر شاہداد تخلیق عالم کے ساتھ شہر ملتان کے وجود میں آنے کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اور ملتان کی تعمیر کو بھی تخلیق عالم کا جزو قرار دیتے ہوئے آخر میں تخلیق اسپ کا جوڑا بھی

لگا دیتا ہے۔

بہرحال اس سے قبل کہ ہم میر شاہداد سے متعلق کچھ اور بیان کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ تخلیقِ عالم سے متعلق ان کی مشہور نظم پر ایک نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ تخلیقِ عالم کے بیان کے ساتھ شہر ملتان اور گھوڑے کا ذکر کرنے سے اس کا مدعا کیا تھا۔ خداوند تعالیٰ۔ محمد مصطفیٰ اور حضرت علی شیرِ خدا کی حمد و ثنا کے بعد میر شاہداد کہتا ہے: ؎

ردچے حالیں کیسے	یہ ایک ایسی روایت ہے
من حبّ دحیلاس اُشکتہ	جسے میں نے حبّ دحیلاس سے سنا
نے عرش بود نے کرسی بود	جب کچھ نہ تھا نہ عرش تھا نہ کرسی
نے لوح بود نے قلم	لوح تھی اور نہ قلم
ڈاڈی حوا، ڈاڈا نہ بود	دادی حوا تھی نہ بابا آدم
براہیم خلیل اللہ نہ بود	براہیم خلیل اللہ نہ تھے
کشتیئے نوحانی نہ بود	کشتی والے نوح نہ تھے
عیسائے روحانی نہ بود	عیسیٰ روح اللہ نہ تھے اور سلیمان کا
تختے سلیمانی نہ بود	تخت نہ تھا۔
کھدا بود و است احمید علی	وہ خود تھا جو حمید و علی ہے۔
یک شمعے دیم آدینگ ءَ	اس کی ذات کے علاوہ جس ایک شمع تھی۔ جو ایک آئینے کے سامنے جل رہی تھی اس سے روشنی پھوٹ رہی تھی
یک تاب ئت درسلی زئت	ایک ایسی روشنی جس کی نظیر نہیں ملتی

شاہ ءَ پہ کہاریں نظر	اب بادشاہ (خدا) نے قہر بھری نظروں سے دیکھا
آ دوت کہ بالاد ءَ شُشتہ	اُس دھوئیں کیطرف جو (اس شمع سے) اوپر اُٹھ رہا تھا۔
کُرسیۓ زرّیں راست کُتہ	پھر اُس نے چاندی کی ایک کرسی بنائی اور اُس پر بیٹھ کر کلام کیا۔
لبوز شکّل و دِل موہن ات	اس کی زبان شیریں اور دل موہ لینے والی تھی
دیمیءِ ولی ات، روشن ات	اور اس کا چہرہ بقعۂ نور کیطرح منور تھا
روچ و شپی جاہ دا نگنت	اب اُس نے (اسی دھوئیں سے) رات اور دن بنائے
روچ و شب و حیرتیں حساب	رات اور دن اور ان سے متعلق دوسری چھوٹی چھوٹی چیزیں۔
جگہ ءِ زمین ءَ راست کُتہ	پھر اُس نے (اس) دنیا کی زمین بنائی
دھرتی پہ چار کریاں کُتی	زمین اس نے چار ادوار میں بنائی
کرن اول، شاہ قادر ءَ	(۱) دور اوّل میں قدرت رکھنے والے بادشاہ نے
دیہو دتی پیدا کنت	اپنے دیووں کو پیدا کیا
یک لکہ وشت دہ ھزار	جو ایک لاکھ ستر ہزار تھے۔
آں ءِ دتی نوبت کُتہ	انہوں نے جب اپنی باری گذار دی
یکسند دچم ءِ ترنگ ءَ	تو پھر دم بھر میں، پلک جھپکتے، کُہر اور
نور ورگمام ءَ گوشتگنت	بادل کی طرح چھٹ گئے۔

ملتان ءِ نیم باگپور کتنت	اُنہوں نے ملتان کا نام بھاگپور رکھا
	۲ ۔ دوسرے دَور میں
کرن دومی شاہ کادر ءِ	قدرت رکھنے والے بادشاہ نے ان
سیذائی چہلیس ساکتگنت	چالیس بندوں کو پیدا کیا
آتیاں جن و پرزند نہ مُنت	جن کی نہ بیویاں تھیں نہ بچے
پاک آتکگ دپاک ءَ شتگنت	وہ پاک آئے اور پاک گئے
اش پاک پشت ءَ بیتگنت	وہ پاک نسل سے تھے
آتیاں دی وتی نوبت کتہ	اُنہوں نے بھی اپنی باری گذار دی
یکنند چم ءِ بنگ ءِ	اور پھر دم بھر میں، پلک جھپکنے جیسے کہر اور بادل
نوز و گرگھامی گرُستگنت	کی طرح چھٹ گئے .
ملتان ءِ نیں ھسپور کتنت	ملتان کا نام انہوں نے ھسپور رکھا .
	۳ ۔ تیسرے دَور میں
کرن سیوم ، شاہ کادر ءِ	قدرت رکھنے والے بادشاہ نے پریّ
پریشتگ وتی پیدا کتہ	فرشتوں کو پیدا کیا
آتیاں دی . وتی نوبت کتہ .	انہوں نے بھی اپنی باری گذار دی
یکنند چم ءِ بنگ ءِ	پھر دم بھر میں پلک جھپکتے ہی کہر اور بادل
نوز و گرگھامی گرُستگنت	کی طرح چھٹ گئے .
ملتان ءِ نیں سیاھپور کتنت	ملتان کا نام انہوں نے سیاھپور رکھا
	۴ ۔ چوتھے دَور میں
کرن چہارم شاہ کادر ءِ	قدرت رکھنے والے بادشاہ کے حکم سے
بوری ، نگارہ دجتنت	قرنا اور نقارے بج اٹھے

اسپی دتی پیدا کننت
راں کیاست [illegible] گنت
ملتان وَیں ملتان کننت

اس نے اپنا گھوڑا پیدا کیا
جو قیامت تک رہے گا۔
ملتان کا نام اب ملتان رکھا۔

میر شاھداد اور دھلی کی لڑائی!

بلوچی کی جو قدیم نظمیں میر شاھداد سے منسوب چلی آتی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر شاھداد بلوچی کے ایک اچھے شاعر تھے۔ دھلی کی لڑائی سے متعلق ان کی نظم بلوچی کی عمدہ رزمیہ نظموں میں شمار ہوتی ہے۔

میر چاکر رند غالباً سولھویں صدی عیسوی کی ابتدائی دھائی میں سیبی سے نقل مکانی کر کے ملتان کی طرف چلے گئے۔ میر شاھداد اس کے ساتھ تھا۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مغل بادشاہ ہمایوں نے ضلع ساھیوال پنجاب میں ستگڑھ کا علاقہ میر چاکر رند کو جاگیر میں عنایت کر دیا تھا۔ مگر ۱۷ رمئی ۱۵۴۰ء میں جب شیر شاہ سوری افغان نے قنوج کے مقام پر ہمایوں بادشاہ کو شکست فاش دے کر دہلی کے تخت پر قبضہ کیا۔ تو ستگڑھ کی جاگیر بھی میر چاکر سے جو ھمایوں بادشاہ کا طرفدار تھا چھین لی۔ میر چاکر شیر شاہ سوری کی تاب نہ لا کر بلوچستان کی طرف واپس ہوا۔ اور کوھستان مری (بلوچستان) میں جا کر پناہ لی

مسٹر لانگورتھ ڈیمز، عباس خان کی "تاریخ شیر شاھی" کے حوالے سے بیان کرتا ہے "میر چاکر رند شیر شاہ کے برسراقتدار آنے کے وقت ضلع منٹگمری (ساھیوال) میں ستگڑھ کے مقام پر آباد تھے۔ اور اس وقت بلوچ ملتان کے تمام ملک پر قابض تھے جہاں سے شیر شاہ نے ان کو باھر نکال دیا۔ پس ظاہر ہوتا ہے کہ جب ہمایوں نے افغانوں سے اپنی سلطنت حاصل کرنے کی غرض سے دہلی پر حملہ کیا۔ تو بلوچوں نے اس کا ساتھ دیا۔"

بلوچ روایت کرتے ہیں کہ شاہ ایران سے مدد لے کر جب ہمایوں دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کرنے کو پلٹا تو میر چاکر رند چالیس ہزار بلوچوں کا لشکر لے کر اس کے ساتھ شامل ہوا دہلی کے تخت کے لئے ۱۵۵۵ء میں ہمایوں اور سکندر سوری کے درمیان ۲۲ رجب کو سرھند کے مقام پر جو تاریخی لڑائی لڑی گئی میر شاھداد نے اپنے اٹھارہ بیٹوں کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔ ھمایوں کی فتح و کامرانی کے بعد میر شاھداد نے اسی لڑائی سے متعلق ایک رزمیہ نظم کہی ہے۔ جس میں نہایت خوبصورتی سے دونوں لشکروں کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اور ایک عینی شاھد کی حیثیت سے میدانِ جنگ کی جو منظر کشی کی گئی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

یہاں پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس رزمیہ نظم کی جو "دھلی کی لڑائی" کے نام سے مشہور ہے "تخلیقِ عالم" والی نظم کی طرح حمد و نعت سے ابتداء نہیں کی گئی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ھے کہ یہ اُس زمانے سے جب کہ میر شاھداد مذہب کی طرف زیادہ راغب ہوا تھا۔ قبل کی نظم ہے۔ بہرحال میر شاھداد بلوچ لشکر کے ذکر سے اپنی نظم کی ابتداء کرتے ہوئے کہتا ھے: ؎

شیبری لانگا ھاں دوزھیناں	اس دفعہ، دودستی تلوار چلانے والے لانگھے
ناحر دگنزگاں سیر تماشیاں	اور آسودہ حال و بے نیاز ناھڑ
تیگش ءِ سٹزیں آمن ءَ رستہ	جنہوں نے نیلے تھر تھے سے
سرملوکی ءِ کوپگاں شپتہ	اپنی تلواروں پر سان چڑھا کر سبز کردی ہیں۔
بجمل و بگسعاراں ھرلو بیگاں	ہرات کے قفل اور بلبناد کے حریر پہن کر
در کپت دودائی پر ازھم ءَ	اپنے سروں کی بازی لگانے کو نکلے ھیں
شیبری بیگل ءَ عبزں شزتاں	اور دودائی بھی تلواریں سونت کر میدان

جنگ میں آئے ہیں ۔

سر اگوں سے شریں چرلوٹو ارزنت
اسد زئی دُہ ، اپنے بلبے بلبے

شرط کتوں تنگو، دروشمیں بچاّن
گیسوؤں والے سروں
اور اپنے زرجبین بیٹوں کی
ایک ساتھ بازی لگا دیں گے

کیئت ھمایوں گوں سے وچار لکھ ءَ
ہمایوں کے ساتھ تین چار
لاکھ کی سپاہ ھے

گوں یں دزورا کاں ھوراج ءَ
جس میں تمام قوموں کے بہادر شامل ہیں

۱، چل ھزار رِند دی دستر اگونّں
ہم چالیس ہزار رند بھی
اپنی مرضی سے اس کے ساتھ ہیں ۔

ھمایوں بادشاہ کی سپاہ کی کثیر تعداد اور جاہ و جلال کی تعریف کرتے ہوئے میر شاھداد کہتا ہے ، ۔

اُردھمایوںءَ بازءُ بے گابے حٗ انت
ہمایوں کی سپاہ بہت اور بے حساب ہے

لاکڑی سایا، شدھویں بیّ منت
اُن کے نیزوں سے زمین پر سایہ ہو جاتا ہے

مُرگ سرءِ بُلّانی سرءَ نشتنت
پرندے (تھک کر) نیزوں پر بیٹھ جاتے ہیں ۔

آھوُمں اُردءِ بیاگ ءَ گیپتنت
ہرن ، سپاہ کے درمیان آ کر ہاتھوں سے پکڑے جاتے ہیں ۔

مں ڈگار جاگا لے نہ نت پادءِ
گھوڑوں اور آدمیوں کی اتنی کثرت ہے

ضند نہ نت مردءُ دزیان ورا
کہ زمین پر پاؤں رکھنے کی بھی جگہ نہیں ۔

یہاں پر اس بات کا خیال رہے کہ بلوچ "سُوریوں" کو بھی ترک خیال کرتے ہیں۔ اس نے نظم میں ہر جگہ "سُوری" کے بجائے ترک کا لفظ آتا ھے۔ الغرض میر شاہداد کہتا ہے کہ ؎

رچ در اہتکہ چہ تنگویں برجیان	جب سورج اپنے طلائی برج سے ابھر آیا،
گوانک کتہ دُت رددیں دماموان	تو جنگ کے طبل گورنج اُٹھے
مابلوچ ترکاں گوں مکایں بوں	آج ہم بلوچ ترکوں سے ٹکرا لیں گے

جب میر چاکر کے زیر کمان بلوچ صف بستہ ہو کر سوریوں سے ٹکرانے کو آگے بڑھنے لگے۔ تب میر شاہداد کہتا ہے کہ میں نے ان کی فتح و کامرانی کے لیے دعا مانگی اور میں نے دیکھا کہ ؎

چہل ھزار ولاڈے پورتریں مردان	چالیس ھزار ایک ہی نسل کے بہادر
پورتریں رند پہ ڈُنگ ءَ کا تکنت	رند کے بیٹے دوڑ دوڑ کر آگے بڑھے چلے جا رہے ہیں۔
من حُدا امان انت شمے بالاد	تب میں نے کہا، اے بہادرو! تمہارے خوبصورت قد و قامت
گور رجن و تنگو دردشیں تچان	تمہاری بیویاں اور تمہارے زرعین بچے خدا کی امان میں رہیں۔
شرتی ھور ھیسی جوڑتوں بیتہ	آج جبکہ سروں کی بازی لگی ھے
ماکھلائی دل نہ چیندڑ بیتہ	تم کسی اور خیال سے اپنے دلوں کو آلودہ ہونے نہ دینا۔

میر شاہداد کہتا ہے کہ سب سے پہلے بلوچ ہی "سوریوں" سے جب

ٹکرائے اور :- سے

پُنڈتگ جنگ گوں توپک ءِ تیران	بندوقوں کی گولیوں سے لڑائی شروع ہوا
گوں سگاراں وسار دیئں لیلاں	اور پھر سمند گھوڑوں کے سوار آگے بڑھے اور تلواریں چمک اٹھیں
دیر نہ بیتہ ۔ داں دماں دکتے	اس حملے کو زیادہ دیر نہیں گزری کہ پانی (پسینہ) اور دودھ (جھاگ)
آپ و شیر بیتہ داں دماں یکے	سرخ خون کے ساتھ مل کر بہنے لگا

اور پھر میر شاہداد کہتا ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ اہ

پلّوے میر ءِ لشکر ءِ پرشتہ	میر چاکر کی طرف سے لشکر کا ایک حصہ ٹوٹ کر بھاگ رہا ہے ۔ اور ان کی اڑائی ہوئی گرد
دھنزی چہ میر ءِ بیرک ءَ گوستہ	میر چاکر کے جھنڈے سے بھی پرے گذر چکی ہے

میر شاہداد کہتا ہے کہ یہ حالت دیکھ کر مجھے تعجب ہوا ۔ کہ کیا اب بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ رند میدان جنگ سے بھاگ جائیں ۔ لیکن جب میں نے مزید ے دیکھا تو ظاہر ہوا کہ :- سے

پادگر تگنت پٹھان ونکیب سیاطین	یہ کالے نقیب اور غلام زادے تھیا

	البتہ کچھ غیر بلوچ اور کچے نسب کے
پُرشتگنت روگال ءُ میراں کھاین	میر عالی بھی ان کے ساتھ ہیں ۔
	جو پیچھے ہٹ رہے ہیں ۔
رِند نہ کنزنت چہ موزگی ہینزءَ	رند تو اپنے پاؤں کی ایڑھی بھی میدان جنگ سے پیچھے نہیں ہٹاتے

اس لڑائی میں میر چاکر کی بہن بی بی بانڑی بھی کجاوے میں بیٹھی ہوئی رند لشکر کے ساتھ تھی ، اس نے جب بلوچوں کو پیچھے ہٹتے اور بھاگتے ہوئے دیکھا تو ، بقول میر شاھداد : ؎

جُپ جتہ مائی بانڑی شیہک	شیہک کی بیٹی ، مائی بانڑی (کجاوے سے) چھلانگ لگا کر نیچے زمین پر کود پڑی
دستی گوں باھینکاں شتنت پُرزا	اس نے خوبصورت چوڑیوں والے اپنے دونوں ہاتھوں کو اُوپر اٹھایا
جت وتی سرزاناں امیرینا ں	اور پھر انہیں اپنے امیرانہ گھٹنوں پر مار کر اپنی
پروشتگنت اُمچی تڑنگیں باھینک	تو قطار کی چوڑیاں توڑ ڈالیں ۔
ھورےُ ھوےُ لجانی سرءَ آتکہ	عورتوں میں کہرام مچ گیا

عورتوں کی آہ و بکا اور نوحہ و ماتم سن کر بہادر رند اسطرف کو متوجہ ہوئے میر شاھداد کہتا ہے ۔

اُرچ سرءَ میران دمریدکاکنت	سب سے پہلے میرحان اور مرید اس طرف آئے۔
ایرکپتہ فیروزخان مڑا یانی	پھر بلند ہمت فیروز خان اپنے گھوڑے پر سے اُتر آیا
بوراں گوں تاسیں دوروان کشتنت	اسے دیکھ کر دوسرے رندوں نے بھی اپنے زین کسے گھوڑوں کے پیچھے اڑنے
گوں پدی راچیاں مڑوکیناں	والے اپنے خدمتگاروں کے حوالے کر دیا
زھم جتہ ڈاڈے پورتریں رنداں	اور خود پیادہ پا تلوار چلانے لگے
چیگ بوچانی لیلویں جان ئنت	دلی کے ترکوں کے بیٹوں نے بھی جان کی بازی لگا دی
یامگھولانی ھلّ دمندیل ئنت	بلوچوں کے سڈول جسم خون سے گلنار ہوتے رہے۔ اور ان کی تلواریں
زورکپتہ دلیَ پورتریں ترکان	ترکوں کے زرہ بکتر اور فولادی ٹوپیوں کو کاٹتی رہیں۔ دلّی کے ترک زادے بڑھ بڑھ کر حملے کرتے رہے۔
زھمش ماجاہیں کوپگاں داشتوں	مگر ہر بار ان کی تلواروں کو ہم اپنے مضبوط کندھوں، ڈھالوں
کوپگ دمندیلان بلوچیناں	اور اپنے بلوچی خودوں پر روکتے رہے

قدیم سیتھین قوموں کی طرح قدیم زمانے سے بلوچوں کا بھی یہ دستور چلا آتا تھا کہ جب ان کو لڑائی کی شدت کا احساس ہو جاتا اور میدان جنگ میں فتح و شکست کی غیر یقینی کیفیت پیدا ہو جاتی تب وہ سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیئے اپنے گھوڑوں سے اُتر آتے اور پھر یا تو دشمن پر فتح پاتے اور یا میدان جنگ میں کٹ مرتے۔ اس لڑائی میں بھی میر چاکر کے زیر قیادت چالیس ہزار بلوچوں نے اپنے اس دستور کو قائم رکھا تا آنکہ :ـــ

پروش کتہ دِلّی ءِ تُرک حرام خورین	دِلّی کے حرام خور تُرک راہ فرار اختیار کر گئے ۔
فوجش گرانین ماھپت سری پروشتوں	ہم نے ان کی بہت بڑی فوج کو سات ٹکڑیوں میں کاٹ دیا ۔
سی ھزار زشیرِی گرڈا کینتو ں	ان میں سے تیس ہزار کو ہم نے شیر نر کی طرح چیر پھاڑ کر رکھ دیا
بیرش ماجہل پہ جندر ءَ دشتوں	اور ان کے سر ہم نے چکی میں پیس دیئے
دہ ھزار رند ءِ پلو ءَ کُشتہ	رندوں کی طرف سے بھی دس ہزار مارے گئے ۔
لجّ ءَ ھلکا بین بلوچین ءَ	ہم نے بلوچستان کے کوھستان کی لاج رکھ لی ۔

سُوریوں کو شکست فاش دینے کے بعد ھمایوں بادشاہ نے آگے بڑھ کر دھلی کے تخت پر قبضہ کر لیا ۔ اس کے بعد میر شاھداد کہتا ھے کہ :ـــ

بیڑ تہ دئی ءِ کوٹ ھزار گنجین	کہ ہم نے دھلی کے قلعے کو جو ھزاروں قسم کے گنج و مال سے بھرا ہوا تھا لوٹ لیا۔
او دءُ ھشت پہرءَ ماڈیں ءِ داتہ	ہم وہاں آٹھ پہر ڈیرہ ڈالے پڑے رہے
مرد کرار بنت دلبور بسا سار بنت	تاکہ ہمارے جوان باز آرام کرلیں
گونش نما سار بنت دسے نوکین	اور ہمارے گھوڑے دم لیں
سومی انش سمیں بُنہاں دیر بت	اور اُن کی پیٹھ پر سے سُومیں دُور ہو

نظم کے اختتام پر اپنے بلوچ لشکریوں سے مخاطب ہو کر میر شاھداد کہتا ہے کہ :-

	اے اگر کوئی
مرد کہ اچ سندھ ءِ تیگو ءِ کائنت	ماڑیوں میں بیٹھی ہوئی ہماری محبوباؤں کا پیغام لے کر سندھ سے آئے
جُجو ءِ رانی ءِ پیاہین ءَ	اور کہے کہ انہوں نے ہمارے غم
برد شگنت اچی نتیں باھینگ	میں اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی ہیں
تیم شپی گریہ زاریاں پہلنت	تو تم اس سے کہدو کہ خوش خوش واپس جائے
پہ وتی گنوکیں بزرگیں ان	اور جا کر انہیں یہ خوشخبری سُنائے کہ
پہ وتی ننگانی خدا بندان	اپنے باپ، بھائی اور خاوندوں کے لئے سوگوار نہ ہوں۔
	اور اپنی آدھی راتوں کی گریہ وزاری

بند کردیں	
کیونکہ وہ کالے کالے چیونٹے	دیرواں گڈی مرد دریں ورنت
جو لاشوں پر جمع ہوا کرتے ہیں	سیاہ مزنبو میں لشکراں زیرنت
وہ ہمارے دشمنوں کی قبروں میں جمع ہیں	ھورے بنداں ؤ امیرن ئ
ہم ان سے محفوظ ہیں	
اپنے امیر کے زیر سایہ ہیں کسی کی	نیتیٔ پرواہ و گزرکس ء
پرواہ نہیں ہے ۔	

۳۔ شاہداد و ماہناز

شاہداد اور ماہناز کی داستان عشق ننگ و ناموس کی پاسداری سے متعلق بلوچی معاشرہ کا ایک ایسا المیہ ہے جس میں ہجر و فراق کی تڑپ کے ساتھ ساتھ طنز و طعن کی نیش زنی اور شاعرانہ اظہار کی چاشنی بدرجہ اُتم موجود ہے۔

روایت ہے کہ ماہناز میر شاہداد کی بیوی ذات کی لوھانی بلوچ اور میر عومر لوھانی کی خالہ زاد بہن تھی۔ اس کے علاوہ میر شاہداد کی ایک اور بیوی بھی تھی جس کا نام مرگو تھا۔ میر شاہداد کو ماہناز سے بڑی محبت تھی۔ اس لئے اس کی سوکن مرگو اس سے جلا کرتی تھی ماہناز ایک خوش طبع شریف النفس اور بھولی بھالی عورت تھی لیکن مرگو طرازِ معاملہ اور بات کا بتنگڑ بنانے والی شریر و عیار عورت تھی جو ہر آن اس کوشش میں لگی رہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح کوئی ایسی بات بنا دے جس سے میر شاہداد کا دل ماہناز سے میلا ہو۔

کہتے ہیں کہ ایکدفعہ میر عومر لوھانی میر شاہداد کے ہاں مہمان ٹھہرا۔ آدھی رات کو جبکہ سب لوگ آرام کی نیند سو رہے تھے۔ مرگو اپنے بستر سے اُٹھی اور عومر لوھانی کے بستر پر جا کر اس کے جوتے پہن لئے اور پھر وہاں سے دبلے پاؤں ماہناز کے بستر تک آئی اور واپس چلی گئی۔ جوتے جہاں سے پہنے تھے واپس وہاں رکھ دیئے اور خاموشی سے آکر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ عومر لوھانی اور ماہناز دونوں میں سے کسی ایک کو مرگو کی اس حرکت کی خبر نہیں ہوئی۔

صبح جب میر عومر رخصت ہوا۔ تب مرگو نے جا کر میر شاہداد سے کہا

کہ رات اُس نے عومر نوھانی کو ماھناز کے پاس جاتے دیکھا ہے۔ شاھداد کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔ نومرگو نے اُسے لے جاکر میر عومر کے جوتوں کے نشان دکھلائے۔ میر شاھداد نے پہچان لیا کہ نشان واقعی میر عومر کے جوتوں کے ہیں۔ تب اس نے یقین کر لیا کہ بلاشبہ میر عومر نوھانی اور ماھناز کے آپس میں ناجائز تعلقات رہے ہیں۔ اور اس طرح میر شاھداد نے اپنی چہیتی بیوی ماھناز کو اس کی سوکن کی جھوٹی باتوں میں آکر طلاق دے دی

طلاق کے بعد، ماھناز واپس اپنے قبیلے میں گئی اور کچھ عرصہ بعد میر عومر نوھانی سے شادی کر لی۔ اس دوران میں میر شاھداد کو بھی اصل حقیقت معلوم ہو گئی اب وہ اپنی غلطی پر بہت پچھتایا مگر سے اب پچھتائے کیا ہوت۔ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

میر شاھداد نے اب ماھناز کے فراق اور میر عومر نوھانی کی رقابت کی آگ میں جل جل کر اشعار کہے۔ دوسری طرف ماہناز بھی اُسے ترکی بہ ترکی اشعار میں جواب دیتی رہی۔ اور اس طرح نظموں کا وہ گراں بہا سلسلہ وجود میں آیا۔ جو اب تک زبان زدِ عام ہیں۔ شاھداد و ماھناز کے یہ جوابی اشعار جو طویل نظموں کی صورت میں ہیں۔ بلوچستان کے طول و عرض میں اب تک زھیروک یعنی فراق کی دکھ بھری دھنوں میں گائے جاتے ہیں۔ بالخصوص عورتیں بڑی مؤثر اور پُرسوز لے میں شادی بیاہ کے موقعوں پر یہ اشعار گاتی ھیں

الغرض جب میر شاھداد نے ماھناز کو طلاق دے دی تو دوسرے دن ماھناز کے درشاد جن میں عومر نوھانی بھی تھا اُسے لینے کو آئے ماہناز اپنی ایک نظم میں ان کے آنے کا نقشہ اس طرح کھینچتی ہے :-

ھلک لڈیت کہ لشکر دڈاہ انت	ان گھڑسواروں کو دیکھ کر گاؤں کے لوگ بھاگنے لگے
من نہ لڈّاں کہ دُراہ منی ھنزم اَنت	انہوں نے سمجھا کہ خطرہ ہے اور کوئی لشکر آرہا ہے لیکن میں نہیں بھاگی
منی ھاریچیں دراہ پت وبرات اَنت	کیونکہ میں جانتی تھی کہ وُہ میرے محرم ہیں وُہ سب میرے لئے میرے بزرگ باپ اور بھائیوں کی طرح ہیں۔
سے اَنت تروزھگ منی کمان دار اِنت	ان میں سے تین میری خالہ کے کماندار بیٹے ہیں۔
سوار اَنت برپور د روھویں گوانتاں	جو تیز رفتار بھور ے گھوڑوں پر سوار بگولے کی طرح آرہے ہیں۔
دڑجاں ءَ چہ کیچگ ءَ کائنت	وُہ وادیوں سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔
دستش منی ھوریں سرگامان اَنت	گھوڑوں کی لال رنگ کی باگیں اُن کے ہاتھوں میں ہیں۔
دیمش شاھداد ءِ پہ کلات ءَ انت	اور شاھداد کے قلعے کی طرف ان کا رُخ ہے۔
پہ منی لوگ ءُ لڈگ ءَ کائنت	وُہ میرا گھر بار لاد کر مجھے لے جانے کو چلے آرہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ماھناز نے جب میر عومر نوھانی سے شادی کی تو میر شاھداد کے تن بدن آگ لگ گئی مگر اب وہ کیا کرسکتا تھا سوائے اس کے کہ شعر و شاعری کا سہارا لے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالے ۔ چنانچہ اس نے میر عومر کی ہجو میں ایک طویل نظم کہی اور ایک ڈوم گویے کے ذریعے اُسے ماھناز کو سنانے بھیج دیا۔ اس نظم میں میر عومر کی ہجو میں میر شاھداد کہتا ہے : ؎

ڈومب! منی رِندی گوشتگیں گالان	اے ڈوم گوّیے !
	میرے کہے ہوئے اشعار لے جا
برجہاں گول ءَ سرجم ءَ سرکن	اور اُس ہرجائی ماھناز تک
	انہیں من و عن پہنچا دے
گوش ھوُد ماھناز ءَ جنانی ءَ	اس عورت ذات سے جس کا نام ماھناز
	ہے کہہ دے کہ ،
من تئی کنوذ جگ ءَ دلیتیں	اے کاش ! میں تیرے خاوند (عومر) کو
	کہیں چلتے پھرتے دیکھتا ۔
کے بردستائی من یلہ داتیں	اور تلوار کا ایک ایسا ہاتھ اس
	کی پیٹھ پر مارتا کہ
ارگز د رلیشواں جگر بوارتیں	گدھ اور چیل اس کا جگر نوچتے
	اور گیدڑ اور لومڑیاں اس کی
تونگ و روباہاں زھینت نیتیں	لاش کو گھسیٹتے پھرتے

اسی نظم میں آگے چل کر میر شاھداد، ماھناز سے کہتا ہے کہ عومر سے شادی کرکے اس نے اپنی پستی کا ثبوت دیا ہے ۔ عومر اس کے لائق کا خاوند

ہوہیں کیونکہ : ـــہ

دھومریک ھپتارے لبشارانی	دھومر، پہاڑیوں کی غلیظ کھوہ میں رہنے والا ایک لگڑ بھگڑ ہے۔
راھکش رلینیت کشارانی	جسے کاشتکار اپنی فصلوں سے دُور بھگاتے ہیں۔
دارگی ڈوندڑو روت بما کونڈءَ	وُہ مُردار لاشیں کھا کر اس غلیظ کھوہ میں چھپنے کو چلا جاتا ہے
پشتی رلیش انت چہ گٹنگ ءَ ڈوندمو	مردار لاشیں ڈھونے سے اس کی پیٹھ میں زخم پڑ گئے ہیں۔
گوں دپ دسونڈار ءَ نزازین ءَ	اس کا مُنہ اور اس کی تھوتھنی کُتے کی سی ہے
سیاہ سریں مٹے سودی پاشان نت	وُہ ایک کالا پہاڑی ریچھ ہے جس کے بال لٹک رہے ہیں
باھوءِ لُولنگاں لپاشان نت	اور جو، باھو کی خاردار جھاڑیوں میں سے کیڑے مکوڑے کھاتا ہے
دستی چہ ڈوڈیءَ ڈلنگانی !	اس کے ہاتھ، گندم کے دلیہ میں استعمال ہونے والی ڈوئی کی طرح ہیں۔
پادی چہ گشکورءَ جنبکانی	اس کے پاؤں، اس تپائی کی طرح ہیں جس پر لڑکیاں دودھ بلوتی ہیں۔

لاپ پہ کھرجین ءَ زیبا بانی	اس کا پیٹ ، گھوڑوں کی خرجین کی طرح ہے
چمّی پہ لوهی ءَ تلانگانی	اس کی آنکھیں ، اُن گڑھوں کی طرح ہیں جو چٹانوں پر ہوتے ہیں ۔
سری پہ سندھی وَت گرلبیں دیگے	اس کا سر ، سندھ کی بنی ہوئی خانہ ساز دیگ کی طرح ہے ۔
بانگوا روَت گوں بُزگلی ٹولے	وُہ صبح کو بکریوں کے ریوڑ کیساتھ جاتا ہے
بیگہ ءُ کیئت گوں گندگیں جھولے	اور شام کو بُری طرح لڑکھڑاتا ہوا واپس آتا ہے ۔
وڑ دیت وتی کدّل ءُ پہیت	اور پاؤں گھسیٹتا ہوا تمہاری کٹیا میں داخل ہوتا ہے ۔
جکّت گوں گوجی چنگلاں پلیت	اور اپنے گوہ جیسے پنجوں سے تمہاری قمیص کا گلا کھینچتا ہے
دیر شپے چہ کیت گڑی بگیت	آدھی رات کو جب کوئی لیلہ دُور کہیں بھرک سے بلبلاتا ہے
دیکا اپچ لوگھاریں سرات جکیت	تو تمہارے معطر گیسوؤں والے سر کے نیچے سے وُہ اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہے نیچے لڑھک کر

ماں کُئیت جاڑیں باندو ءِ سنگاں — تیرا سر فرش کے پتھروں سے جا لگا ہے
اور تیری مانگ پر سے

ھونت چہ گیوار ءَ بہنت دُگریں — تیرا تازہ گرم خون بہنے لگتا ہے

میر شاھداد کی یہ نظم جب ماھناز تک پہنچی تو اس نے بھی جواب میں ایک نظم کہہ کر میر شاھداد کو بھیج دی ، جس میں میر شاھداد سے مخاطب ہو کر کہتی ہے : ـــ

رھگذاریاں رھوت ہمہ لوگ ءَ — اے راستے سے گذرنے والو !
اس گھر میں چلے جاؤ (جس میں میر
شاھداد رہتا ہے)

مئے سلاماں ، دیہیت مردِ رنا ءَ — اور میرے سلام اس نوجوان کو
دیتش شاھداد ءِ بلوچیں ءَ — اس دانشور شاھداد کو پہنچا دو
(بعد از سلام اُس سے کہدو !)

ناکو زھگ شاھداد کھاں مڑا پانی ! — اے میرے چچا کے بیٹے !
اے بلند ہمت شاھداد !

نواچ دتی کہ دیپشنگ ءَ کپتے — تم اب کوئی کام کرنے سے رہ گئے ہو
(تمہارے لئے اب صرف یہی ایک
کام رہ گیا ہے کہ)

بندے ھیبار ءِ نیاجن ءَ جود ءَ — گھر میں بیٹھ کر کسی عورت کے خاوند
کی عیب جوئی کرتے رہو ۔

ھونرے ذات ءِ زھگیں سوارے — عزیز ہمارے قبیلے کا ایک شمشیر زن

شہسوار ہے۔

ھو مرے جُت ءُ برگئیں سانڈے	جو مر ہماری اونٹنیوں کے گلے کا ایک ایسا تنومند سانڈ ہے
زگھیڑگ ءُ کیچگاں چرتہ	جو وادیوں میں چر کر خوب موٹا ہو چکا ہو
	دُہاد جو مر، اپنی پاک دامن بیوی کی بائیں
بیرمن ءُ چپیں زانسر ءُ نشتہ	جانب گھٹنے سے گھٹنا ملا کر بیٹھتا ہے
	اور اس کے الائچی چبانے والے دہن
دہاں چہ ھیلِ وارین دپ ءُ گپتہ	کے بوسے لیتا ہے

اسی نظم میں آگے چل کر ماھناز کہتی ہے کہ تم نے تو مرگو کی جھوٹی باتوں پر یقین کر کے مجھے طلاق دے دی اور مجھے اپنے گھر سے باہر نکال دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم بیوقوف اور کم عقل ہو۔ ہے

عقلت چو کُلیّ ءُ چنگو کین	تمہاری عقل اس مشکیزے کی طرح ہے
ئی شپانکانی گردن ءَ دُولیں	جو چرواھوں کے گلے میں لٹکتا ہے
	اور جس سے پانی رس رس کر اس
	کی ایڑیوں تک جا پہنچتا ہے
	اسی طرح تمہاری عقل بھی
ھم دم ءُ کئیت دپاد گت کوشتی	دماغ سے رس رس کر ایڑیوں
	میں آ گئی ہے

ماھناز اپنا پاک دامنی جتلا کر کہتی ہے کہ مرگو کی سن گھڑت کہانی کو پہچان

کہ تم نے مجھے بے آبرو کر کے گھر سے باہر نکال دیا لیکن بعد میں جیسا کہ خود تم کو بھی معلوم ہو گیا کہ میں ایک آبرو باختہ عورت نہیں ہوں بلکہ ا ے

من ھما انجیراں پیتن تاکیں	میں چوڑے پتوں والے انجیر کا وہ درخت ہوں
بُرز بما کوھانی سراں رستہ	جو یا تو اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر اُگتا ہے
گیشتر بما کمیں سر شماں بیتہ	یا سبز گھاٹیوں اور چٹانوں کے دروں پر لہلہاتا ہے
من ھما جیھناں گر و گئی	میں دشوار گذار چٹانوں پر اُگا ہوا وہ سرسبز درخت ہوں
ڈلکن ءِ گوات کہ اچ کور ءِ گشیت	کہ جب جنوب کی تیز ہوائیں چلتی ہیں
اُکسر ءَ درچکانی سراں جنڈیت	تو تمام درختوں کے سروں کو جھکا دیتی ہیں
سر منی پچ گوات ءَ نہ جنڈینتہ	لیکن میرا سر کوئی ہوا بھی نہیں جھکا سکتی
بُن منی پچ ھور ءَ نہ میسینتہ	اور کوئی بھی بارش میرا تنا نہیں بھگو سکتی
	میرے قمیض کا گلا (گریبان) اس
چنگ منی جاین ھوتر ءَ بستہ	بلند مرتبہ عومر نے باندھا ہے
	اب صرف وہی اُسے کھولے گا۔
گوری گنڈیت یا ھومری بوجیت	یا پھر قبر میرا بدن دیکھے گی۔

چوتھا باب

(۱) بالاچ منتقم کی رزم آرائیاں!

بلوچستان میں شاید بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو بالاچ بیر گیر یعنی "انتقام لینے والے بالاچ" یا بالاچ منتقم کے نام سے واقف نہ ہوں اور اس پر فخر نہ کرتے ہوں، بالاچ نے اپنے بھائی "دودا" کے خون کے انتقام میں اگرچہ بلوچوں کو بھی مارا اور بہت سخت مارا مگر چونکہ اُس نے بلوچوں کی اخلاقی قدروں کے مطابق ایک بہادر بلوچ کی طرح اپنا انتقام لیا لہذا بلوچ سوسائٹی میں وہ مقبول ہوا یہاں تک کہ اس کے دشمن بلیدیوں کو بھی اس کی جوانمردی، شجاعت اور بلوچیت کا اعتراف کرنا پڑا

بلوچ من حیث القوم انتقام لینے کے معاملے میں بہت سخت جان، ضدی اور سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ بلوچ چونکہ خود بہت سخت منتقم ہیں اور انتقام لینے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ ان افراد کو بھی جو اگرچہ اُن کے اپنے خون کے پیاسے اور جانی دشمن کیوں نہ ہوں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں جو منتقم ہوں۔ اور اُن دوسروں کو جو اس فرض کی بجا آوری میں کوتاہی کریں یا خون بہا لے کر انتقام لینے سے دستبردار ہوں بزدل اور بے آبرو سمجھتے ہیں۔ اگرچہ وہ ان کے اپنے بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔

انتقام لینے والوں کی مناسبت سے بعض لوگ بلوچ کو صحیح طور پر اونٹ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اونٹ کی انتقام جوئی اور کینہ پروری مشہور ہے۔ یہی حال بلوچ کا بھی ہے وہ اتنا سخت اور بڑا منتقم ہے کہ پشت در پشت اور نسل در نسل انتقام کی آگ کی چنگاری کو وہ اپنے دل میں دبائے رکھتا ہے یہاں تک کہ دشمن کے خون سے اُسے بجھانے اور ٹھنڈا کرنے کی نوبت آجائے اسی لئے ایک بلوچ شاعر کہتا ہے :

بیر بلوچانی نہ دو صد سال ءَ	بلوچ کا انتقام دو سو سال تک اس ہرن کی طرح ہے جس کی عمر دو سو سال ہو۔
لس ءَ میں آھو منت دو دنتا ہیں	ہاں، اگر یہ ممکن ہو کہ
سنگ اگن چاھتانی بن ءَ رِیزنت	پتھر کنوئیں میں گر کر پانی میں گھل جائے تب یہ بھی ممکن ہو گا کہ
کینگ پہ مردانی دل ءَ کنزنت	بلوچ کے دل میں انتقام کا جذبہ سرد پڑ جائے

بلوچ سب کچھ کر سکتا ہے مگر اس شخص کے ساتھ جس سے خون کا انتقام لینا ہو، سمجھوتہ اور صلح نہیں کر سکتا۔ بلوچ کے لئے یہ کس قدر ناممکن ہے اس کا جواب ایک ایسے بلوچ شاعر سے سنیں جو اپنے دشمن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے : —

دست ءِ دل پٹ و مید بیارنت	اگر یہ ممکن ہو کہ ہتھیلی پر بال نکل آئیں
کرانگو کیں گر اگھ شیر بیارنت	کائیں کائیں کرنے والا کوا دودھ دینے لگے
لہدی ءَ سزار لاھو بنت	جنگل کے شیر پالے جا سکیں
آسکل کہول و چینی بنت	صحرائی ہرنوں کے بدن پر دنبیوں کی طرح اُون پیدا ہو

گوّراں کنگ و ماراں پاد
بوجی پہ دگار ءَ جنت
بیرجت بنت لشکاراں
گورکاں جنتی چپارینت
اگت رئے نہ بیت صول و تران

اور ان کی اون کاٹی بھی جا سکے
گز کے درخت میں کانٹے نکلیں
اور سانپوں کے پاؤں نکل آئیں
کشتیاں زمین پر چلنے لگیں
ساربان ہل جوتیں
اور ان کی بیویاں بھیڑوں کے
بچوں کو چرائیں۔
پھر شاید ہمارے درمیان صلح
کی بات چیت ہو سکے۔

مُلا رکام دشتی جو ایرانی بلوچستان کا ایک مشہور شاعر گذرا ہے۔ اپنی اسی
قسم کی ایک نظم میں کہتا ہے: ؎

شگاں مرگ کمیانی شبان بیت
پلنگاں اشترانی ساربان بنت
وڑو کیں گرگ نگہبان پسان بنت
پس ءِ اولاد چو بیر ءِ شوشگان بنت
اگن پلنگ، پگ ءِ پاسبان بیت
اگن آھو گوں شیراں ھمکراں بیت
اگن سیمرگ دانہ گوں چراں بیت
پشستان روم ءِ کاماراں بیت
شپ بیت و نہم گرماھکاں بیت
ھمنت جو گزاں ءِ ردان گس بیت

اگر یہ ممکن ہو کہ:
چیتے اونٹوں کے ساربان ہوں
درندہ بھیڑیئے بھیڑوں کے نگہبان ہوں
بھیڑ کے بچے جنگلی بلے بن جائیں
بلی چھچھوندروں کی پاسبان ہو۔
ہرن شیر کی طرح خونخوار بن سکے
سیمرغ مرغ کی طرح دانہ دنکا چگنے لگے
پھر روم کے بادشاہ پر فتحیاب ہو
اُنتیسویں کی رات کو چاندنی ہو،
ہمنت کا پہاڑ رائی کے دانے برابر
چھوٹا ہو،

هشاش پہ ڈُسا و طرو جُنگیاں کُماں بیت	خرگوش دھاڑ کی پیسا ڑیوں جتنی بڑی ہو،
زِرِ ءِ آپ حُشک ءُ راہ پہ گُرگاں بیت	سمندر کا پانی سوکھ جائے اور اس پر چلنے پھرنے کا راستہ بن جائے
زِرِ ءِ ماھیگ پہ آ دُنیاں تہاں بیت	سمندر کی مچھلیاں، میدانوں میں دور دُور خشکی پہ پھریں
اگں عقرب گرں پورُ ءَ جی وجا بیت	عقرب اور ثریا کے ستاروں میں ٹکراؤ ہو
پدا میگ ءِ وتی سھول دزاں بیت	تب شاید ہمارے درمیان صلح کی بات چیت ممکن ہو سکے۔

الغرض بلوچستان کے خارزاروں، وادیوں اور صحراؤں میں بہت بڑے جوانمرد منتقم بلوچ گذرے ہیں۔ لیکن ان میں بالاچ جیسا یکہ سوار اور سرفروش شاید ہی کوئی گذرا ہو۔ بالاچ نے اکیلے اپنی جان پر کھیل کر بلیدی جیسے ایک بلوچ قبیلے کو جسطرح ناکوں چنے چبوائے اس کی نظیر بلوچستان کی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔

بالاچ حسن نامی گرگیچ کا دوسرا بیٹا تھا۔ دودا جس کے خون کا انتقام لینے کو بالاچ نے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی۔ اس کا بڑا بھائی تھا۔ جب دودا بلیدیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ تو بالاچ کمسن تھا۔ چنانچہ خود کہتا ہے، ؎

من کساناں رُڑیمُ و کُنڈاں	میں چھوٹا تھا بس ایک ناسمجھ لڑکا
بِرمپ آسانی سرءَ زِنداں	میں گھر میں چولھے کے پاس پڑا رہتا
کو وچہ گرمیں تا پگاں پنداں	جس میں دھیمی سی آگ جل رہی ہوتی
من مزن بان و جنگاں بِھلاں	اور میں توؤں پر سے گرم گرم روٹیاں لے کر کھایا کرتا تھا۔
	جب میں بڑا ہوا

	تو میں نے بکریاں چرانا چھوڑ دیا۔
چوٹوں نزل ردیں گلا لک بنت	میرے سر کے بال بڑھ کر اب گیسو بن چکے تھے۔
من کمانے پہ لیپڑ دے زبراں	میں نے ایک زادنٹ دے کر ایک کمان خریدی
زنگ دسو حان کناں تیراں	اور بیٹھ کر تیروں پہ سو حان پھیرتا رہا

ایک دوسری روایت ہے کہ بالاچ جب کچھ بڑا ہوا اور اسے اپنے بھائی دودا کے خون کا انتقام لینے کا احساس ہونا شروع ہوا۔ تو وہ اپنے دشمنوں سے ٹکر لینے سے قبل سخی سرور کی زیارت کو گیا۔ کچھ راوی کہتے ہیں کہ وہ لعل شہباز قلندر کی زیارت کو گیا بہرحال وہ کئی سالوں تک وہاں رہا۔ کہتا ہے :-

باصوٹ پہ شاہ ءُ رہنگاں	میں پناہ لینے کو شاہ کے پاس گیا۔
شاہ ءُ پکھالی بیتگاں	شاہ کے مزار کا بہشتی بن کر پانی ڈھوتا رہا
ہاں اژدھمی سال ءُ سر ءُ	جب میں اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچا
من زُشتگ دمرد بیتگاں	اور بالغ ہو کر مرد بنا
تیر دکمانوں زُرتگاں	تب میں نے تیر دکمان سنبھالے
ماد نکیبو زمبہنیں !	تیغ زن نقیبو میرے ساتھ تھا

نقیبو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بالاچ کا خانہ زاد غلام تھا۔ اور اتنا تیز دوڑتا تھا کہ اصیل گھوڑے بھی اسے پہنچ نہیں سکتے تھے۔ بالاچ خود بھی بڑا تیز رفتار شخص تھا بالاچ نے اپنی اور نقیبو کی تیز رفتاری کے متعلق ایک نظم میں کہا ہے :-

آسکاں پہ ترھڑ ءُ گپتگاں	ہم ہرنوں کو دوڑ دوڑ کر پکڑتے
من کسمیانی بیتگاں	اُن کا کباب بناتے۔

ماونکیبو : دار تگاں   اور پھر میں اور نقیبو کھایا کرتے تھے۔

الغرض بالاچ نے اپنے بھائی دوداخان اور اپنے قبیلے کے اُن دوسرے افراد کا جو دودا کے ساتھ بلیدیوں کیخلاف لڑتے ہوئے مارے گئے تھے انتقام لیا - بالاچ نے بلیدیوں کو مار مار کر اس حد تک عاجز کر دیا کہ انہوں نے مجبور ہو کر سنگسیلہ کے علاقے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا اور سندھ میں جا کر سکونت پذیر ہوئے۔

بالاچ نے کل کتنے بلیدی مارے اس کا صحیح حساب معلوم نہیں۔ لیکن اس نے اپنے بھائی دودا کے گھوڑے کے انتقام میں جتنے بلیدی مارے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کی کُل تعداد کتنی ہوگی - خود بالاچ کہتا ہے : ؎

بیست گوں دتی لوھیں کمان	میں نے تیس کو (بلیدی) تیرو کمان سے مارے
بیست گوں دو گوشیں خنجرءَ	بیس کو دو دھارے خنجر سے
دہ گوں تبر زین ءِ دپ ءَ	اور دس میں نے گہرے زخم لگانے والی
دہ گوں مزن تچیں لڑءَ	اپنی تلوار سے موت کے گھاٹ اتارے
سر ھنگ ءِ حون اِنت مینر بین	یہ تو تیرے (دودا کے) سرخند گھوڑے کا انتقام تھا
اِزگا تی حجت ءُ کنان	اب میں تیرا (دودا کا) حساب چکاؤں گا۔

اس تمام دوران میں نقیبو سائے کی طرح بالاچ کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ دونوں کوہ پہاڑوں میں جا چھپتے اور رات کو کئی کئی میلوں کا فاصلہ طے کر کے بلیدیوں کے کسی گاؤں پر شبخون مارتے اور خاموشی سے کئی بلیدیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر واپس پہاڑوں

میں غائب ہو جاتے تھے۔ اسی طرح یہ سلسلہ کئی سالوں تک جاری رہا۔ تا آنکہ بلیدی علاقے کو خالی کر کے سندھ چلے گئے۔

گورگیج اور بلیدیوں کے درمیان لڑائی کی ابتدا سمو یا ستی نامی ایک بیوہ عورت کی وجہ سے ہوئی غالباً سترھویں صدی عیسوی میں یہ واقعہ ہوا اس کی ابتدا کیسے ہوئی اس سے متعلق کہا جاتا ہے کہ سنگسیلہ کے علاقے میں ایک بلیدی رہتا تھا جو کھیتی باڑی کر کے گذر بسر کرتا۔ سمو اس کی بیوی تھی۔ لیکن ان کی اولاد کوئی نہ تھی۔ جب وہ بلیدی مرا تو اس کے ورثاء نے اس کی تمام جائداد پر قبضہ کر لیا اس کی بیوی سمو کے پاس گایوں کا صرف ایک گلہ رہ گیا جسے لے کر وہ گورگیجوں کے علاقے میں گئی اور اس ڈر سے کہ مبادا اس کے خاوند کے ورثاء یہ گلہ بھی اس سے چھین لیں وہ دودا گورگیج کی پناہ میں گئی کچھ عرصہ بعد بلیدیوں نے گایوں کے اس گلہ کا بھی تقاضا شروع کیا۔ مگر دودا نے کہا کہ یہ گلہ سمو کا ہے اس کے خاوند نے مرتے وقت وصیت کر کے اسے یہ گلہ دیا ہے۔ بلیدیوں نے دودا کی بات نہیں مانی اور آخر کار ایک دن بلیدی موقع پا کر یہ گلہ بھی ہانک کر لے گیا۔

ایک اور روایت جسے سٹرلانگو رتھ ڈیمز نے بھی ایک مبالغہ آمیز رنگ میں بیان کیا ہے یوں ہے کہ سمو کا خاوند جو ایک بلیدی زمیندار تھا ایک دن صبح کو اپنے مکئی کے کھیتوں کو دیکھنے گیا کھیتوں میں اُسے گایوں کے ایک گلے کے پاؤں کے نشان نظر آئے جو رات کو اس کے کھیتوں میں چر کر گیا تھا۔ دوسرے دن بھی جب پھر یہی واقعہ ہوا تو اس نے ان گایوں کا پتہ لگانے کی ٹھان لی۔ رات کو اس نے کھیتوں کے قریب گھاس پھونس جمع کر کے اس میں آگ لگا دی تاکہ دھواں ہو۔ یہاں پہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان علاقوں میں مچھر بہت زیادہ ہوتے ہیں اور مویشیوں کو آرام سے رہنے نہیں دیتے ان کے قریب اسی طرح کی آگ جلا کر دھواں کیا جاتا ہے۔ مچھر دھوئیں میں مویشیوں کے پاس نہیں آ سکتے۔ اور اسطرح مویشی دھوئیں کے گرد جمع ہو کر آرام سے جگالی کرتے رہتے ہیں۔ یہی طریقہ سمو کے خاوند نے بھی آزمایا۔ صبح کو جب کھیتوں میں گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ سب گائیں دھوئیں کے گرد آرام سے بیٹھی ہیں۔ اب وہ انہیں ہانک کر اپنے گھر لے گیا۔

راوی کہتے ہیں کہ یہ گائیں رات کو آسمان سے اُتر کر آتی تھیں اور پھر صبح کو غائب ہو جاتی تھیں۔ لیکن یہ بات نہیں۔ گائیں در اصل دوسرے بلیدیوں کی تھیں۔ جب اُنہوں نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ تو سمّو کے خاوند نے اُنہیں مالکوں کو واپس کر دینے سے انکار کیا۔ اور گایوں کو اپنی مکئی کی فصل کے معوض میں جسے یہ گائیں چر کر تباہ کر چکی تھیں۔ اپنے پاس رکھ لیا۔ جب بلیدیوں نے اپنا گلہ زبردستی واپس لینا چاہا تو وہ وہاں سے نقل مکانی کر کے گورگیجوں کے پاس دودا کی پناہ میں چلا گیا۔ اور پھر ایسا ہوا کہ چند دنوں کے بعد وہ بیمار پڑ کر مر گیا لیکن مرتے دم اُس نے دودا گورگیج کو بلا کر وصیت کی کہ گایوں کا یہ گلہ سمّو کا ہے، جو اس کی پناہ میں آئی ہے۔ لہٰذا دودا کا فرض ہے کہ بلیدیوں سے اس کی حفاظت کرے۔

بہر حال صورتحال جو بھی ہو، بلیدیوں نے اپنی گایوں کے بدلے میں گورگیجوں کے مال مویشی لوٹنا شروع کئے۔ چنانچہ بلیدیوں نے ایک دفعہ ڈاکہ ڈال کر دودا کے چچا زاد بھائی رئیس کے اونٹوں کا گلہ ہانک لیا۔ گورگیج اُن کے تعاقب میں نکلے اور بہت جلد اُنہیں جا لیا۔ لڑائی ہوئی جس میں گورگیجوں میں سے رئیس اس کا بھائی کاہوڑی۔ چندرام۔ توتا۔ سمّو سمائیل اور مرید مارے گئے۔

دوسری دفعہ بیبگر بلیدی پھر حملہ لے آیا اور سمّو کی گایوں کے گلے کو جو مہر حمل کی رکھی چراگاہ میں چر رہا تھا ہانک کر لے گیا۔ ان دنوں دودا گورگیج کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ جس وقت گموال یہ بری خبر لے کر پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا اور : ؎

دودا و پلنگ رواب بیتہ	دودا سائبان عروسی کی ٹھنڈی چھاؤں میں
سیری منّو ءِ سارتیں ءَ	اپنی دُلہن کو آغوش میں لئے ہوئے
ہمبوب ءِ گورءَ د اُنبازان	سویا ہوا تھا

گموال نے دودا کی ماں کو اطلاع کی تو وہ نوحہ کرتی ہوئی دودا کے پاس گئی اور اُسے نیند سے جگا کر کہنے لگی : ؎

لے دودا اُٹھ!

دردا! آمرد کرگرنت باصوٹاں	جو لوگ کسی کو پناہ دے کر اپنے پاس رکھتے ہیں۔
یمرج ءُ نہ رپحنت واب ءَ	وُہ دن کے وقت سائبان عروسکا میں سویا نہیں کرتے۔
سیری منتوءُ سارتین ءَ	
نوماہ من ترا لاپ گرُتہ	میں نے نو مہینے تجھے اپنے شکم میں پالا
ئے سال ءُ ترا میچینتہ	اور تین سال تجھے دودھ پلایا ہے
	تجھ پر میرا بڑا حق ہے۔
گرکاں سرجی ءُ کارے	اپنا یہ حق اُس صورت میں تجھ پر بخشوں گی
	کہ تو یا تو سمو کی تمام گائیوں کو
	سلامت واپس لے آئے
یا ھیبی چوٹوءُ زیاں دارے	یا اس لڑائی میں اپنا سر گنوا دے

دودا نیند سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا، غلام نے اُس کی سرخند گھوڑی پر زین ڈال دی دودا ہتھیار سجا کر جب سائبان سے باہر آیا تو باگ پکڑ کر اُس نے اپنی گھوڑی سے کہا:

لے میری سرخند گھوڑی!

باگی سرءُ سارتیں آپ	تیری بانو اپنے سر پہ پانی ڈھو ڈھو کر تجھے پلاتی رہی ہے۔
میشی ونگ و ماھیلو	اور لکڑی کے بڑے بڑے کاسوں میں
لیٹینت من جہازی سرکان	گندم کا دلیہ اور گھی ملا کر چاہت بھرے
داتی پہ دل ءُ رازی ءُ مَن	دل سے تجھے کھلاتی رہی ہے۔
دان من تیرگ ءُ لالین ءَ	سُرخ تو برے ہیں، تجھے دانہ
اپ من لکڑی کوٹیاں	اور لکڑی کے بڑے پیالوں میں تجھے

	پانی پلاتی رہی ہے۔
بستوں تئو ءِ چیر سایا	اور میں تجھے کھجور کی ٹھنڈی چھاؤں میں باندھتا۔
ہوارگوں ترا جبکار تاں	اور چارہ ڈالتے وقت ہمیشہ تجھے تھپکی اور پیار کرتا رہا ہوں۔
سرھنگ تو بورلو بیژ وربی	تاکہ اے سرخند! تو خوب کھا اور موٹی ہو جا
کہ روچے تو من ءِ بکار ءِ بیئے	شاید ایک دن دشمنوں کے خلاف لڑائی میں تو میرے کام آئے۔
سیالی شہارت ءِ شار ءِ دیئے	
اروچ انت مروچی آتکا	اے سرخند! وہ دن آج آیا ہے
جہلءِ کمبزاں جارڈیناں	اب تو اچھل اور چھلانگیں لگاتی ہوئی چل
گوں بیچ گوں بیداں جوریناں	اور مجھے دشمنوں تک پہنچا دے

بلوچوں میں قدیم کلدانی توہمات کے نشان اب تک ملتے ہیں۔ شگون اور فال کو اب بھی مانتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔ اب بھی کوّے کی کائیں کائیں۔ گیدڑ کی چیخ۔ گاریخ نامی ایک دھاری دار ایک پرندے کی اڑان، الّو کی آواز "کُے" کا بھونکنا۔ صبح کے وقت کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلتے وقت کسی اجنبی عورت یا لڑکی کا دیکھنا۔ پیچھے سے آواز لگانا۔ پگڑی۔ ہتھیار یا چھڑی کا ہاتھ سے گر جانا اور آگ کی آواز وغیرہ بیسیوں ایسی چیزیں ہیں جن سے بلوچ اچھا یا بُرا شگون لیتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک واقعہ دودا کو بھی پیش آیا اور اسے اس نے اپنی موت کا نشان سمجھا۔ یہ بات یوں ہوئی کہ جب دودا بلیدیوں کے تعاقب میں اپنی سرخند گھوڑی اڑائے کسی گاؤں کے پاس سے گذرا تو اسے

سھدر پشکی جتے پاد آتکہ	سُرخ قمیص والی ایک عورت اٹھی
شار ءِ پلو ءِ بیژان ءِ	اس نے اپنے ریشمی دوپٹہ کے پلو کو سمیٹتے ہوئے

ڈکی مہریں گوئراں میسٹران ء — اور اپنی چھاتی کے اُبھار کو ڈھانپتے ہوئے اسے آواز دی

دودا! تو روئے تاچان ء — اے دودا! تم اکیلے کہاں دوڑے جا رہے ہو؟

تاھر! پہ پدی درنایاں — ٹھہر جاؤ تاکہ تمہارے پیچھے آنے والے نوجوان

ترگانی گہیں مرد بیائنت — اور گاؤں کے اچھے بہادر تم سے آن ملیں

دودا گھوڑی دوڑائے چلا جا رہا تھا کہ اس عورت نے اُس کے پیچھے یہ آواز لگائی جس سے دودا نے بُرا شگون لیا۔ اور اُسے یقین ہوگیا کہ وہ زندہ واپس گھر نہیں آئے گا۔ دودا نے گھوڑی کی باگ کھینچ کر اس عورت سے کہا:

ارمان پر تہ اُد باگاڑ چھم — افسوس ہائے چھپکلی جیسی آنکھوں والی

نی موت ء وانشانے داتے — تو نے موت کو میرا پتہ بتا دیا

زندء راجتے چاچوڑے — اور تو نے میری زندگی پر چھپا مارا اے کم بخت!

اِنچ ما، اگہیں مرد تمام ئنت — وہ نوجوان کون سے ہیں جن کا میں انتظار کروں

کرجگاں پہ پدی درنایاں — اور مجھ سے بڑا بہادر ان گاؤں میں اور کون ہو سکتا ہے۔

یہ کہہ کر دودا نے گھوڑی کو ایڑ لگائی اور گرماپ کے مقام پر بلیدی دشمنوں کو جا لیا۔ تب:

ھالوئے جتنہ درتا ئے	نوجوان دودا نے
مات ءِ سیر تماھیں پُج ئے	ماں کے لاڈلے بیٹے نے
	دشمنوں کو للکارا

بلیدیوں نے جب مڑ کر دیکھا تو دودا ان کے تیروں کی زد میں آچکا تھا انہوں نے ایک ساتھ اس پر تیر چلائے اور :

دودا چہ پڑنگین زین ئے	گُھردرے غدنگوں نے
	دودا کو گھوڑی کی موتی جڑی زین سے
پرینت گونڈلان زبر بینال	نیچے گرا دیا۔
کپتہ من پڑءِ شاھی ئے	میدان میں گر کر اس نے جان دے دی

دودا کو مار ڈالنے کے بعد، بلیدی اس کے ہتھیار۔ گھوڑی اور ریشمی ملبوسات مثلاً پگڑی چادر اور قبا وغیرہ اٹھا کر لے گئے گاؤں میں جب بلیدیوں کی اپنی عورتوں نے دودا کے کپڑے اور ہتھیار وغیرہ دیکھے تو شاعر کہتا ہے ا ہے

کاڈاں پہ راھشیف دلیتگنت	خوبصورت عورتوں نے جب اپنی آنکھوں سے
ازی چہ توناں گریہتگنت	دودا کے ریشمی ملبوسات دیکھے
	تو وہ خون کے آنسو روئیں
کریگ سرِ جیگ وکنیگ	دودا کے ماتم میں اپنی آستینیں گریبان اور
	دامن
من دس وسافی مینتگنت	آنسوؤں سے بھگو دیئے۔

ظاہر ہے کہ بلیدی عورتیں دودا کی جواں مرگی پر جس قدر روئیں اس سے زیادہ وہ اپنے بیٹوں۔ بھائیوں اور خاوندوں کے لئے بدیں وجہ نوحہ کرنے لگیں کہ اب گودی ان کو چین سے

بیٹھنے نہیں دیں گے۔ اور خدا جانے کتنی جانیں اور اس انتقام در انتقام کے جانکاہ عمل کی نذر ہوں؟ اس لئے شاعر کہتا ہے: ـــ

زالاں پہ مودکامی گو گشتنت	بلیدی عورتوں نے نوحہ وزاری کرتے ہوئے اپنے مردوں سے کہا
شما کہ ھمے مرد کُشتگنت	تم لوگوں نے جو اس شخص کو مار ڈالا ہے
زاناں! بلوچ بے داھگنت؟	کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ کوئی لاوارث بلوچ ہے؟
لے زر کہ بیبگر زرتگنت	خوب سمجھ لو کہ یہ دولت جو بیبگر نے جمع کر رکھی ہے
پُچیں گُدو کیس نہ بنت	اس سے اب وہ ریشمی کپڑے اور کھیس
مِسک و خُراسانی کماچ	مشک اور خراسان کے عطریات
سر کو لگاں زر ءِ کُٹک	اور قمیص کے شانوں کے چاندی کے بٹن نہیں خرید سکے گا۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے دودا کی موت کے وقت بالاچ کم سن تھا۔ لیکن جب وہ جوان ہو کر ہتھیار سنبھالنے کے قابل ہوا تو اس نے بلیدیوں کی وہ گت بنائی کہ: ـــ

مات، پہ ڈیگاں حیران مُنت	مائیں اپنے بیٹوں کے لئے
گہار، پہ جوٹ بردتیں براتان	بہنیں اپنے گل چھبیلے بھائیوں کے لئے
دُنیگ، پہ ونی زاماتاں	ساسیں اپنے داماد رنگیلے اور حسین بیویاں اپنے خاوندوں کے لئے حیران و پریشان تھیں
کاڈ پہ سمرئیں کُنڈ لیکاں	رات کو اڑنے والے پرندوں کے پروں کی آواز سن کر
لے فرگ کہ شپاں نیم جال مُنت	وہ دبک جاتیں اور آپس میں سرگوشی سے کہتیں کہ
بالاچ ءِ کمان ءِ تیر مُنت	بالاچ کے تیروں کی آواز آرہی ہے

گوکش کہ مڑنت من ھلکاں — اور رات کو گاؤں میں اگر دو بیل آپس میں لڑتے

واب ءَ جھنت نیاڑیان — تو عورتیں نیند سے اچھل پڑتیں

گل ءَ جچہ یئں مائیان — اور گھروں کی شریف بیویاں آہستہ

وش وش ءَ گوشنت گوں جودان — سے اپنے خاوندوں سے کہتیں۔

بس کن! درھکگنت بالاچ ءَ — چپ رہو، بالاچ کے پاؤں کی آہٹ ہے

بالاچ جیسا کہ ایک بے رحم منتقم، جفاکش بہادر اور نڈر بلوچ تھا۔ ویسا ہی وہ ایک آتش بیاں شاعر بھی تھا۔ فردوسی کے شاہنامہ کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

ہر آں کس کہ شاہنامہ خوانی کند
اگر زن بود، پہلوانی کند

ایسی ہی ایک بات ایک بلوچ شاعر نے بالاچ کے اشعار سے متعلق کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: ؎

بالاچ کے اشعار

مردانی دلاں جوشینت — بہادروں کے دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کر دیتے ہیں۔

نامرد ءِ دل ءَ تراکینت — اور بزدلوں کا دل چیرتے ہیں

بالاچ جو منتقم کی صفت سے مشہور ہے اعلیٰ پائے کا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کٹر قسم کا قوم پرست بلوچ بھی تھا۔ بلوچ بلوچستان اور بلوچیت سے متعلق جتنے پر جوش اور ولولہ انگیز قومی اور مدحی اشعار بالاچ کے ہاں ملتے ہیں اس دور کے کسی اور بلوچ شاعر کے ہاں نہیں ملتے۔ مثال کے طور پر اپنی ایک طویل نظم کے افتتاحیہ میں بلوچ

متعلق وُہ کہتا ہے:-

کوہنت بلوچانی کلات	پہاڑ بلوچوں کے قلعے
انبارش بے ھوشیں گرُنت	چٹانوں کے بڑے بڑے غار ان کے گودام (انبار)
بُرزیں ھشی اِش گوانگرُنت	پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیاں اُن کے محل
ھنکینش بے راھیں گرُنت	اور دشوار گذار گھاٹیاں ان کی قیام گاہیں ہیں
آپش ہبوکیں چمگُنت	وُہ پہاڑی چشموں کا بہتا ہوا شفاف پانی پیتے ہیں۔
بوریش پتیں چیوُنت	(خام چمڑے کی بنی ہوئی) سفید چپلیاں اُن کے گھوڑے
کوڈی اِش پیش ہرکنڈل ُنت	پیش کی رتیوں سے بنی ہوئی) پیالیاں اُن کے آبخورے
بُرپش ڈگار ءِ تہتگُنت	زمین کے ہموار قطعے اُن کے گدیلے
سرجا اِش سنگ ُنت تاپگیں	چوڑے پتھر اُن کے سرہانے
نشتیں جنش کھرکاوگ ُنت	اور خاردار جھاڑیاں ان کی سہیلیاں ہیں
بچ اِشں گچینیں گوندُلُنت	خدنگ ان کے بیٹے
زامانی شلیں خنجرُنت	نوکدار خنجر اُن کے داماد
براتش تلاریں اسپرُنت	گینڈے کی کھال سے بنی ہوئی چٹان کی طرح سخت ڈھالیں اُن کے بھائی
براز ھکش مرد واریں لڑُنت	بہادروں کو کھا جانے والی تلواریں اُن کے بھتیجے
ھارپش سیوائی جگ ُنت	اور سیوائی کمانیں ان کے والد بزرگوار ہیں

ظاہر ہے کہ دودا کی موت سے بالاچ کو شدید صدمہ پہنچا۔ اگرچہ وہ کمسن تھا لیکن بلوچی معاشرے سے اس عمر میں بھی اُسے جو سبق ازبر تھا۔ وہ ایک نازک دل میں انتقام کی چنگاری رکھ دینے کو کافی تھا۔ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی توں توں یہ چنگاری اُس کے دل میں بھڑکتی رہی تا آنکہ سن بلوغ کو پہنچ کر جب اس نے ہوش سنبھالا تو اسے معلوم ہُوا کہ اس کے دل میں انتقام کی جو آگ بھڑک رہی ہے وہ دشمنوں کے خون کے چھینٹوں کے سوا اور کسی طرح سے بجھائی نہیں جاسکتی۔ انتقام کی یہی خلش یہی تڑپ اور یہی آگ اس کی ولولہ انگیز شاعری کا بھی باعث ہوئی۔

ایکدفعہ دودا کی بیوہ، یتیم بیٹے اور گھوڑوں کو دیکھ کر بالاچ کے دل میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ ان طوفانی لہروں کو ایک نظم میں سمیٹ کر اس نے جن تلاطم خیز الفاظ میں اپنے آتش انگیز جذبات کو پیش کیا ہے۔ بلوچی شاعری میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کہتا ہے:

جثران وکاباں چہ در ءَ
بچاں ءَ گندان بے پت ءَ
داباں کپنت روچ ءِ سر ءَ
دردُنت من بالاچ ءِ دل ءَ
بوران ءَ گندان لنگن ءَ
آھیرگ ءَ روچ ءِ سر ءَ
دردُنت من بالاچ ءِ دل ءَ
جوانیں جناں موشیا رُدو ءَ
بن گیرت وڈیلش مگی
کنٹ وکہیری انگری
من پیرہنا ءُ ہند نہ کنت
حل بیت دموی ءَ رچیت
دردُنت من بالاچ ءِ دل ءَ

جب میں باہر سے گھوم پھر کر آتا ہوں
اور دودا کے یتیم بیٹے کو دیکھتا ہوں
جو دھوپ میں پڑا پڑا سو جاتا ہے
تو میرے دل میں ہُوک سی اُٹھتی ہے۔
جب اس کے گھوڑوں کو دیکھتا ہوں، جو دھوپ میں
بھوکے بندھے ہوتے ہیں تو میرے دل میں ہُوک سی اُٹھتی ہے
جب میں اس کی پیاری بیوی کو غمزدہ اور پریشان دیکھتا ہوں
اور یہ دیکھتا ہوں کہ اس کی قامت زیبا
دُکھ کی آگ میں کھجور کے تنے اور کہیر کی
لکڑی کے انگاروں کی طرح جلتی
اور موم کی طرح پگھل کر پیرہن سے
باہر نکلتی ہے۔
تو میرے دل میں ہوک سی اُٹھتی ہے

ان تمہید کے بعد اپنے سامعین سے مخاطب ہو کر بالاچ پوچھتا ہے کہ کیا تم جانتے ہو کہ دودا کے قاتلوں کے ساتھ اپنے زہریلے دشمنوں کے ساتھ میں کیا سلوک کروں گا؟ اگر نہیں جانتے ہو، تو سنو! وہ یہ ہے

من گوں بداں ھچو پش کناں	میں اپنے دشمنوں کے ساتھ
دودا ءِ جوریں دشمناں	دودا کے زہریلے قاتلوں کے ساتھ
سیداں گوں ماھی ءَ کنت	ایسا کروں گا جیسا کہ مچھیرے مچھلی کے ساتھ کرتے ہیں۔
بز گوں ہپیری ڈنگراں	بکری کھیر کی ٹہنی کے ساتھ کرتی ہے
باز گوں کپوت ءِ وزراں	باز کبوتر کے ساتھ کرتا ہے۔
گرمیں ہوار گوں چپڑاں	گرمیوں میں لُو پانی کی پتلی سطح کے ساتھ کرتی ہے۔
ھیلاں کنت گوں ارزن ءَ	اور شُور باجرے کی فصل کے ساتھ کرتا ہے۔
من گوں بداں ھچو پش کناں	میں اپنے دشمنوں کے ساتھ
دودا ءِ جوریں دشمناں	دودا کے زہریلے قاتلوں کے ساتھ ایسا ہی کروں گا۔
ہُرواہگیں مرداں کُشاں	اُن کے چیدہ چیدہ افراد کو مار ڈالوں گا۔
آسے تاں حشر روک کناں	اور ایک ایسی آگ لگا دوں گا جو قیامت تک جلتی رہے گی۔

بالاچ نے ہتھیار چلانے کے گُر اپنے غلام نقیبو سے سیکھے۔ نقیبو خود ایک مشہور تیر انداز اور شمشیر زن تھا۔ اس نے بالاچ کو لڑائی کے طور و طریقے بالخصوص چھپ کر حملہ

کرنے کے ڈھنگ، تیر و کمان اور خنجر کا استعمال سکھایا۔ چھپ کر لڑنے کے لئے جہاں صبر و حوصلہ ضروری ہے وہاں چستی اور برق رفتاری کا ہونا بھی لازمی ہے اس فن میں نقیبو نے بالاچ کو دوڑا کر اور شکار کے دوران آزمائشوں میں ڈال ڈال کر طاق کر دیا۔ بھوک اور پیاس کی برداشت اور شب گردی کے تجربات سے جب اُسے ایک بلوچ کامل بنا دیا تب ایک دن دونوں نے بستی کو خیر باد کہہ کر پہاڑوں کی راہ لی۔ رات کو وہ پہاڑوں سے اتر کر بلیدیوں کی کسی بستی میں پہنچتے، اور کسی منتخب بلیدی کو موت کے گھاٹ اُتار کر راتوں رات پہاڑوں میں واپس پہنچ کر چھپ جاتے۔ دن کو ہر چند کہ بلیدی اُن کی تلاش کرتے مگر کہیں ان کا نشان نہ پاتے۔ بالآخر بالاچ کے ان شبخونوں سے عاجز آ کر ایک دن بیبگر بلیدی نے کسی ڈوم کے ذریعے بالاچ کو طعنہ دیا کہ :—

بالاچ دکا یے جو ذریں تو لگ ءُ	اے بالاچ! تم گیدڑ کی طرح راتوں کو چوری چھپے آکر
واب ءَ کُشتے براوند گان	نیند میں پڑے ہوئے ہمارے بھائیوں کو مار کر بھاگ جاتے ہو۔
مہلوم بکن بیا پہ مرڑ ءَ	اگر تم واقعی بہادر ہو تو اطلاع دے کر لڑنے کو آ جاؤ
ورنا چہ گھُلاں در کپنت	تاکہ ہمارے نوجوان بھی کمربستہ اور مسلح ہو کر
سرءِ لبنگ وچارڈ کنت	اپنے گھروں سے باہر آئیں۔
نشیکہ ترا کلاں جنت	یہ خیال نہ کرو کہ وہ سب مل کر تمہیں ماریں گے
تی ءُ کہ دمثہت منہاں	نہیں تمہارا مقابلہ کرنے والا اور تمہارا ہم پلہ تو اکیلا میں ہوں

اُسی ڈوم کے ذریعے بالاچ نے بیبگر بلیدی کو جواب بھیجا :—

بیبگری مکُل من سرا نت؟
جھنگ بلوچ مُ چو نہ انت
بچّ نہ داتاں تو تگی
شیری مُ بوریاں بدی

نے بوروں لبتہ دہ سدی
نے لشکرے سیاہ و بزین
من پہ وتی ھیَبی سر ءَ
ہر شپ جو بشامی جیڑ ءَ
بندان دکایاں پہ مٹر ءَ
تئی ورنا ، من کھلاں پٹگنت
بورش ھزاری لبتگنت

اے بیبگر ! کیا تیرے سر میں عقل ہے ؟
بلوچ اس کو بھاگنا نہیں کہتے
یں گیدڑ کی طرح نہیں لڑتا
بلکہ شیر کی طرح اپنے دشمنوں کو
پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں
میرے پاس نہ تو قیمتی گھوڑے ہیں
اور نہ ہی بے شمار لشکر ہیں ۔
میں اکیلا سر ہوں
اس کے باوجود ہر رات کو ساون کی گھٹاؤں
کیطرح امڈ کر لڑنے کو آتا ہوں
تمہارے نوجوان
جن کے دروازوں کے سامنے قیمتی
گھوڑے بندھے ہوئے ہوتے ہیں
گھروں میں
اپنی بیویوں کی بغل میں سوئے
ہوئے ہوتے ہیں ۔

کہتے ہیں کہ ان ہی دنوں یوسف نامی ایک صوت بلیدیوں کے ہاں ۔ رہتا تھا
اس نے بیبگر بلیدی کی بہن سے شادی کی ہوئی تھی ۔ یوسف کی بالاچ سے بھی گہری
دوستی تھی ۔ ایک دن پہاڑوں پہ یوسف کی چراتی بکریاں چرا رہا تھا ۔ بالاچ سے
ملاقات ہو گئی ۔ بالاچ کئی دنوں سے بیبگر بلیدی کو مار ڈالنے کی تاک میں تھا ۔
یوسف بھی بیبگر سے خوش نہ تھا ۔ موقع کو غنیمت جان کر بالاچ نے یوسف کو اس
بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ بیبگر کو مروانے میں اس کی رہنمائی کرے گا ۔ چنانچہ

بالاچ کہتا ہے ا ـــ

پسیری سن ھادی کمنڈگ ءِ رلیس ءَ	پرسوں ھادی کی گھاٹی کے قریب
ھیسپ گوں سیاھیں بُزگلے ولسیتہ	میں نے یوسف کو بکریوں کے ایک کالے ریوڑ کے ساتھ دیکھا۔
نیاگم ءَ سی پاریں کرّان داشتہ	ہم نے تیس پاروں والے قرآن کو درمیان میں رکھا
دانگنت کنوّل دگیپتگاں اکرار	اور آپس میں وعدہ و اقرار کرلیا کہ
کنوّل گوں پجلیں اسپر ءَ لبتہ	یوسف اس رات کو اپنی خوبصورت ڈھال کو اپنے
ٹنگی گوں پیٹدار ءَ کرٹ تیبگ ءَ	خیمے کے دروازے کے باہر لٹکا دیگا

ڈھال کو خیمے کے دروازے سے باہر لٹکا دینے کی وجہ یہ تھی کہ بلیدیوں کی اس بستی میں یوسف اور بیبگر کے خیمے ساتھ ساتھ تھے۔ رات کے وقت ان میں تمیز نہیں کی جاسکتی تھی کہ یوسف کا خیمہ کون سا ہے۔ اور بیبگر کا کونسا۔ اس نے اس ملاقات میں بالاچ نے یوسف کو اس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ رات کو جب بستی کے لوگ سو جائیں تو وہ اپنی ڈھال خیمے سے باہر دروازے کے بیرونی ستون سے لٹکا دے گا۔ تاکہ جب بالاچ آئے تو ڈھال دیکھ کر وہ دوسرے خیمے میں چلا جائے جو بیبگر کا ہوگا۔

رات کو یوسف نے وعدہ کے مطابق اپنی ڈھال خیمے سے باہر دروازے کے سامنے لٹکا دی۔ لیکن بدقسمتی دیکھیے بالاچ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے یوسف کی بیوی کسی حاجت سے اُٹھ کر خیمے سے باہر آئی اور واپسی پر اپنے خاوند کی ڈھال کو دروازے سے باہر لٹکا ہوا پاکر اس نے خیال کیا کہ ممکن ہے وہ اُسے اندر رکھنا بھول گیا ہو۔ ڈھال اُٹھا کر اندر لے گئی۔ جب بالاچ آیا تو اُسے خیمے کے

دروازے پر ڈھال کی طے شدہ نشانی نظر نہ آئی۔ اس نے اپنا قیاس دوڑایا اور قسمت سے اس خیمے میں جا داخل ہوا جو یوسف کا تھا۔ چارپائی پر اپنی بیوی کی بغل میں یوسف سویا ہوا تھا۔ بالاچ نے اُسے بیبگر لبیدی سمجھ کر مار ڈالا۔

اس واقعہ سے متعلق بالاچ نے ایک بڑی عمدہ نظم کہی ہے جس میں اس رات کی اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے :-

روچ پرُدت زردیں دیگرءِ جہل بیت
اُفق پر جب سورج
عصر کی زرد پہر سے بھی نیچے
لڑھک گیا

روک کتوں دزی مرمریا آسے
ہم نے چوری چھپے ایک دھیمی سی
آگ جلائی

بچتوں بھرپیٹیں پھرا نیغے
اس کے انگاروں پہ ہم نے ایک آدھ
کچی روٹی پکائی

بوپلا بور منتوں من دبیل ءُ
اور میں نے اور میرے ساتھی نے
اُسے لذیذ سپاری کی طرح کھایا

بیل منی جنگانی نکیبو انت
میری لڑائیوں کا ساتھی نقیبو ہے
گوں دو سد تیراں جابہی گوں انت
دو سو تیر اس کی ترکش میں ہیں
سدنی سیوائی کمان لانک ءُ
اور میری سیوائی کمان کے لئے
سو تیر میرے پاس بھی ہیں۔

تیک من پچلیں اسپیر ءُ داناں
پھر میں نے ڈھال پہ ٹیک لگائی
دل منی امرگی ولب شتہ ادواں
اور میرا دل پرندوں کی نیند سوگیا

جب رات آدھی گذر گئی تو بالاچ کہتا ہے کہ نقیبو نے مجھے جگا کر کہا :-

بُسّت اُرّے بالاچ! آہستہ بام ءَ	اُٹھ اے بالاچ! سپیدہ سحر نمودار
مہتگ ءِ بنیگ چہ گیپگ ءَ کپتنت	گاؤں کے کتے بھونک بھونک کر خاموش ہو گئے۔
ھُرّگیں ذالاں چہ مرمریا آس ءَ	بوڑھیوں کی ٹمٹماتی ہوئی آگ بھی بجھ گئی

بالاچ اور نقیبواب پہاڑ پر سے اُترے اور برق رفتاری سے بیبگر کے گاؤں کی طرف جھپٹے۔ بالاچ کہتا ہے:

من گُشتاں پادموش دنگوشان ءَ	اب میں پاؤں کی آہٹ پر کان دھرتا ہوا چلا
دشمناں پادمال دلیاشان ءَ	اپنے دشمن کو لتاڑنے اور پامال کرنے کو
آتکاں پرکھلانی ھرینگ ءَ	جب میں خیموں کے قریب پہنچا
کرکتاں سالونکی ھَبُر کھلے	تو میں نے دولہے کی طرح ایک
بُرتاں کھلّ ءِ بازُلے راستیں	کنارے کے خیمے کا رُخ کیا جیسے دائیں
بیہتاں کھلّ ءِ اندر دتوک ءَ	طرف سے خیمے کا ایک حصہ کاٹا اور اندر داخل ہوا
واب اِنت براد ءِ مگگ ءِ جن ءِ وندگ ءَ	میں نے دیکھا کہ دوست اپنی بیوی کی آغوش میں گہری نیند سو رہا ہے۔

بالاچ کا اب بھی یہ خیال تھا کہ یہ شخص بیبگر بلیدی ہے جبکہ ایک عام شخص نہیں تھا کہ اُسے آسانی سے مارا جا سکتا۔ وُہ بھی ایک بڑا جنگ باز دلیر اور با ہمت شخص تھا۔ اسی لئے اسے مارتے وقت بالاچ جیسے ایک بہادر شخص کو ہچکچاہٹ ہوئی اور وُہ سوچنے لگا کہ اس پر کون ہتھیار استعمال کرے جو کارگر ثابت ہو اور ایک ہی وار میں اسے ابدی نیند سُلا سکے۔ اسی موقع پہ

پرتردد اور ہچکچاہٹ کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے بالاچ کہتا ہے :-

دستوں براشلیں خنجرءِ بُرتاں	میں نے پہلے اپنے لزکدار خنجر پر ہاتھ ڈالا ۔
کارنہ انت شلیں خنجرِ دھوت ءَ	پھر خیال آیا کہ خنجر اس بہادر پر کارگر نہ ہوگا ۔
دستوں براپولاتیں تبر زرتن ءَ کارنہ انت پولاتیں تبر زرنہار ءَ	پھر میں نے اپنی فولادی کلہاڑی سنبھالی نہیں ! فولادی کلہاڑی کا بھی یہاں کام نہیں ۔
دستوں براسوریں کیسگ ءَ بُرتاں کُشتاں سرحان دا تگیں تیرے	اب میں نے کالے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور سوھان سے تیز کئے ہوئے تھیلے میں خدنگوں میں سے ایک نکالا
بُرز بہا جوڑ زوار ءِ دپائی داتاں پاندی گرں گوڑ ءِ پاندءَ اڑا ایتاں	پھر اسے میں نے تیر پہ چڑھا دیا کمان کی زہ کو میں اپنی چھاتی کے قریب لایا
زور بہاراستیں پنجگ ءَ داتاں	دائیں ہاتھ کے پنجے پہ زور دے کر میں نے اسے کھینچا
درھالگ ءَ سیوائی کمان رنگ سر ءِ لیب ءَ گرں بنجوء شپتگ پھر بہا سیچکانی ءِ نمگ دگپتگ بہلی زمین ءَ چو نیزگ ءَ نشتگ	دھمک سے سیوائی کمان چھوٹی تیر اوپر کی رضائی کو چاڑ پائی کے ساتھ چھیدتا ہوا نیچے (فرش پہ) سچکان کی چٹائی سے گذر کر نیزے کی طرح زمین میں گڑھ گیا
عونی چیچ پنائی دپ ءَ کا تکنت مچ برتاں دبر تچگیں ریش ءَ	خون اس کے ہونٹوں سے ابل کر

اُس کی گھنی ڈاڑھی اور مونچھوں پر
سے بہنے لگا۔

چیر جناں دست ءُ گپتگاں تنگے	میں نے ہاتھ نیچے لے جا کر
	اس کے خون سے چلو بھرا
	اور ایک گھونٹ پی لیا

بالاچ کہتا ہے کہ اس شخص کو مار ڈالنے کے بعد۔ خیمے سے نکل کر میں زیادہ
دُور نہیں گیا تھا کہ: ؎

ھومرءُ بہنادی بجنہ گو انگے	تو مَر نے مجھے ایکطرف سے صدا دی
اوڑ مڑا پانی امرد کُشیں بالاچ!	اے بہادروں کو موت کے گھاٹ
	اتارنے والا بلند حوصلہ بالاچ!
لے دِگہ راجی، لنگریں ھو تیت	یہ کسی اور قبیلے کا سجیلا دیر تھا
ھینپ پہ ساگے ءُ شرکدارت	یوسف کا ہمارے ساتھ شادی کا
	رشتہ تھا۔
تئے بے گناہ ءُ پہ گونڈلاں لستے	تو نے اس بے گناہ کو بلا وجہ خدنگوں
	سے چھید ڈالا۔
گونڈلاں کارتی من جھونگاں گیتہ	ان خدنگوں نے اب مجھے
	اور زیادہ گہری مشکلات میں ڈال
	دیا ہے۔

بالاچ کو یہ سُن کر بہت دُکھ ہُوا کہ بیبگر کے بجائے اُس نے اپنے دوست
یوسف کو مار ڈالا اُسے شک ہُوا کہ ہو نہ ہو یہ حرکت یوسف کی بیوی کی ہے جس
سے یوسف نے شاید راز کی بات کہدی ہو یا یوسف کی باتوں سے اُسے شک

کھا ہو اور اس نے ڈھال چھپادی ہو - بہر حال بالاچ کہتا ہے کہ عوتر کی پکار سن کر :-

پادِن داشتاں دِجوابی گردیناں
میں نے اپنے قدم روک لئے
اور ٹھہر کر میں نے عوتر کو جواب دیا

من نہ کُشت ایلکس وھدِ شئے آتکت
اے عوتر! میں نے اسے نہیں مارا
اُس کی تو قضا آئی ہوئی تھی

پیالہی پُرتِت سرابا نی
اُس کے شراب زیست کا پیالہ لبریز
ہو چکا تھا۔

روزمی بیست بیتت حسابانی
اُس کے گنتی کے دن پورے
ہو چکے تھے۔

ھیبتپ وتی کولانی وت بلا زرتہ
یوسف نے خود اپنا وعدہ پورا نہیں کیا

حال وتی لوگ ءِ دُزرپ ءَ داتہ
اور اس نے اپنی وُرد ہن بیوی کو حال دیا

کے وتی موجانی دِل ءِ حال ءَ
کون اپنے جذباتی دل کے رازوں سے

دنت گوں سیاھار وانگیں مال ءَ
اپنی بیوی کو جیسے کالا ناگ ڈسے
باخبر رکھتا ہے۔

ھوری پہ بیبگر ءَ گہار گنوکیں ءَ
افسوس کہ بیبگر کی دیوانی بہن نے

دزبرتہ برات ءَ وکشارینت جود ءَ
بھائی کو بچا کر خاوند کو مروا دیا

ھیبتپ اُنہلاں من بجہ دتنہا
لیکن اب میں یوسف کو قبر میں
اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔

کئی بیبگر انت، یا جڑیں بالاچ
اس کے ساتھ قبر میں بیبگر ہو گا
یا بالاچ۔

کہتے ہیں کہ اس دفعہ بالاچ بھاگ کر پہاڑوں میں چھپنے کی بجائے اس قبرستان

میں جا کر چھپ گیا۔ جہاں یوسف کو دفن کرنے کے لئے لایا جانے والا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یوسف کا جنازہ لے کر بلیدی قبرستان میں آئے بیبکر بھی جنازہ کے ساتھ تھا۔ بلیدی جب قریب پہنچے تو بالاچ نے جو ایک پرانی شکستہ قبر میں چھپا بیٹھا تھا۔ بیبکر کو تاک کر ایک ایسا تیر مارا جو اس کے دل کو چیرتا ہوا بدن کے پار ہو گیا۔ بیبکر اوندھا گرا اور بالاچ آن کی آن میں بلیدیوں کی پہنچ سے دور نکل گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب بالاچ بھاگا تو بلیدیوں نے جو تیر و کمان سے مسلح تھے اس پر تیر چلائے۔ ایک تیر بالاچ کی ٹانگ پر لگا لیکن اس کے باوجود وہ بلیدیوں سے بچ کر نکل گیا۔ مگر آخیر عمر تک اس تیر کے زخم سے لنگڑاتا رہتا تھا۔

بالاچ نے انتقامی لڑائیوں میں جو اس نے زندگی بھر بلیدیوں کے خلاف لڑیں بڑی سخت تکلیفیں اٹھائیں۔ بھوک اور پیاس کی مصیبتیں جھیلیں اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دشمنوں سے اپنے بھائی کے خون کا انتقام لیا۔ ان جانکاہ مصائب اور تکالیف سے متعلق جو اسے برداشت کرنا پڑیں۔ اپنی ایک مشہور نظم میں کہتا ہے؎

شاکہ سنی بیرگوں دشمناں گارنت	جب سے میرے خون کا انتقام دشمن پر ہے۔
کمبریں گونچاں، من سرءَ بارنت	توشے کے دھاری دار تھیلے ہر وقت مجھ پر لدے رہتے ہیں۔
کمبریں گونچان وکش ءِ کلّی	توبہ! ان دو بندوں والے تھیلوں سے
توبہ چہ گونچان ءُ دو بندیناں	اور ان چار بندوں والے مشکیزے سے
چہ کلّی ءِ چار بنداں. ورد کیناں	جو کالے ناگ کی طرح کندھوں کو
کرنگ ءُ سیاہ ماری جنت کاواں	کاٹتے ہیں۔
چہ نرمعانی جوشندگیں آپاں	توبہ! ندیوں کی تہہ سے رس رس کر

میں جا کر چھپ گیا ۔ جہاں یوسف کو دفن کرنے کے لئے لایا جانے والا تھا ۔ تھوڑی دیر بعد یوسف کا جنازہ لے کر بلیدی قبرستان میں آئے بیبکر بھی جنازہ کے ساتھ تھا ۔ بلیدی جب قریب پہنچے تو بالاچ نے جو ایک پرانی شکستہ قبر میں چھپا بیٹھا تھا ۔ بیبکر کو تاک کر ایک ایسا تیر مارا جو اس کے دل کو چیرتا ہوا بدن کے پار ہو گیا ۔ بیبکر اوندھا گرا اور بالاچ آن کی آن میں بلیدیوں کی پہنچ سے دور نکل گیا ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب بالاچ بھاگا تو بلیدیوں نے جو تیر و کمان سے مسلح تھے اس پر تیر چلائے ۔ ایک تیر بالاچ کی ٹانگ پر لگا لیکن اس کے باوجود وہ بلیدیوں سے بچ کر نکل گیا ۔ مگر آخیر عمر تک اس تیر کے زخم سے لنگڑاتا رہتا تھا ۔

بالاچ نے انتقامی لڑائیوں میں جو اس نے زندگی بھر بلیدیوں کے خلاف لڑیں بڑی سخت تکلیفیں اُٹھائیں ۔ بھوک اور پیاس کی مصیبتیں جھیلیں اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دشمنوں سے اپنے بھائی کے خون کا انتقام لیا ۔ ان جانکاہ مصائب اور تکالیف سے متعلق جو اُسے برداشت کرنا پڑیں ۔ اپنی ایک مشہور نظم میں کہتا ہے ۔

شاکہ سنی بیر گوں دشمناں گا رنت	جب سے میرے خون کا انتقام دشمن پر ہے ۔
کبریں گونچان ، مں سرءَ بارنت	توشے کے دھاری دار تھیلے ہر وقت مجھ پر لدے رہتے ہیں ۔
کبریں گونچان دکش ءُ کلی	توبہ ! ان دو بندوں والے تھیلوں سے
توبہ چہ گونچان ءُ دو بندیا ں	اور ان چار بندوں والے مشکیزے سے
چہ کلی ءُ چار بنداں . وردکیناں	جو کالے ناگ کی طرح کندھوں کو
کرنگ ءُ سیا ہماری جنت کاوان	کاٹتے ہیں ۔
چہ نہ جاہانی جوشند گیں آپان	توبہ ! ندیوں کی تہہ سے رس رس کر

بہنے والے اُس گرم پانی سے جس سے پہاڑی دنبے بھی مجبور ہو کر ایک گھونٹ مشکل پی سکتے ہیں	سیدشں پہ ناکامے گرنت تنگے

لیکن اس کے باوجود جن جوانمردوں کو اپنے دشمنوں سے انتقام لینا ہوتا ہے وہ تکلیفوں اور مصیبتوں کی پرواہ نہیں کرتے بالاچ کہتا ہے : ۔

جن بہادروں کو	
دشمن سے انتقام لینا ہوتا ہے	آمرد کردتی حوناں گرنت
وہ اپنی بیویوں کو تج دیتے ہیں	بیزار جہٗ زالان ءَ کنت
مال و دولت لینے سے انکار کرتے ہیں	انکار جہٗ مالان ءَ کنت
وہ راتوں کو نہیں سوتے	دراهیں شپاں بے واب بنت
بلکہ رات بھر تڑپتے کڑھتے اور	ارمان واپسو زاں درنت
دشمنوں پر دانت پیستے رہتے ہیں	پہ دشمن ءَ نیشاں درشنت
صرف ایسے ہی جوانمرد اپنا انتقام لیتے ہیں	آمردا دتی حوناں گرنت
یا اپنا سر کھو دیتے ہیں	یا هیسی سر ءَ زیاں کنت

بالآخر بالاچ کے آئے دن کی مار دھاڑ سے عاجز آکر بلیدیوں نے سنگسیلہ کے علاقے کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا۔ اُن کا تمام قبیلہ وہاں سے نقل مکانی کر کے زیریں سندھ میں جا کر آباد ہُوا۔ جب سارا علاقہ بلیدیوں سے خالی ہو گیا اور بالاچ کو زور آزمائی کے لئے اُن میں سے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ تب اُس نے ڈوم گویوں کے ذریعے بلیدیوں کو طنزیہ اشعار بھیجنا شروع کئے۔ اسی قسم کی ایک طنزیہ نظم میں بادلوں سے مخاطب ہو کر بالاچ کہتا ہے : ۔

لوداں کہ گوُرِت، سار تیناں
اے ٹھنڈی ہواؤں کے دوش پر سوار
بادلو!

حالان ءَ بُرِت گرمیناں
میرے گرما گرم پیغام لے جاکر

بہ پُشّ ءَ زہجینیں سردار ءَ
بلیدیوں کے تیغ زن سردار کو پہنچا دو

بگو، بمبور ءَ نگو رُھنیوئیں
اسے کہہ دو کہ بمبور کا دامن کوہ
پھر سرسبز ہو چکا ہے

ھنبو انت پما ڈاچیگاں
ڈاچیوں کے لئے ایک عمدہ چراگاہ ہے

بگ و برنگیں مہر و داں
دودھ دینے والی اونٹنیوں اور
اونٹوں کے گلوں کی پرورش کے لئے
ایک بہترین سبزہ زار ہے

لڈی لڈکن و دیما بیا
(سندھ کے) میدانوں سے اُٹھ کر یہاں آؤ

دیما بیا، پما دھاوا ءَ
اور ہم سے لڑنے کے لئے آگے بڑھو!

مگر بلیدی، اب سندھ کی زرخیز و شاداب سرزمین کو چھوڑ کر بلوچستان کے بے آب و گیاہ کوہستانوں میں واپس آنے والے نہ تھے۔ کہتے ہیں کہ بالاچ نے اپنی زندگی کے باقی ایام اکیلے ان پہاڑوں میں گذارے۔ جب بڑھاپے نے اُسے آلیا۔ تو وہ رفتہ رفتہ آنکھوں سے معذور ہو گیا۔ لیکن اس معذوری میں بھی اپنی کمان اور تیروں سے بھرا ہوا ترکش اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جب بلیدیوں کو معلوم ہوا کہ بالاچ منتقم اب نابینا ہو چکا ہے اور اس کا ساتھی اور اُستاد نقیبو بھی مر چکا ہے۔ تو بلیدیوں کے کچھ نوجوان بالاچ کو قتل کرنے سنگیلہ چلے آئے۔ بالاچ کو بھی کسی نے ان کی آمد کی اطلاع دیدی اور وہ اپنا تیر و کمان لے کر بیٹھ گیا۔ بلیدی جب قریب آئے تو بلوچی رواج کے مطابق انہوں نے اندھے بالاچ کو للکارا۔ بالاچ اپنی کمان سے کر اُن کی آہٹ پر تیر چلاتے اور اسی طرح اُس تک پہنچتے پہنچتے سات

...یدی اور مارے گئے۔ آخرکار بلیدیوں نے اُسے جالیا۔ اور تلوار کا ایک ہاتھ مار کر ...ں کے دشمن کے سامنے نہ جھکنے والے سر کو تن سے جدا کر دیا۔

بالاچ کو مرے اب دو صدیاں بیت چکی ہیں، لیکن اس کا نام "بالاچ بیرگیر" یعنی ...لاچ منتقم اب تک چھوٹے بڑے کی زبان پر ہے۔ گوّیے جب شبینہ محفلوں میں بالاچ ...شعار گاتے ہیں۔ تو سننے والے ہر بلوچ کے دل سے اس کے لئے تحسین کا کلمہ نکلتا ہے ...چ نے اس میں کوئی شک نہیں کہ سینکڑوں بلوچوں کو موت کے گھاٹ اُتارا، مگر چونکہ ...ں نے یہ تمام قتل بلوچی ننگداری میں کئے اپنے بھائی اور دوسرے عزیزوں کے خون ...انتقام لیا، اس لئے وہ قابلِ ستائش ہے، بلوچ یہی کہتے ہیں اور خون کا انتقام لینا ...لوچوں کے ہاں ایک مقدس فرض خیال کیا جاتا ہے، جو شخص بہادری سے اپنا یہ فرض ...یالاتا ہے، وہ ان کے ہاں محترم اور باشرف ہوتا ہے،

بلوچوں میں بالاچ کی شہرتِ عام اور قابلِ تقلید کردار کا اس ایک واقعہ سے اندازہ ...یا جا سکتا ہے کہ ایک دن بلوچستان کے خان، میر نصیر خان دوئم، بلوچی شال پر ...کے اور تلوار سجائے اپنی والدہ کے سلام کو گئے، والدہ نے انہیں دیکھ کر کہا۔

"بیٹا! آج تم بے شک بلوچ نظر آتے ہو"، نصیر خان نے جواب دیا! "اماں جان! ...کی بلوچیت پر، بلوچ تو بالاچ تھا۔ جس نے اپنے ایک بھائی کے انتقام میں ستر ...بلیدی مارے۔ لیکن میرے گھر پر انگریزوں نے ...حملہ کر کے میرے باپ (محراب خان) کو شہید کیا اور میں اس کے خون کے انتقام میں ...بھی ایک انگریز بھی نہیں مار سکا ہوں۔"

یہ ہے بالاچ کے کردار کا اثر بلوچوں پر، تبھی تو ایک بلوچ شاعر نے کہا ہے :-

بالاچ ءِ حلال باتنت پھر
اپنی شجاعت اور بلوچیت پر فخر کرنا
صرف بالاچ کے لئے جائز ہے

بلیدیں دشمناں باتنت زھر
اس کے دشمنوں کے لئے نہیں۔

(٢)

حملِ جیئند کی داستان

میر حمل، سردار جیئند خان ہوت کا بیٹا تھا۔ ہوت بلوچوں کا یہ طائفہ چونکہ ابتدائی دور میں بلوچستان کے ساحل سمندر پہ کلمت کی بندرگاہ اور اس کے نواحی علاقے میں آباد تھا۔ اس لئے یہ لوگ کلمتی کہلاتے تھے، کلمت وہ مقام ہے جس کا ذکر مشہور یونانی مورخ ہیرو ڈوٹس کی تاریخ میں بھی ملتا ہے، ہندوستان سے واپسی پر بابل جاتے ہوئے سکندر اعظم اسی مقام سے گذرا تھا۔ جہاں اس کی سپاہ کو پانی کی شدید قلت کا سامنا ہوا تھا۔ بعض لوگ نام ہوت کو یونانی نام ہورنیشی اُس کی بگڑی ہوئی بلوچی شکل کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "ہوت" ان یونانیوں کے پسماندگان میں سے ہیں۔ جو سکندر اعظم کی سپاہ سے کٹ کر اس علاقے میں ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ آباد ہو گئے تھے،

ہوت بلوچوں کا ایک بہت بہادر قبیلہ ہے، ان کی بہادری اور سرفروشی کی داستانیں مشہور ہیں۔ بسا اوقات اُن سے بظاہر بہادری کی ایسی حرکتیں سرزد ہوئی ہیں جن پر غور کرنے سے آج کل کے ایک سنجیدہ شخص کو حیرت ہوتی ہے، اور ان کی حرکتوں میں بہادری کے بجائے جہالت و پاگل پن کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً کلمتی ہوتوں سے متعلق گوہ کے اس واقعہ کو لیجیے جسے بلوچی کے مشہور شاعر، قوت براہیم رخشانی نے بڑے فخریہ انداز میں نظم کیا ہے وہ کہتا ہے کہ:۔

دِشتہ باگارڑے اَچ آگیرڑ ءُ
چوروان جلگر یوھتہ پہ دیما
گُرڈکنان ءُ داں مہتر ءِ لوگ ءُ

مولشیوں کے باڑے سے ایک گوہ نکلی
لڑکے لاٹھیاں لے کر اُس کے پیچھے دوڑے
گوہ بھاگم بھاگ رگاؤں کے ایک معتبر
شخص کے گھر میں داخل ہو گئی ۔

دیمادرکپتہ ، مردمے جوانیں
شرکلانچے چو دشتگیں شیر ءُ

ایک اچھی عورت گھر سے باہر آئی
عورت جو تازہ دوھے ہوئے دودھ
کی مانند سفید تھی ۔

دھولنت ھوشیتیں کلائیاں

اس کے ہاتھوں میں ہاتھی دانت کی
خوبصورت چوڑیاں پڑی تھیں ۔

کیا منّی منّتے کُتی بازیں
چوروان بلاگارا بلہت منی شام آت

اس نے لڑکوں سے التجا کی ؛ ۔
اے لڑکو ! گوہ کو اب جانے دو
وُہ میری پناہ میں آئی ہے ۔

لے انگدر مارا پہ وتی نام انت

اَب یہ میرے ناموس کا سوال بن گئی ہے

مگر لڑکوں نے اس شریف عورت کی بات نہیں مانی اور ڈنڈے مار مار کر گوہ کو اس کے سامنے مار ڈالا ، گھر کا مالک اس وقت سردار کی مجلس میں بیٹھا تھا ۔ اپنی بیوی کا نوحہ وزاری سُن کر وُہ بھاگم بھاگ گھر آیا ۔ بیوی نے سب ماجرا بیان کرتے ہوئے اس سے کہا ،

اگ تو پہ باگارڑ ءَ نہ کُت چیزے
من تئی گہاران و تو منی براتے

اَب اگر تو نے اس گوہ کے لئے کچھ نہیں کیا
تو گویا آج سے میں تیری بہن
اور تو میرا بھائی ٹھہرا

ھوت بہت مشتعل ہوا ۔ اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے اس نے کہا : ؎

گن ہما بگاڑءَ کناں چون ءَ
ذرا صبر کرو اور دیکھو!
کہ میں اس گوہ کے لیے کیا کرتا ہوں

لیے ڈگار شہمی بنّش حون ءَ
تم دیکھوگی کہ یہ زمین
بہت جلد خون سے رنگین ہوگئی ہوگی

تب وہ اپنی تلوار لے کر نکلا۔ بھائیوں، رشتہ داروں اور دوستوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اُدھر سے لڑکوں کے وارث اور دوست و عزیز بھی مسلح ہو کر سینہ سپر ہوئے تلواریں چمک اٹھیں اور بقول شاعر: ـ

ثِہنگو رشست دشاگوڑءَ پنجاہ
اس طرف سے ساٹھ
اور اُس طرف سے پچاس جوانمرد

پھسے باگاڑءَ مزگنت یجّا
اس گوہ کے لیے موت کے گھاٹ اترے

کلمتیوں نے اپنے وقت میں جو کیا سو کیا مگر شاعر کی ذہنیت ملاحظہ ہو کہ وہ اس حرکت کی مذمت کرنے کی بجائے اسے زوردار لفظوں میں سراہتا اور ایک ایسا کارنامہ قرار دیتا ہے جیسا کہ: ـ

ھومرءَ نکشتے اشتہ پہ کئول ءَ
خومر (لوھانی) نے اپنا قول نبھانے میں

سُوری مَیں دَدا ءَ پرا گوکان
بہادر ددا نے پناہ گیر کی گایوں
کی حفاظت کرنے میں

بیرگریں بالاچ ءَ پرا حوناں
اور بالاچ منتقم نے
خون کا انتقام لینے میں جو ابدی نقوش
چھوڑے ہیں
(کلمتیوں کا گوہ کے لیے آپس میں کٹ مرنا بھی
ایک ایسا ہی قابلِ فخر کارنامہ ہے)

(۱) حمل اور شیر کی لڑائی !

میر حمل، ان کلمتی ھوتوں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے کے سردار جیئند کا بیٹا تھا۔ وہ نوجوان بانکا اور انتہائی بہادر تھا۔ سیر و شکار کا شوقین اور عشق و عاشقی کا دلدادہ و شیدا۔ شاعری اس کی گھٹی میں پڑی تھی اور مہم جوئی اس کی خمیر میں اس کے سبک رفتار گھوڑے کا نام سیاہ تھا جس پر سوار ہو کر وہ دُور دُور کے علاقوں اور وادیوں میں گھومتا پھرتا اور عشق لڑایا کرتا تھا۔

کہتے ہیں کہ لس بیلہ کی وادی میں کہیں میر حمل کی ایک حسین و جمیل محبوبہ رہتی تھی مگر ایک عرصے سے میر حمل اس سے ملنے نہیں گیا تھا۔ وہ محبوبہ اس کے انتظار میں تھی کہ ایک دن کوئی بنجارن وہاں آگئی جو ہاتھ کی ریکھائیں پڑھ سکتی تھی میر حمل کی محبوبہ نے اسے اپنا ہاتھ دکھا کر کہا: ـــ

زیت گن اد دسگنداً گندمی دست ءَ	اے ہاتھ کی ریکھائیں دیکھنے والی !
	ذرا جلدی میرا ہاتھ دیکھ
گندمی دست ءَ ودے کن ءُ حال ءَ	میرا ہاتھ دیکھ کر مجھے یہ بتا کہ
دیر گتہ ھرتیں حمل دتیگ ءَ	تیغ زن حمل نے میرے پاس آنے میں دیر کیوں کی ؟
نے ءُ دَت کیت ، نے ءُ مہردے نشتی	اسے ایک مدت ہوئی کہ نہ تو خود آتا ہے نہ اپنا کوئی قاصد بھیجتا ہے
نے ءُ دپ ءُ ھنبوءِ سلامے کیت	اور نہ ہی کسی رہگذر کے ساتھ اپنا پیار بھرا سلام مجھے بھیجتا ہے

دستی گوں پراتی جیڑواں گٹ انت	آیا وہ کسی خاندانی جھگڑے میں پھنسا ہُوا ہے
یا اشرعہ و دیواناں امیر گیں	یا اپنی امیرانہ مجلس میں بیٹھا ہُوا لوگوں کے تنازعات کا فیصلہ کرانے میں اس قدر مصروف ہے کہ میرا خیال اُسے نہیں آتا ؟
یا، دِگردو ستیے کُتہ نوکیں نیمّن وھوران ءَ نہ پاسندی	اور یا اُس نے کوئی نئی معشوقہ دیکھ لی ہے اور اب میری محبت سے دستبردار ہو گیا ہے ؟

بجارن نے اس کا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی میرحمل تو اس کے پاس آنے ہی والا تھا لیکن : ـــ

ذَت کُراسیٔ انت دانشگ ءِ زوراں	خدا جانتا ہے کہ اُسے مجبور کیا گیا اور زبردستی روک لیا گیا
گیشتر ءَ نبم ءِ جُجڑ ءِ وھوران	ساون کی گھٹاؤں اور شدید بارشوں نے اس کا راستہ روک رکھا ہے
کھور مزانت دیمگ ءِ گھرّ ءُ نت	پہاڑی ندیاں طغیانی کا روپ دھار کر شیر ببر کی طرح درمیان میں غرّا رہی ہیں
چہ سرائی چرّیت اندبے ءِ رجُرّنت	در ایسے چھوٹے نالے تو نہیں کہ اُن کے اوپر سے چکر لگا کر گذرا جا سکے

میرحمل کی محبوبہ پھر بھی صبر نہ کر سکی ۔ ایک قاصد کے ذریعے اس نے میرحمل کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی میرحمل کہتا ہے کہ : ـــ

انگک نت پیغام گوں گدا رگیاں	رات کو اس کا پیغام رہگزر مسافروں کی زبانی
گوں شپ ءِ نوذان، الڈگا نیگاں	جھومتے ہوئے بادلوں کی طرح آیا
کوہ سر ءِ کبکاں، کرامگا نیگان	اس محبوبہ کا پیغام جو پہاڑی چکور اور پھول کی کلی کی طرح ہے
لسہ ئیں آھوگی مجا نیگان	اس غزال صحرا کا پیغام ہے جو مجھ سے بہت دور ہے
بانک ءِ مشک و میلبا نیگان	اس بانو کا پیغام جو مشک و مہلبا میں بسی ہوئی ہے
کائنت دنند نت من گو گردگیگ ءَ	قاصد پیغام لے کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا:
دیرکتہ ھوتیں حمل دنیگ ءَ	اے حمل! تیری محبوبہ کہتی ہے کہ تم نے بڑی دیر کر دی۔
من سلاماں چہ جھبتاں رندی	اُس کے سلام پا کر میں رندوں کی طرح اچھل پڑا
ڈکوں دات میان ءَ واڈوں تات ہندی	اور کمر کس کر میں نے اپنی ہندی تلوار باندھ لی
آورتہ ئی ٹو ءَ اسپاہ مزن گواتین	غلام میرے سبک خرام سیاہ (مشکی گھوڑے) کو لے آیا
پاوں رتاسیں دو رواں داتیں	پیتل کی رکابوں میں پاؤں ڈال کر
پشت ءَ ہوش لٹوشیں مہیں [illegible] نشتیں	میں اس کی محمل جیسی آرام دہ زین پر بیٹھ گیا
سیاہ ءُ پہ تازگرانک ءَ لشوں رنتیں	میں نے سیاہ کو ایڑ لگائی
سیاہ چنچاں بیتہ دمن نگرشان ءَ	سیاہ دوڑنے لگا اور میں اپنے خیالوں میں

کھو گیا

مرد دسر کوڑی ءِ شموشان ءِ — ہم دونوں اس جہانِ فانی کو بھول گئے

ہم نے نیلے سمندر کے ساحل کے ساتھ

کپتاں پہ سبزیں ساور ءِ کرّءِ — کا راستہ لیا۔

اور خاموشی سے اپنے وحشی گھوڑے کو

بُزرگاں شیموشی سرو برءِ — اس پر دوڑاتا رہا۔

گھوڑا دوڑتے دوڑاتے میرحمل کو اچانک خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس قدر تیز دوڑانے سے گھوڑا دم توڑ دے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اپنے دل سے کہا کہ اسے

ل مریت مہلنج ءِ بلا زیریت — اگر میرا گھوڑا مرتا ہے تو مر جائے

من مراں بے لول ءِ بہشتیاں — اس ماہ پیکر محبوبہ پر قربان ہو

اگر میں مرتا ہوں تو بھی کوئی بات نہیں

بن بوچھے بہشت میں جاؤں گا۔

مل و مہلنجوں پہ دل ءَ دوست گنت — میرا گھوڑا اور میری ماہ پیکر محبوبہ دونوں

مجھے پیارے ہیں

کمتر ءِ مل دگیشتر ءِ مہلنج — البتہ گھوڑا کم اور ماہ پیکر زیادہ

مجلس ءِ مہلنج پہ شپا فی ءَ — ماہ پیکر محبوبہ رات کی محفلوں کے لئے

مجھے پیاری ہے

اور گھوڑا ؟

مل دی مئے دُکھانی ہنم زیرانت — وہ تو میرے دکھوں کا بوجھ اٹھانے

والا ہے۔

میرحمل کہتا ہے کہ ان ہی خیالات میں گم گھوڑا اڑائے میں چلا جا رہا تھا۔ رات

پہلا پہر تھا۔ چاند نیا نیا پہاڑیوں پر سے جھانکنے لگا تھا کہ اچانک :-

چم جتہ سردان گردیں سیاہ ءُ	میرا ہرن جیسی گردن رکھنے والا گھوڑا بدک گیا۔
دمبی گوں دمچی برتگی برزا	اور اپنی دُم کو دُمچی کے ساتھ اور مُنہ کو ہرات کی بنی ہوئی لگام کیساتھ اوپر اٹھایا
سنی گوں سرد لگاں ھریاں	اب جو میں اُسے ایڑ لگاتا ہوں
پُشترءُ کنزیت ونہ جنت گاماں	تو وہ پیچھے کو ہٹتا ہے مگر آگے کو قدم نہیں بڑھاتا

عمل کہتا ہے کہ اب جو میں نے ذرا غور سے اپنے سامنے دیکھا تو :-

اُرچن وساری سایگے رستہ	مجھے ایک سایہ سا اُبھرتے ہوئے اپنے سامنے نظر آیا۔
من دِل ءُ گوں گشتہ اے بنّی کھنڈے	میں نے اپنے دل سے کہا :- کسی کھیت کا (ریانی سے کٹا ہوا) پشتہ ہوگا
بنّی کھنڈے یا سوھتگیں بندے	یا کسی درخت کا جلا ہُوا تنہ۔ کسی درخت کا جلا ہُوا تنہ ہوگا یا راستے
سوھتگیں بندگ یا راھری سنگے	پر پڑا ہُوا کوئی پتھر راستے پر پڑا ہُوا کوئی پتھر ہوگا
راھری سنگے، یا کوھری مَمے	یا کوئی پہاڑی ریچھ لیکن یہ خیال مجھے کبھی نہیں آیا کہ
چو نزاناں کہ لدھوریں شیرے	وُہ تو ایک قوی ھیکل شیر ہے

شیر نے بھی میر حمل کو دیکھ لیا تھا۔ اب جو تن کر کھڑا ہو گیا تو میر حمل کہتے ہیں ک…
میں نے اپنے دل میں کہا کہ غالباً" :-

شیر جاپرتے اے جاگمیں مردے	شیر یہ سمجھتا ہوگا کہ یہ کوئی ڈرپوک کمینہ شخص ہے
یا شپانکے یا اُشتر چار ینیت	کوئی چرواہا ہے یا کوئی ساربان
یا بلیوءِ جدگالے نز سرجاثمین	یا لس جبیلہ کا کوئی بھولا بھٹکا جگا…
یا جنوزانی جام دیبا نیچے	اور یا پھر کسی بیوہ کا بزدل بیٹا ہے
داتگ اللہ ءَ من ءَ اشپی وردے	جسے خدا نے میری آج رات کی خوراک… کو بھیجا ہے
من گوں جھٹے چوری ءَ کناں گرنے	میں اس چھوکرے کو کھا کر مزے کروں گا
شامے وچاشتے بیت منی دُراہ ءَ	میرے آج رات کے کھانے اور … کے ناشتے کے لیے پورا کافی ہوگا۔
باندا من شگمول باں گوں آسیاہ ءَ	کل کے لئے اس کا گھوڑا پڑا ہے۔

حمل کہتا ہے کہ میں نے بھی شیر کا ارادہ بھانپ لیا۔ تب اپنی مونچھوں پر تاؤ…
دیتے ہوئے میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا :-

ھکلت پُرّ اتین شیر شکاراتی	اے شکار مارنے والے شیر!
من نہیاں دو سواہ بزگلی مردے	اے میرے دوست! سن اور ہوش میں… کہ میں کوئی بکریاں چرانے والا چرواہا نہیں ہوں۔
یا جنوزانی جام دیبں نیچے	اور نہ ہی میں کسی بیوہ کا بزدل بیٹا ہوں میں نوجوان مردوں سے لڑنے والا
من حمل جیئنداں مرد مڑایانی	حمل ہوں۔

ھپت مزن پادینکیں جن ءُ جو داں	پاؤں میں سونے کے کڑے پہننے والی سات بیویوں کا خاوند ہوں
یکے س شال ءَ انت، دومی شیشار ءَ	جن میں سے ایک شال (کوئٹہ) میں رہتی ہے اور دوسری شیشار میں۔
سیمی س مستنگ ءُ بدرنگ ءَ انت	تیسری مستنگ کے ڈھلوانی علاقے میں ہے۔
چارمی، خاران ءُ گدراکان انت	اور چوتھی خاران کے خارزاروں میں
پنچمی، سیوائی کلات ءَ انت	پانچویں، سیوا کے قلعے (قلات) میں رہتی ہے
ششمی، رخشان ءُ ھواریگ ءَ	اور چھٹی، رخشاں کی ہموار وادی میں
ہفتمی، پنجیں ءُ گیابین ءَ	اور ساتویں پنجگور کے سبزہ زار میں ہے
ایشان ءَ من دسیاہ پیکپٹ گوں	میں اپنے سیاہ پر سوار ایک ہی رات میں ان سب کی طرف چکر لگا آتا ہوں
زنگا اہنی کوہ باز کہ نیم شپٔ زین انت	اس وقت، آدھی رات کو جو میں نے اپنے پہاڑی عقاب پر زین ڈالی ہے تو اس لئے کہ
ہوشوں گوں جدگال جنگ ءَ انت	جدگال کی بیٹی کی جانب میرا دل مائل ہے

شیراب میر حمل کیطرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ حمل کا گھوڑا بدک گیا لیکن حمل نے اسے جلد قابو میں کر لیا۔ اور پھر اتر کر اسے ایکطرف باندھ دیا۔ اب میر حمل شیر سے دو دو ہاتھ کرنے کو سنبھل گیا۔ چنانچہ کہتا ہے: ــــ

ھکلّ من کرت، نہرھے شیرءَ

(گھوڑے سے اُتر کر) میں نے ایک نعرہ لگایا
اور شیر بھی گرجا

نہرہءَ سگوزین سئول چنڈ بینتہ
چنڈگءَ درچکانی بر ریچنکنت
من وتی سیا حماریں جگءَ بوتکان

اس کی گرج سے درخت کانپنے لگے
کانپنے سے درختوں کے پھل گرنے لگے
میں نے اب اپنی کالی ناگن جیسی کمان
کا چِلّہ چڑھایا۔

گونڈلاں گیوارتاں جگر دڑیں
پنچ وششءِ بوگوں ھچد ھلّینت
دُراہ مزارءَ من سینگءَ جلّہت

اور جگر کو پھاڑنے والے خدنگوں میں سے
پانچ چھ تیر اُس پر چلائے
شیر نے ان سب کو اپنے سینے پر روک لیا

پانچ چھ تیر کھانے کے باوجود شیر برابر میر حمل کی طرف بڑھتا رہا۔ حمّل کہتا ہے کہ اس وقت میرے پہلو میں لٹکی ہوئی تلوار پکار اُٹھی، اے

جی منی واجہ! مرد مڑایانی
جی منی واجہ! لود مسکانی
دست ءِ لرزنت ودل ءِ نہ سیاھین

اے میرے بلند حوصلہ مالک!
اے میرے مالک مشک کی خوشبوؤں والے!
اگر تیرا دل کمزوری نہ دکھائے
اور تیرا ہاتھ نہ کانپے۔

یکبرے زرزیریں رھاوئیں ٹِیل کے
من پلا ٹاٹی بندگءِ جاءَ
گردنائی کانڈیلی بتر بنیز بیناں
گردنائی کانڈیلی نہ ٹلاّ تاں

بس ایک ہی دفعہ میری مقناطیسی دھار کو
اس کی گردن پر، جہاں دونوں ہاتھوں
کے شانے ملتے ہیں
مار کر دیکھ لے
اگر میں گنّے کی طرح اس کی گردن کاٹ کر نہ
پھینک دوں
تو دہ سیج وریح جو آپ میری کرتے ہیں

نانگ دیتاروں حرام باتنت	اور وُہ صیقل و صفائی جو لڑکیاں آدھی آدھی راتوں کو میری کرتی
نیم شپ ءِ سنگاراں جنکانی	ہیں ۔ مجھ پر حرام ہوں ۔

آخر کار جب شیر نے جست لگائی تو میر حمل کہتا ہے کہ پہلو بچا کر ا ہے

من رتی میاں ءِ حرجتاں ھندی	یں نے اپنے نیام میں سے ہندی تلوار کھینچ لی
پہ ھمانز شیرءِ چگل دا تاں	اور اسے شیر نر کی گردن کے اس مقام پر
گردن گوں گرّی ءِ جڑا ئیتاں	جہاں وُہ سینہ سے ملتی ہے دے مارا
تل گپتیں شیر چو سر کنڈءِ دار ءَ	شیر سر کنڈے کی طرح دو ٹکڑے ہو کر
کپتہ منی لالیں موزگی پاداں	میرے سُرخ موزوں والے پیروں پر آن گرا

میر حمل کہتا ہے کہ میں نے شیر کے پنجے کاٹ کر اپنے گھوڑے کے توبرے میں ڈال لئے تاکہ ا سے

نزا ، لنگرے جنگانی دپ ءَ ریزدنت	کل کو کوئی بازکا
من برتاں و تہتگاں کھندیت	مُنہ پھاڑے اور مونچھوں پر تاؤ دیکر خوشی سے ہنستے ہوئے یہ نہ کہہ سکے
من جتہ بے رژتاں شیر شکاری ءَ	کہ یہ شیر اس نے مارا ہے ۔

الغرض شیر کے پنجے کاٹ لینے کے بعد میر حمل کو اپنی محبوبہ کا خیال آیا جب اس نے وقت معلوم کرنے کے لئے ستاروں کی طرف دیکھا تو بہت پریشان

ہُوا چنانچہ کہتا ہے کہ :-

من نہ زانتاں کہ چوش کنت اللہ	میں نے یہ نہیں جانا کہ خدا ایسا بھی کرتا ہے
شپ کسان انت دبانگ دنت مُلّا	اُفوہ ! رات کتنی مختصر ہے اور میری ماہ پیکر محبوبہ کا گھر کتنا دُور ۔
دیر انت منی مہرنگ گوں گورگیں کہل ءَ	اب تو مُلّا کی اذان ہونیوالی ہے

سیاہ کی آرام دہ زین پر پھر بیٹھ کر حمل نے جب اُسے ایڑ لگائی تو سیاہ ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہُوا اشارے پر چل پڑا اور آن کی آن میں اُسے لس بیلہ کی وادی میں ، محبوبہ کے گھر پہنچا دیا ۔ میر حمل نے شیر کے پنجے اپنی محبوبہ کے سامنے رکھے اور شیر کے ساتھ اپنی لڑائی کا قصہ اُسے سنایا ۔ میر حمل کہتا ہے کہ میری کہانی سُن کر وہ بہت پریشان ہوئی ۔ اور میری بلائیں لیتے ہوئے وہ کہنے لگی :-

ھوسے من باتان اومردمڑ ایانی	ہائے حمل ! نہ میں رہوں اور نہ ہی
نے ءَ من باتان دنے ءَ منی نام بات	میرا نام باقی رہے ۔
ھوسے من باتاں گوں شے کار ءَ	میں نے یہ کیا کیا کہ تجھے
نیم شپی شودھازاں تزاگیستان	آدھی رات کو سفر کرنے کے خطرے میں ڈال دیا ۔

حمل کہتا ہے کہ میں نے اُسے تسلی دی اور پیار کرتے ہوئے اس سے کہا ۔

اے میری ماہ پیکر محبوبہ !

یہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی

ھاشکیں ورنا وشیر شکارانی	ہمیشہ نوجوان عاشق اور شکار ـ

	کے لئے پھرنے والے شیر
دائم ءُ حونگی گورءُ کائنت	خونی دشمنوں کی طرح آپس میں ٹکراتے
	رہتے ہیں ۔
چندی ءُ شیر رُنت شپءِ چرءُ گردان	کئی نوجوان بے آب و گیاہ میدانوں میں
	راتوں کو پھرنے والے شیروں کا
چاڑی ءُ ورنا ئنت شیر شکارانی	شکار بنتے ہیں ۔
	اور کئی شیر، نوجوانوں کا شکار
پٹ ءُ بے رودناں بیتگنت گاڑی	ہوتے ہیں ۔

جب سپیدہ سحر نمودار ہوا تو میر محل نے اپنی محبوبہ کو الوداع کہا اور پھر اسی راستے پر روانہ ہوا جس سے رات کو آیا تھا۔ میر محل کہتا ہے کہ جب میں اسی مقام پر پہنچا جہاں میں نے رات کو شیر کو مارا تھا۔ تو میں نے دیکھا کہ : ؎

کرنداں شیر من گچین ءُ ایرانت	شیر پتھروں پر الٹا پڑا ہے
موری من ھنگانی رپ کرپچ انت	چیونٹے اس کے منہ میں جمع ہو چکے ہیں
شیر نہ وارت مارکل ءُ دپ گوراں	شیر اب پھر کبھی
	مارکل کے جنگل کے گوروں
بیلہ ءُ پچل و ہیں گیا نچوان	بس بیلہ کے پچل دُم گالیوں
بسریں سرواناں سگاریناں	اور موٹے تازے ہرنوں کا شکار نہیں کریگا

میر محل کہتا ہے کہ اب میں نے : ؎

کشتاں تیراں یک یک ءُ	ایک ایک کر کے اپنے تیر (شیر کے سینے سے)
جاہ ءُ پر پیغاں کشکی ءُ	نکالے۔ نکال کر ان کو اپنے ترکش میں ڈالا
بنت من ءُ دسگیر پیچے سکی ءُ	شاید کسی دن ضرورت کے وقت
	پھر میرے کام آئیں ۔

(۱) میر حمل اور چاکر کہدائی کی نوک جھونک

بلوچ شعراء کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں جب کہ حمل جیئند بلوچستان کے ساحلی علاقے میں اپنی جوانمردی و سخاوت اور بے باکی و بانکپن سے نام پیدا کر چکا تھا کولواہ کے میدانی سبزہ زار میں چاکر نام کا ایک کہدائی نوجوان بھی بڑی تیزی سے اُبھر رہا تھا۔ اس دَور کے ایک شاعر نے حمل جیئند اور چاکر کہدائی کی تعریف اس طرح کی ہے ؛ ؎

منُ نہیاں مہلوم ، گو ہُشت من حلکاً	مجھے نہیں معلوم مگر، لوگ اس طرح کہتے ہیں کہ :۔
حمَل یک ھوتے منُ کلمت ءِ کھلاں	حمل کلمت کے گھرانوں کا ایک ھوت تھا
چاکر یک رندے منُ کولواہ باگیں	اور چاکر کولواہ کے سبزہ زاروں کا ایک رند
حمل ءِ نام ءُ لانگوی کہتگنت	حمل کے پاس بھی گویے اور شاعر آتے تھے
زیادہ یکیں تشریپ چاکر ءِ داتنت	مگر زیادہ قصیدے وہ چاکر کے پڑھتے تھے۔
حمَل ءُ زنگباری زباد مُشتنت	حمل کو اگر زنجبار کی زباد سے تشبیہہ دیتے

چاکرءُ دارائی کبا پوشتنت ہمل ءُ جتاں اُڑا چیاں دشتنت	(چاکر کو شاہانہ قبا پہنا دیتے تھے ہمل اونٹنیوں کے گلوں کا مالک تھا اور ۔۔۔ کے ساربان اونٹنیوں کا دودھ دوہتے تھے۔
چاکرءُ ٹینگان گراھنگاں کشتنت	چاکر ایک زمیندار تھا۔ اس کے غلام جنگی بیلوں کو کاٹ کر (مہمانوں کو کھلاتے تھے)
ہمل ءُ بوجیگ سی زرءَ تہنت چاکرءُ جفتاں کیلگاں کشتنت	ہمل کی کشتیاں سمندر میں چلتی تھیں چاکر کے بیلوں کے جوڑے کھیتوں میں ہل جوتتے تھے۔
ہمل ءُ پنچ سد مردِ جنگیگت	ہمل کے ساتھ پانچ سو لڑاکے افراد تھے۔
چاکرءُ کولواھی ھزار گشت ہمل ءُ ترکی تیگ ابر لانکت چاکرءُ کرمانی گراں بہا تُت ہمل ءُ گون ئت. سیاہ مزن گواتیں	چاکر کے کولواھی ہزار سے زیادہ تھے ہمل کی کمر سے ترکی تلوار بندھی تھی چاکر کے پاس گراں قیمت کرمانی تلوار تھی ہمل کے گھوڑے کا نام سیاہ تھا جو ہوا کے تیز جھونکوں کی مانند خوش خرام تھا۔
چاکرءُ گون ئت. گور کشیں سوگہات	چاکر کے گھوڑے کا نام سوغات تھا جس پر چڑھ کر وہ گورخروں کا شکار کیا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چاکر کہدائی بھی میر حمل کی طرح شاعر[illegible] پر دسترس رکھتا تھا۔ لیکن حمل میں جہاں مردانہ حسن و ملائمت اور خلق و شرافت [illegible] اس کے برعکس چاکر میں گھمنڈ، خود پرستی و خودستائی تھی یہی وجہ تھی کہ میر حمل کی شہ[illegible] و ناموری کی داستانیں سن کر اس کے دل میں میر حمل کے خلاف بغض و حسد [illegible] جذبہ پیدا ہوا اور اس نے ہر محفل میں بیٹھ کر میر حمل پر طنز و مزاح کے تیر چلا[illegible] اپنا شعار بنا لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ چاکر نے ایک نظم کہی اور ایک ڈوم [illegible] کے ذریعے اُسے میر حمل کے پاس بھجوا دیا۔ اس نظم میں بادلوں سے خطاب کرتے ہوئے چاکر کہدائی کہتا ہے: ـــ

کندھار ءِ سیاہ بزین لزوراں	اے قندھار کی طرف سے اُٹھنے والی گھنگور گھٹاؤ
پُٹھی بیایت سُں دپ رھیں کوٹاں	جھوم جھوم کر میرے مضبوط قلعے کے اوپر آؤ
کئے اِنت ھمامرد کہ بارت منی دروتاں	کون ہے وہ شخص جو کلمرت کے عبدحوصلہ ھوتوں کے پاس
گوں مڑادارین کلمتی ھوتاں !	
کلمتیانی پھُلّ و شاھیگ ءَ	بالخصوص کلمتیوں کے اس خوبصورت
ھوتانی اوساپیں بستاھیگ ءَ	اور بادشاہ صفت نوجوان کے پاس جا کر
حمل جیئند ءَ سلام سر کنت	ھوتوں کی اس قابل تعریف شخصیت کو حمل جیئند کو میرا سلام پہنچا دے
پُر سر دارت شاریں تیرگ ءِ داناں	اور بعد از سلام اسے کہہ دے کہ
زوش زکنت کھنڈی تزدنگیس آبان	اے حمل ! میرا گھوڑا اپنے رکھی
	تو برے کے دانے نہیں کھاتا۔

	اور نہ کنوؤں کا برف جیسا ٹھنڈا پانی پیتا ہے،
گوں گنلاماں، پہ نگد حاں جیڑیت	چمکارنے پر میرے غلاموں پر بگڑ جاتا ہے۔
گُندمان جنت گوں گلڑیں وستاں	زمین پر، اپنے گول گول سموں سے ٹاپیں مارتا ہے۔
پرتیٔ لگانی گمّ ءَ بجیت	اور تیرے اونٹنیوں کے گلے کے غم میں بے چین رہتا ہے۔
لگ تیٔ گزدان ءَ گیابین ءَ	تیری اونٹنیوں کے گلے گزدان کی چراگاہ میں چرتے ہیں
من تیٔ لگ ءَ را برنبیاں ان	وہ (میرا گھوڑا) اس انتظار میں بے قرار ہے کہ کب میں تیری اونٹنیوں کے گلوں کو بھگا کر
لسّ ءِ تاں چیری دامن ءِ کولات	لس بیلہ کے نچلے دامن کی پہاڑیوں کی طرف لے جاؤں
منتّ من بان وچابک ءِ شیرازی	میں ان کا ساربان بنوں اور میری شیرازی تلوار ان پہ چابک کا کام دے۔
کن وتی مزری ءَ تہ پہریزاں	یقین جانو کہ میں اپنی تلوار کو تیرے ساربانوں کی پیٹھ اور
بیٔ بردست وڈاچگی کپتان	تیری اونٹنیوں کے پہلوؤں پر پڑنے سے

کبھی نہیں روکوں گا

ڈاچی چہ کپتان حون دیئنت ذگرین	تیری اونٹنیوں کے پہلوؤں اور تیرے سار بانوں کی پیٹھ سے تازہ اور گرم اسرخ خون بہتا رہے گا
جت چرابردستاں تنکیناں	اگر تم میرے مقابلے کو آنے کی جرأت کروگے
چیبر ٹپو میںٹانی چہ ٹوہت گراں	تو تیل سے چکنے کیے ہوئے تمہارے سر کو بھی کاٹ کر
من دتی زیان ءَ گوئر ءَ بندان	میں اپنے گھوڑے کے گلے میں باندھ دوں گا۔
من دتی اوتاک ءِ پیشدر ءَ درنجان	اور پھر اُسے اپنے دیوان خانے کے دروازے پر لٹکا دوں گا۔
مٹ انت تخلار یگیں نکیب ٹُک ءَ	تم عوض ہوگے میرے اُس غلام زادے کا
اوداں من تیسی بندرن ءَ کُشتہ	جسے تم نے تیز کی بندرگاہ پر مار کر
سری من داد رریاں چگل حاتے	اس کا سر نمک کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا۔

ڈوم نے اجیسا کہ اس زمانے کا دستور تھا۔ چاکر کہدائی کی نظم لے جا کر میر محمل کو سنادی۔ میر محمل نے بھی اس کا جواب نظم میں کہہ کر اپنے ایک ڈوم کے ذریعے چاکر کو بھیجا۔

میر محمل نے کہا:—

سَڈُوں کاٹھتو اَچ ھسدِ لیگان
سڈی گوں لوڑاں کندھاریگان

دشمنوں کے پیغام آئے ہیں
دشمنوں کے یہ پیغام قندھار سے
اُٹھنے والی گھنگور گھٹاؤں کے ساتھ
آئے ہیں۔
وہ چاکر شہروں میں گھومنے پھرنے
والے ڈوم گویوں کے ساتھ
اپنے بلوچ بھائیوں کے نام طنزیہ
اشعار بھیجتا ہے۔

گوں وتی وَت براتاں بلوچیاں
شیرگوں آ شہرگولیں ڈھگانزیان
چاکر! اونا جاتیں سراوانی!!
دار دتی بے آہیں وپ پہیران
من نہیاں ناوزینگے گوکی

چاکر! اے کم ذات سراوانی!
اپنا بے شرف منہ سنبھال
میں نہ کھجور کا دانہ ہوں اور
نہ ہی گائے کا مکھن
نہ میں گندم کی اچھی پکی ہوئی روٹی ہوں
اور نہ ہی ریشمی گدوں پر بیٹھنے والی
کوئی لڑکی۔

گنداگ پروشں پچیں پھرانیے
نہ جنگے گوں ریشمیں بوپان

نہ ہی کارسے دگرگرے بوسے ۲

کہ تو مجھے آغوش میں کھینچ کر اس
کا بوسہ لے سکے

من ہمل جیئندان مڑابانی

خیال کر! کہ بلند حوصلے والا ہمل
ہوں جیئند کا بیٹا:-

بگ چریت گزوان ءِ گیابین ءَ

میری اونٹنیوں کے گلے
واقعی گزدان کے سبزہ زار میں چرتے

اپی چرہ حونیں للہ ءِ چاھتی
ڈاچی پچہ ماکولءِ کرءِ بندنت

اور للہ کے کنوئیں سے پانی پیتے ہیں
ماکول سے میری اونٹنیاں قطاریں باندھتی

ڈِشنگ بنت میش مرگی برے ڈلّاں
اور چراصلوں کی طرح میدان میں پھیل جاتی ہیں ۔

بلے، ڈاچی گوں سُھو چمیں بوجیاں کنت
مگر خیال رہے کہ میری اونٹنیوں کے ساتھ سرخ آنکھوں والے بوچ بھی ہوتے ہیں

آسنک، گامیں بوری ساچان کنت
جن کے سبک خرام گھوڑوں کا اونٹنیوں پر سایہ رہتا ہے
تم بے شک ،

چہ بسول ڈاچیگاں برنبیتے
بسول سے میری اونٹنیاں بھگا کر لے جاؤ ۔
لیکن ایک کام ضرور کرنا

لاگھریں جتّاں دست پچ ءِ بلّے
کہ ان کے کمزور ساربانوں کے ہاتھ کھلے چھوڑ دینا ۔

گوں وت وپُروتاں گور منءِ بیایانت
تاکہ وہ اطلاع دینے مجھ تک آسکیں تب، ایک لمحہ ضائع کئے بغیر

من تہ بنزان و ریخ کناں سیاہ ءَ
میں سیاہ پر زین ڈال دوں گا اور بہت ہی جلد دوڑاتے ہوئے تیرے پیچھے آؤں گا ۔

پہت تیءِ بمبگیں پدانءَ مبان
پھر ہم دونوں ایک چٹیل میدان میں ٹکرائیں گے ۔

ڈیک دیوں یادتو برہنگیں ڈٹّے
جو لشکر ہمارے ساتھ ہوگا ان کے لئے طلاق کی قسم ہوگی جو

لشکرءِ مردانءِ جن تلاک سوگند
وہ ہمارے درمیان میں بیٹھیں

سیاہءُ گوں سوگاتءَ دیاں کُستی	صرف میں اپنے سیاہ کو اپنے ساتھ لگا کر تیرے سوگات کی طرف بڑھاؤں گا
مار تو ھمپہ زانگ و دُرستی	میں اور تو : ہم دونوں جانے پہچانے شخص ہیں
پُشت کنے لوٹانہت بگار بناں	اگر پیٹھ پھیر دگے تو تیرے ٹکڑے اُڑا دوں گا۔
دیم کنے ھلق ءَ من سرانت پرشاں	اگر آگے بڑھو گے تو آھنی خود کو تیرے سر پہ توڑ دوں گا۔
چیر دیاں مزری ءُ بردکین ءَ	اور اپنی مصری تلوار کو تجھ میں اس طرح گھونپ دوں گا کر
ڈنگھت گوں جاڑیں گنگاں زیریت	تیری کمر کو دونوں گردن سمیت کاٹ دے
گردنہت کانڈلی بتر بنیر بیاں	پھر میں تیری گردن کو گنے کی طرح کاٹ کر
ٹرنپ و دو گھوریں چو لوٹھیت براں	کھٹی لسی سے دھوئے ہوئے تیرے سر کو
ئی دتی سیاہ ءِ گردن ءُ بنداں	اپنے سیاہ کے گلے میں لٹکا دوں گا
سیاہ ترا سر کونڈی بجنت ریش ءَ	تا کہ سیاہ کے گھٹنے تیری ڈاڑھی سے لگتے رہیں۔
ئی دتی لوک ءِ پیشدرا ئی درنجاں	پھر میں اُسے اپنے گھر کے دروازے پر لٹکا دوں گا۔
گندگانی کانت کلت ءِ بی بی	کلمتیوں کی بیگمات اُسے دیکھنے کو آئیں گی۔
گندنت وشا باسو لوئینت بازیں	اور مجھ پہ آفریں کہیں گی کہ کس خوبی سے
گردن ءِ حد ءَ برگ تیگ ءَ	میری تلوار نے گردن کی حد سے تیرا سر کاٹ کر جدا کیا ہے

ئے منی چُک تراتیں کپوتی ءِ	تم عوض ہو میری اس چھوٹی کنیز کپوتی کا
او داں مں لُپتان ءِ سرءَ کُشتے	جسے تم نے کھیتوں میں مار ڈالا تھا

شاعر کہتا ہے کہ ایکدفعہ ایسا ہوا کہ حمل جیئند اور چاکر رِند کا، گزدان کے مقام پہ اچانک ایک ایسی پہاڑی ندی پر آمنا سامنا ہوا۔ جو سیلاب کے پانی سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ ندی کے ایک طرف چاکر رِند اپنے سوگات پر سوار کھڑا تھا۔ اور دوسری طرف حمل جیئند اپنے سیاہ پر سوار اُسے دیکھ رہا تھا۔

شاعر کہتا ہے اسے

حمل ءَ توار پہ چاکر ءَ داتگ	میر حمل نے چاکر کو آواز دی
مَل ءَ گوازینے کہ سیاہ ءَ گوازیاں	چاکر! اپنے گھوڑے کو ندی سے پار کردگے؟ یا میں سیاہ کو پار نکال لاؤں؟
چاکر ءَ جواب پہ حمل ءَ داتگ	چاکر نے حمل کو جواب دیا۔
تو بدار سیاہ ءَ من مَل ءَ گوازیاں	تم اپنے سیاہ کو روک لو! میں اپنے گھوڑے کو ندی سے پار کراؤں گا
چو ردی پادگنزگ من ءَ عیب انت	کیونکہ لڑکوں کی طرح پیچھے ہٹنا میرے لئے عیب کی بات ہے
داگی رُپتنت پہ حکم رحمان ءَ	خدا کے حکم سے اس نے اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر ... سوگات نے اچانک جو جست لگائی
جہنگ سوگہات ءَ اناگاہ ءَ	تو اس کے چندن کا زین چرچرا اٹھا
چیکگے زرتنگ چندنیں زین ءَ	مگر سوگات ندی کے گہرے پانی کے بیچ میں گر کر
کپتگ مں چیل ءِ جہل بنیں آپ ءَ	لیلڑے کی طرح ڈبکیاں کھانے لگا
چوپٹ ءِ بٹیگاں ورداں جتگ	

چاکر سوگات سمیت اپنے دشمن کے سامنے اس طرح پانی میں گر کر ڈبکیاں کھانے سے بہت نادم ہوا ۔ بہرحال جب وہ بمشکل جان بچا کر پانی سے باہر نکلا ۔ تب میر گہرام ... نے اُسے آواز دی ۔ سے

پادا چاکر! ترا گار کتگ سوگھات	اُٹھ لے چاکر! اگر تیرے گھوڑے نے تو
	تجھے مروا ہی ڈالا تھا ۔
... ترا کشتگ بلے من ترا اِشتگ	لیکن میں نے تیری جان بخش دی
	اب اپنے گھوڑے کے چندن کی
... سواربی اِنیں چندنیں زین ءَ	زین پر سنبھل کر بیٹھ جا
	اور دیکھ کر میں سیاہ کو کس طرح
... نیں بدار مُل ءَ من سیاہ ءَ گوازینیاں	پار اُتارتا ہوں ۔

شاعر کہتا ہے کہ اب میر گہرام نے اپنے سیاہ کو جو ایڑ لگائی تو ۔ سے

ہچنگ سیاہ گوات یک اُناگاہ ءَ	بگولے کی طرح سیاہ اُٹھا
چیگلے زرنگ چندنیں زین ءَ	اور اس کی چندن کی زین چرچرائی
شور گران ءُ ست چو ماھلیں گور ءَ	وحشی گورکی طرح اس نے چھلانگ لگادی
شپ گران ءُ ست چو فسہ بُیں مار ءَ	اور سانپ کی طرح بل کھاکر
گپتگ چل گز ءَ ھمے دیما	چالیس گز ندی کے اس پار جا پہنچا

کہتے ہیں کہ چاکر نے اس دن میر گہرام کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنی شکست مان لی ۔ اس دن کے بعد اُن میں پھر کوئی نوک جھونک نہیں ہوئی ۔ شاعر کہتا ہے کہ اس دن کے بعد سے ۔ سے

گہرام ءِ نام ءُ سار ءِ وڑ ءَ بیتہ

گہرام کا نام سُن کر مندر پار پہنچا
مگر چاکر کا نام

چاکر بہ نام ءَ گنگیں آدینکان
آئینوں میں گونگے کی طرح رہا۔

(۳) میر حمّل اور پرتگیزوں کی لڑائی

بلوچی روایات میں حمّل جئیند کو شہرتِ دوام اس لئے حاصل نہیں ہوئی کہ اس نے کسی جنگل میں ایک شیر مارا، یا اپنے حریف چاکر کہدائی کو ندی پرے گھوڑے کدوانے میں ہرایا۔ بلکہ بلوچستان کی تاریخ میں اُسے ناموری اور دوامی شہرت اس لئے حاصل ہوئی کہ وہ مادرِ وطن کے دفاع میں بیرونی حملہ آوروں کے خلاف لڑتے لڑتے شہید ہوا۔

غالباً سولہویں صدی کا زمانہ تھا کہ جب بحرِ ہند اور خلیج فارس میں پرتگیزی بحری قزاقوں کی جنگی کشتیاں لوٹ مار کے لئے بادبان اُٹھائے پھرتی تھیں۔ ان فرنگی بحری قزاقوں نے بلوچستان کے ساحل پر جیونی۔ گوادر۔ پسنی اور ماڑہ اور سونمیانی کی بندرگاہوں پر پے در پے کئی حملے کئے۔ شہروں کو لوٹا اور آگ لگا کر چلتے بنے خلیج فارس میں عربوں۔ ایرانیوں اور بلوچوں کی کئی تجارتی کشتیاں ان کے ہاتھ چڑھ چکی تھیں اور کئی ساحلی بستیاں کئی بار ان کی لوٹ مار اور غارت گریوں کی نذر ہو چکی تھیں

ان دنوں جب کہ پرتگیزی بحری قزاقوں نے خلیج فارس میں اودھم مچا رکھا تھا۔ حمّل جئیند بلوچستان کے ساحلی علاقے کے بلوچوں کا سب سے بڑا سردار تھا۔ اس کی تجارتی کشتیاں زنجبار۔ عدن اور بصرہ وغیرہ بندرات پر تجارت

کے لئے آمدورفت رکھتی تھیں ۔ جب پرتگیزی قزاقوں کی جن کو بلوچ عام طور پر فرنگی کہا کرتے تھے ۔ لوٹ مار کے واقعات حد سے بڑھ گئے ۔ تو میر حمل نے ان فرنگی قزاقوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کا تہیہ کر لیا ۔ اس نے اپنی بلوچی ساخت کی چند کشتیوں کا ایک جنگی بیڑہ بنایا ۔ دو چار دفعہ فرنگیوں کے ساتھ اس کی ڈھیڑ بھی ہوئی جن میں ہر بار فرنگی قزاقوں کو منہ کی کھانی پڑی ۔ پرتگیز دل کی کئی توپیں بھی حمل جیئند کے ہاتھ آئیں جن میں سے ایک دواب تک گوادر کی بندرگاہ میں یادگار کے طور پر پڑی ہوئی نظر آتی ہے ۔ اس کے علاوہ کئی پرتگیزی کشتیوں اور ان کے فرنگی عملے کو بھی میر حمل نے گرفتار کر لیا ۔

بلوچ کہتے ہیں کہ بالآخر فرنگیوں نے میر حمل سے صلح کر لی ۔ اُن کے درمیان ایک عہد نامہ ہوا ۔ جس کی رو سے فرنگی قزاقوں نے پھر بلوچستان کے ساحل پر لوٹ مار کرنے سے باز آنے کا وعدہ کیا ۔ تب میر حمل نے ان کی جنگی کشتیوں اور فرنگی عمال کو جو اس نے گرفتار کئے تھے رہا کر دیا ۔

حمل جیئند ایک بلوچ کی طرح اپنے قول کا سختی سے پابند رہا ۔ اور پرتگیزی قزاق بھی کچھ عرصہ خلیج فارس سے دُور رہے ۔ اس دوران میں حمل جیئند اور دوسرے بلوچ ناخداؤں کی تجارتی کشتیاں خلیج فارس ۔ بحر ہند اور افریقہ کی بندرگاہوں میں بے دھڑک آتی جاتی رہیں اور ساحلی بستیاں پھر سے آباد ہونا شروع ہوئیں لیکن چند سال بعد فرنگی قزاقوں نے ایک دن اچانک حملہ کر کے میر حمل کو جو ایک کشتی میں جا رہا تھا ایک مختصر لڑائی کے بعد گرفتار کر لیا ۔

اس واقعہ کو میر حمل کی بہن نے اس طرح بیان کیا ہے : ۔

شنبہ عوریچ ءِ سر شودءَ براتانی گہار	اے بھائیوں کی بہن ! ہفتے کے دن اور مہینے کی سولھویں تاریخ کو اپنا سر کبھی نہ دھونا
شنبہ ءِ پیران ءُ شر ءِ سات شانز دہ ءِ پہ ...	کیونکہ ہفتے کا دن بھائی کے لئے

شبہ رُت روچ وماہ ھما شُومیں حکرت — اور سولھویں تاریخ باپ کے لیے نحس ہے

وُہ بھی ہفتے کا دن تھا اور چاند عقرب

کے بُرج میں تھا

شبہ ءِ روچ ءَ حمل ءَ شاگے لوں کتگ — جب حمل نے ایک کشتی لی اور سفر

پر روانہ ہوگیا)

حمل مُن شاگ ءُ شاگ بما سبزیں جادرءِ — حمل کشتی میں بیٹھا اور کشتی نیلے سمندر میں

ھپت شپ ھپت روچ شاگ لمایک گوشءَ شتہ — سات راتیں اور سات دن ایک ہی

سمت میں چلتی رہی ۔

جب آٹھویں دن کا سورج طلوع ہوا تو حمل کو فرنگیوں کی جنگی کشتیاں

نظر آئیں : ـــ

چار گُراب رُت گوں مُرگی پروکیں بانزُران — چار جنگی کشتیاں تھیں

جن کے گھومنے والے بادبان پرندوں

کے پروں کی طرح پھیلے ہوئے تھے

حمل ءِ شاگش چپ و چپ گردءَ گپتگنت — انہوں نے حمل کی کشتی کو چاروں

طرف سے گھیر لیا ۔

اور اُسے للکارا

نوارش پہ کرت کہ ماترا دستگیرءَ کنوں — اے حمل ! ہم تجھے گرفتار کریں گے

حمل نے جب کشتی میں بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا تو وُہ سب حوصلہ ہار چکے تھے ۔ کیونکہ وُہ لڑاکے بلوچ نہ تھے ، کچھ ملاح اور کچھ تاجر تھے جو تجارتی کاروبار کرنے دُور کسی بندرگاہ کو جا رہے تھے

اس لیے شاعرہ کہتی ہے ۔ ـــ

حمّل ءِ ھمراہ بے دلیں ڈشتی بنگنت

حمّل کے ساتھی
ایک تو بزدل دشتی تھے
جو گرز کے انگاروں کی طرح بجھ گئے تھے
اور دوسرے ملّاح تھے۔

جانش چو گزی اشکرءَ بے برانز بنگنت

آدگہ میداں اِلکّلی اورانے کننگ

جو بھاگنے کی تیاری کر رہے تھے۔
(جب لڑائی شروع ہوئی تو)

سیاھرو ِ سیاھیں میدزرءِ گپ گنگت

وہ منھ کالے ملّاح سمندر میں کود پڑے

من دپ و ریشاں سادرءِ موجاں گیتگنت

اُن کے چہروں اور ڈاڑھیوں پر
سمندر کا جھاگ پھیل گیا

حمّل اب اکیلا رہ گیا لیکن پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی اصفہانی تلوار نکال کر فرنگی قزاقوں پر ٹوٹ پڑا یہاں تک لڑا کہ اس کی تلوار ٹوٹ گئی۔ اس وقت شاعرہ کہتی ہے کہ اس نے اپنی تلوار سے مخاطب ہو کر کہا ــ

تیگ سپاھانی من ترا بچی پیاستنگ

اے میری اصفہانی تلوار!
میں نے تجھے اپنے بیٹے کی طرح پیار کیا

من ترا بچی پیاستنگ دوریں دختگی

بیٹے کی طرح تجھ سے پیار کر کے
لاڈلی بیٹی کی طرح میں نے تیری حفاظت کی

ھورانی دھدءَ گجریں بوپانی تلءَ
نمبانی دھدءَ من کباھاں ابریشمیں

بارش کے موسم میں
میں نے تجھے ریشمی گدّوں میں رکھا
اور کہر کے دنوں میں
میں نے تجھے اپنی ریشمی قبا میں چھپایا
لیکن آج تو نے
مجھ سے دغا کی)

نوروک نہ بیتے مں کاپرءِ جوڑیں گردن ءَ — کافروں کی گردنوں پر تو اس طرح نہیں جھکی - جس طرح تجھے جھکنا چاہیئے تھا۔

اَچ منی شیری پنجگ ءَ پرچے درشتے — اور پھر تو ٹوٹ کر میرے شیر جیسے پنجے سے نکل کیوں گئی ؟

سُہ زرءِ گُپ ءَ کپتگ ءِ ھپت پستی نشتے — اور سمندر کی گہرائیوں میں گر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے جُدا کیوں ہوئی ؟

میر حمل کی تلوار ٹوٹ کر جب اس کے ہاتھ سے گر گئی - تو اس نے اپنی کلہاڑی سنبھال لی لیکن کلہاڑی بھی تھوڑی دیر بعد کشتی کے سکّان پر لگ کر لکڑی میں دھنس گئی اور جب حمل نے نکالنے کو اُسے کھینچا - تو کلہاڑی کا دستہ بھی ٹوٹ گیا - اس پر کفِ افسوس ملتے ہوئے حمل نے کہا :-

زیادھیں تاوانے مں ءَ سکّان ءَ دات — مجھے کشتی کے سکّان نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا - اس میں پھنس کر

منی تبرزین چہ نگرھیں میخاں درشتہ — میری کلہاڑی چاندی کے کیلوں سے نکل گئی ۔

جب میر حمل نہتا ہو گیا تو فرنگی قزاقوں نے آگے بڑھ کر اُسے گرفتار کر لیا -

شاعرہ کہتی ہے :-

حمل ءِ دست گوں کمبریں ریزاں بستگنت — انھوں نے دھاری دھار رسّوں سے حمل کے ہاتھ باندھ دیئے !

دھاری دار رسے

کمبریں ریزپولیڑھی ھشت گزیں مہار
جو مست سانڈوں کی آٹھ گز لمبی والی مُہار کی طرح تھے۔

کمبریں ریزپو کمبریں مار ءَ داتگنت
دھاری دھار رسے۔ جو دھاری دار سانپوں کی طرح اس کے ہاتھوں کو کاٹتے تھے۔

حونی شہزان ئنت چہ بزرگی مہر دانگان
اُس کی خوبصورت انگلیوں میں سے خون بہتا تھا۔

کہتے ہیں کہ میر حمل کو گرفتار کرکے فرنگی اپنے وطن لے گئے۔ اس نظم میں فرنگیوں کے وطن کی جو تعریف کی گئی ہے اس سے ایسا لگتا ہے کہ جس شہر کو ہماری بلوچ شاعرہ فرنگیوں کا وطن کہتی ہے وُہ غالباً یہیں کہیں ہندوستان کے ساحل پر ان کی کوئی نوآبادی ہوگی۔ فرنگی عورتوں کے لباس کے متعلق شاعرہ نے جو تشریح کی ہے۔ وُہ گوا۔ دمن۔ دیو وغیرہ ساحلی علاقوں کی عورتوں کا لباس معلوم ہوتا ہے بہرحال شاعرہ کہتی ہے کہ اپنے وطن لے جاکر فرنگیوں نے میر حمل سے کہا کہ وُہ ان کی کسی لڑکی سے بیاہ کرے تاکہ ان میں بھی اس جیسے بہادر پیدا ہوں لیکن ←

جن پرنگانی حمل ءَ پاسند نہ بنت
فرنگیوں کی عورتیں حمل کو پسند نہیں آئیں

پشکش گو ننڈت ونا پگانی کنڈش درنت
کیونکہ ان کی قمیصیں چھوٹی ہوتی ہیں

جناں ھور دُنت و مردش بے دینیں کافرنت
اس قدر چھوٹی کہ اُن کی ناف نظر آتی ہے
فرنگی عورتیں مُردار اور ان کے مرد بے دین کافر ہیں۔

نے دیم شودنت دیے کھدائی نام ءُ گرنت — وہ نہ تو ہاتھ منھ دھوتی ہیں اور نہ ہی خدا کا نام لیتی ہیں

چُکش ہی کُٹ ءُ رُنت گوں نشے جیکی گُر ءُنت — بچے ان کی گود میں سوئر کے پلوں جیسے لگتے ہیں۔

نائی جانگالان گوں مہکاں ھور درنت — کھجور کا حلوہ، مکھیوں کے ساتھ ہی کھا جاتی ہیں۔

مرد شکاران ئُت جن گوں شپانکاں دوگرت — جب اُن کے مرد شکار کو جاتے ہیں تو وہ چرواہوں کے ساتھ عشق لڑاتی ہیں

دوئی اِنگ است گوں لوگ ءِ پوچوئیں مڑدان — یا گھروں میں پڑے ہوئے بزدلوں کے ساتھ داد عیش دیتی ہیں۔

شاعرہ کہتی ہے کہ میر محمل نے فرنگیوں سے صاف کہدیا کہ میں ان بے پردہ اور بے حیا لڑکیوں سے کبھی بیاہ نہیں کروں گا۔ میری اپنی بلوچ قوم میں لڑکیاں بہت ہیں۔ جو باپردہ۔ باعصمت اور باحیا ہیں۔ مجھے اُن سے محبت ہے اس لئے ان کو چھوڑ کر میں کسی اور قوم کی لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا۔ یہاں پر میر محمل کی طرف سے شاعرہ نے جو اشعار کہے ہیں وہ میر محمل کی وطن دوستی اور قوم پرستی کے شدید جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ میر محمل کہتا ہے ا —

من ءَ دوتی ملک ءِ کاڈ خمارئیں جنین دوست انت — مجھے میرے اپنے وطن کی خماریں آنکھوں والی حسینائیں پسند ہیں

لُنگ ءُ شلوار دیرگ شاریں چادرُنت — جو لمبی قمیص شلوار اور ریشمی دوپٹے پہنتی ہیں۔

اسءِ بکش در اجنت، المنگانی بوگش درنت

جن کی آستینیں لمبی ہوئی ہیں
اتنی لمبی کہ ان کی خوبصورت انگلیوں
کے صرف ناخن نظر آتے ہیں۔

جب میر محل کو یقین ہو گیا کہ اب وہ وطن کو زندہ واپس نہیں جا سکے گا تب اُ
وہ بحری ہواؤں کو اپنے دوستوں کے نام پیغام دے کر کہتا ہے ؛ ـــ

کنٹیں گورشاں شامی حالان برھت

اے سمندری ہواؤ!
میرا پیغام لے جاؤ

الہن دشاہو و لواہو ءِ سر کنت

اور اسے الہن شاہو اور لواہو
تک پہنچا دو!

لمئیں مات و منی کستریں بیگش دیہت

میری والدہ محترمہ اور میری چھوٹی
بہن کو بھی باخبر کر دو

بہنی ہماتی ءَ گر انذمن ایر جیگ مکن

کہ اب میری دعوت کے لیے مینڈھے
نہ پالا کریں۔

بہنی شام ءِ سیلیں گندمیاں مدرش

میرے کھانے کے لیے مہلب جیسی
خوشبوؤں والی گندم نہ پیسیں۔

بہنی پشت ءِ کھیس و ھپت رنگیں چادران

میرے اوڑھنے کے لیے کھیس
اور سات رنگوں والی ریشمی چادریں نہ بُنیں

بہنی بور ءِ بارگیں روبندان مریس

اور میرے گھوڑے کے لیے رنگین
روبند نہ کاتیں

محل ءِ بہران گیتگ و شتگ میں گیتان

کیونکہ میں اب زندہ واپس نہیں لوٹونگا

تجھے حمل کو غرور اور تکبر نے مارا ہے

حمل ءَ پہرے پہ پت ءِ بارگ ءَ کتہ	میں نے اپنے باپ کے زمانے میں تکبر کیا تھا ۔
حمل ءَ پہراں گپتگ و دسگیر کتگنت	اس تکبر نے مجھے مارا اور میں دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا

میر حمل کی بہن اپنی اس نظم کے آئینہ میں کہتی ہے کہ میر حمل کی موت سے بلوچستان میں صف ماتم بچھ گئی ۔ سب لوگ غمگین ہوئے سوائے دو چار کے جو خوش ہو گئے وہ دو چار کون تھے ؟ شاعرہ کی زبانی سنیئے ، کہتی ہے ا سے

سے و چار چیزاں حمل ءِ موت ءَ شاد کتہ	تین چار چیزیں حمل کی موت سے خوش ہوئیں ۔
سیداں سن جاھگو، آسکاں من باگیں رُجبڑو	جھاؤ کے پہاڑی بکرے اور جبڑو کی سبزہ زار کے ہرن ۔
لڈہ ئیں شیر من گرلشکاں، گورس ملیداں	جنگلوں کے قوی ہیکل شیر اور میدانی چراگاہوں کے گور ۔
شابزاں گوشتہ گوں ھما کوھی پاچناں	پہاڑی بکریوں نے جاکر پہاڑی بکروں سے کہا
بہلبت مات کوھاں، بیار ئوں ریکپاداں چراں	چلو ! اب پہاڑی سلسلوں کو چھوڑ کر ریتلے میدانوں میں جاکر چریں
حمل جئیند مرتگ ہیں مکے رجنت دکشیت	حمل مرگیا ہے اب ہمیں وہاں کون ماریگا ۔

کشتگیں حمل من شکارانی شاد ءِ حان — وہ تو حمل ہی تھا جو اپنی تفریح کیلئے

میدانوں میں گوروں اور جنگلوں میں

من لداں گور ءِ کشگ و شیرمن گرگیثان — شیروں کا شکار کیا کرتا تھا۔

حمل جیئند کو وادر وطن کی حفاظت میں شہید ہوئے اب تقریباً پانچ سو سال کا عرصہ ہونے کو ہے لیکن بلوچستان کے طول و عرض میں اس کا نام اب تک زندہ و جاوید ہے۔ اس کی موت سے متعلق عوام الناس میں بعض عجیب باتیں مشہور رہیں جنہیں جاہل اور ان پڑھ اور سادہ منش بلوچ سچ مانتے ہیں، مثلاً یہ روایت مشہور ہے کہ جب میر حمل نے کسی فرنگی لڑکی سے بیاہ کرنے سے انکار کیا۔ تو فرنگیوں نے اسے قتل کر دیا۔ اور اس کا گوشت اپنی عورتوں کو کھلا دیا۔ تاکہ ان سے حمل جیئند جیسے وطن دوست اور بہادر سپوت پیدا ہوں۔ جن جن عورتوں نے حمل کا گوشت کھایا ان کو حمل ٹھہرا اور بچے پیدا ہوئے فرنگیوں میں حمل کی نسل اب تک پائی جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ یہاں پر اس روایت کی سچائی بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اس سے بلوچوں میں میر حمل کی ہردلعزیزی اور عظمت کا وُہ مقام دکھلانا مُراد ہے جو اسے حاصل ہے اور وُہ میر حمل کی وجہ سے ایا۔ اَن ہونی بات کو ہونی ٹھہراتے اور اس پر یقین رکھتے ہیں۔

حمل کے اشعار بلوچوں کی مجلسوں میں بڑے شوق سے گائے اور پسند کئے جاتے ہیں۔ جس نظم کے اقتباس ہم نے اوپر دیئے ہیں اسے شادی بیاہ کے موقعوں پر عورتیں ھلوھالو کی طرز پر گاتی اور ایک ایسا تاثر پیدا کر دیتی ہیں کہ ہر نوجوان بلوچ کا دل حمل کی یاد سے سرشار ہو جاتا ہے شاعر نے خوب کہا ہے کہ: ؎

سے

حمل جو نام سن ساورڑ خو بیتہ
جاگ کر جو نام سن گنگیں آدینکان

حمسل کا نام سات سمندر پار پہنچا
مگر جیتا کر کا نام
تو گنگے آئینوں میں رہا

پانچواں باب

سسی پنوں

سسی اور پنوں کی داستانِ عشق کو سندھ کے صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے جو شہرت و دوام بخشی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں لیکن بلوچستان بھر میں جو شہرت، دل پسندی اور ہر دلعزیزی شئے مرید و ھانی کی داستان کو حاصل ہے، سسی اور پنوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوا بلکہ عہدِ متوسط کے اکثر و بیشتر بلوچ شعراء سسی و پنوں کے نام تک سے واقف نہیں معلوم ہوتے بلوچستان کے طول و عرض میں جہاں شئے مرید و ھانی سے متعلق بیسیوں عشقیہ نظمیں ملتی ہیں۔ وہاں سسی اور پنوں سے متعلق صرف ایک نظم ہے اور وہ بھی محض بیانیہ اور اسی عہد کی بلوچی شاعری کے مدارج سے بہت پست ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم بہت بعد میں کسی عام بازاری قسم کے شاعر نے کہی ہے، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ متقدمین کے بڑے بڑے نامور بلوچ شعراء نے اس داستان کو زیورِ شعر سے آراستہ کرنے کی طرف کوئی توجہ

نہیں دی ہے اور نہ ہی متاخرین نے اسے کوئی اہمیت دی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟
اس سے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ!

بلوچ جیسا کہ ان کی عشقیہ داستانوں سے ظاہر ہوتا ہے اس میدان عشق میں بھی اپنا ایک جداگانہ اور منفرد نقطۂ نظر رکھتے ہیں ان کے نزدیک میدان عشق میں بھی ایک بلوچ کا شجاعت شعار اور سرفروشی ہونا لازمی ہے وہ عاشق کے اپنی محبوبہ کے فراق میں رونے پیٹنے اور گریہ و زاری کرنے کے قائل نہیں اُن کے لئے بیبگر رند کا کردار ایک بلوچ عاشق کا اعلیٰ نمونہ ہے شے مرید کی بات دوسری ہے۔ اس کا تعلق روحانیت اور معرفت سے ہے وہ اپنا ایک علیحدہ مقام رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود اسے بھی اشعار میں تلوار باز، کمان دار اور لڑا کا مرید کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مرید خود بھی اپنی جنگجوئی کا اظہار کرتا ہے مثلاً جب اس کا والد مبارک میر چاکر کی بھری مجلس میں جوتا نکال کر اسے مارتا ہے تو مرید چلا اُٹھتا ہے کہ ؎

کہ آپ پر معاف ہے
اس لئے کہ آپ میرے باپ ہیں
لیکن اگر اور کوئی مجھے جوتا مارتا
تو آج دونوں طرف سے رند،
زخموں سے چور کراہتے
اور زمین اُن کے خون سے سیراب ہوتی

اور اسی مجلس میں جب شے مبارک اُسے ہدایت کرتا ہے کہ چاکر تیرے برابر کا آدمی نہیں وہ تو رندوں کا سردار ہے وغیرہ تو مرید اسے جواب دیتا ہے

ک:۔

اگر وُہ سردار ہے تو کیا ہُوا
اگر وہ شیہک کا بیٹا چاکر ہے
تو میں بھی خوش پوش مُرید ہوں
میری بھی آنکھیں دلوں کو لبھانے والی
اور آتشِ عشق سے سُرخ ہیں۔
اگر میں ایک پتلی جھاڑی بھی اُٹھا کر حملہ کردوں
تو سنگین قلعے بھی مجھے نہیں روک سکینگے

بہرحال، بلوچ اپنے جغرافیائی ماحول کی وجہ سے انتہا پسند طبیعت رکھتے ہیں بیبکر رند، شے مرید اور توکلی مست اُن کے ہاں انتہا پسندی کی معراج ہیں۔ لہذا اُن کی کسوٹی پر پورا اُترنے کے لئے ایک بلوچ عاشق یا تو بیبکر رند کی طرح شجاع اور سرفروش ہو، اور یا پھر شے مرید اور توکلی مست کی طرح فنا فی الذات ہو کر مستی و بے خودی کی دوسری انتہا کو چھُو لے اِن دو انتہاؤں کا کوئی درمیانی مقام، بلوچیت کے متوالے کسی بلوچ شاعر کی نگاہ میں جچتا ہی نہیں۔

پنّوں نام، جیساکہ ظاہر ہے کوئی بلوچی نام نہیں۔ پُن بلوچی میں ایک لفظ ضرور ہے لیکن اُس کے معنی " غدود سے بھرا ہوا دانہ یا گلٹی" کے ہیں جس شخص کے یہ گلٹی نکلی ہو، اُسے پُنّی کہتے ہیں جو صفت تو ہو سکتی ہے لیکن اسم نہیں ہوتا۔ ہمارے خیال میں پُنّوں نام خالص سندھی ہے جس کے معنی دوست یا محبوب کے ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بلوچوں میں ان دِنوں بھی پنّوں نام خال خال ملتا ہے۔ لیکن ان قبائل میں جو سندھ کی حدود سے نزدیک آباد

ہیں اور جن کی آمد ورفت زیادہ تر سندھ میں ہوتی رہتی ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کئی اور پنّوں کی جو واحد بلوچی نظم اس وقت ہمارے پیش نظر ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنّوں ذات کا ھوت تھا ۔ جو بلوچوں کا ایک مشہور و معروف اور بہت قدیم قبیلہ ہے جس کی بلوچیت مثالی ہے ، اور اسی نظم سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پنّوں کے باپ کا نام عالی اور بھائیوں کے نام نوتؔ اور چنر یا چنرو تھے ۔ جو پسندیدہ بلوچی نام ہیں ۔ شاعر کہتا ہے : ؎

گو لُشتہ کیا فی برادر ءَ	اس کے کیان تمثیل بھائیوں
نوتؔ و نوابیں چنر ءَ	نوتؔ اور نواب صفت چنر نے جذبات میں آکر
پہ جلے ءَ سُلتان پھر ءَ	اپنے سُلطان صفت باپ سے کہا
سندھ ءَ شہ کاروں برادر ءَ	ہم اپنے بھائی کو سندھ سے ضرور لے آئیں گے

تو پھر کیچ کے سردار عالی کے تیسرے بیٹے کا نام پنّوں ہونا کیسے قرین قیاس ہو سکتا ہے ممکن ہے اُس کا نام کچھ اور ہو ، لیکن سندھ کی سسّی سے تعلق کیوجہ سے اس کا نام بعد ازاں شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کی شاعرانہ تعلّی سے پنّوں یعنی (محبوب) پڑا اور مشہور ہُوا ہو ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کیچ (تربت) میں ایک بوسیدہ قلعے کے آثار بھی اب تک پائے جاتے ہیں جو " پنّوں کلات " یعنی پنّوں کا قلعہ کہلاتا ہے . لیکن تاریخی شواہد کی رُو سے یہ بھی پنّوں کا قلعہ ثابت نہیں ہو سکتا ۔ تفصیلات میں یہاں جانے کی ضرورت نہیں صرف اتنا ہی کہہ دینا ہی کافی ہو گا کہ جب پنّوں اپنی محبوبہ سسّی سے بیاہ رچانے بھمبور (سندھ) گیا تو اس وقت اس کا باپ عالی بقید حیات

موجود تھا۔ تب لازماً اس وقت کیچ کا یہ قلعہ اگران کا تھا تو پنّوں کا قلعہ نہیں بلکہ عالی کا قلعہ کہلاتا ہوگا۔ سسّی سے شادی کرنے کے بعد پنّوں پھر کبھی کیچ واپس نہیں پہنچ سکا راستے میں ہی لس بیلہ کے کسی مقام پر بقول شاعر سسّی کے ساتھ زمین میں دھنس گیا تب اس کا کیچ میں اپنے نام سے کوئی قلعہ تعمیر کرنا بعید از فہم ہے۔

بہرحال ہماری رائے میں کیچ کے اس ھوت سردار زادے کا اصل نام پنّوں نہ تھا۔ بلکہ وہ پنّوں یعنی محبوب کی صفت سے بعد میں مشہور ہوا۔ جیسا کہ اس نظم کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے :-

درنائے مں کیچ ءِ بھرءَ	کیچ کے اطراف میں ایک نوجوان تھا
نام پنّوں ءُ ث پیدا در ءَ	جو پنّوں کے نام سے مشہور تھا۔

بلوچی لفظ "پیدادر" کے معنی ظاہر، نمایاں اور مشہور کے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ نوجوان پنّوں کے نام سے مشہور ہوا۔ اگرچہ اس کا اصل نام پنّوں نہ تھا۔

جہاں تک نظم کی قدامت کا تعلق ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اس عہد کی بلوچی شاعری کی اعلیٰ مدارج سے بہت پست ہے۔ نظم کی زبان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت بعد کی تصنیف ہے اس لئے اس لحاظ سے مستند نہیں کہ کیچ کے اس سردار زادے کا نام واقعی پنّوں تھا۔ نظم کے مصنف نے اسے بلا شبہ پنّوں کہا ہے لیکن یہ نام اس نے شاہ عبداللطیف بھٹائی یا کسی اور سے اخذ کیا ہوگا۔

بلوچستان میں پنّوں کا دور متعین کرنے کے لئے بھی ہمارے پاس کوئی تاریخی سند موجود نہیں ہے۔ گوکہ نیو جھتو رام قبیلہ ھوت سے متعلق "تواریخ بلوچستان" میں لکھتا ہے کہ "اگرچہ موجودہ زمانے میں علاقہ کیچ میں قوم ھوت

کی کچھ شہرت یا وقعت نہیں رہی لیکن پچھلی تواریخوں اور نظموں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب قوم بلوچ (رند) علاقہ کرمان سے علاقہ مکران میں آئے دیگر قوموں نے قلات کی طرف رجوع کیا۔ تو علاقہ کیچ مکران پر ہوت قابض ہو گئے (ص - ۵۰۷) یہ تقریباً پندرھویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے اس لحاظ سے پنّوں کے دور کو سولہویں صدی کی ابتدائی چوتھائی میں قرار دینا ہمارے خیال میں غلط نہ ہوگا۔

شاعر سسی پنّوں کی داستان عشق کی ابتدا یوں کرتا ہے کہ کیچ پر عالی نام کے ایک ہوت سردار کی حکومت تھی۔ عالی کے تین بیٹے تھے، بڑا بیٹا پنّوں کے نام سے مشہور تھا۔ پنّوں بڑا بہادر سجیلا اور بہت ہی خوبصورت نوجوان تھا۔ ایک دن عالی نے اپنے بڑے بیٹے پنّوں سے کہا کہ اب تم جوان ہو گئے ہو میرے بعد اس ملک پر حکمرانی تم کو ہی کرنا ہوگی۔ لہذا اب وقت آگیا ہے کہ کسی امیر بلوچ گھرانے میں تمہاری شادی کرادی جائے اس پر ؎

پنّوں ءَ گوں لُشتہ گوں پت ءَ	پنّوں نے اپنے باپ سے کہا
دریگیج منی مٹ ءَ درور ءَ	پہلے میری ثانی اور میرے لائق کی کوئی لڑکی تو پیدا کرو۔
جنیں نے، من باگیں مکران	یہاں مکران میں تو میرے لائق کی کوئی عورت نہیں ہے۔
گھیڑی دگہ دیریں دھان	ہاں اگر دور کے ملکوں میں ہو، تو ہو

پنّوں کے جواب سے عالی ششں و پنج میں پڑ گیا لیکن اس کے درباری وکیل نے کہا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اگر آپ مجھے اجازت دیں اور کچھ گھڑسوار میرے ساتھ کر دیں تو میں دُور دور کے ملکوں میں گھوم پھر کر پنّوں کے لائق کی کوئی

دں کی تلاش کروں گا۔ عالی بہت خوش ہوا اور اُس نے اسے

داتی پچینیں سد سوار	سو چیدہ گھڑسوار اُسے دیئے
ریپتہ سیاھاں تانکہ لار	اور وُہ اصفہان سے لار تک گیا
اَنگہ مں تعجیں کندھار	اور پھر وہاں سے قندہار جا پہنچا

لیکن اِن ملکوں میں اُسے ٹٹوؤں کی ثانی نظر نہیں آئی۔ آخرکار جب اسے

دیریں دِھی دُراہ گولتت	دور و دراز کے تمام علاقے اُس نے چھان مارے۔
مں باگھیں سندھ ءَ شتت	تب وُہ سرسبز و شاداب سندھ کی طرف گیا۔
تمبوُں مں جمبور ءَ جتنت	اور جمبور میں اُس نے اپنے خیمے نصب کیے۔
شہرءِ دپ ءَ اُردو گتنت	شہر جمبو کے دروازے کے سامنے اس نے ڈیرہ ڈال دیا۔

عالی کا وکیل کئی دن تک جمبور کے شہر میں گھومتا پھرتا رہا اور آخر ایک دن اسے

سَستوئیں دلیتہ در مگوُرئیں	اس نے سسی کو دیکھا
دُرلگئیں وسنگیں پڑین	جو موتیوں کا ہار پہنے ہوئے تھی جو متوالی چال چلنے والی ایک حیائے مجسم تھی۔

وکیل نے بھمبور شہر کے باسیوں سے پوچھا کہ یہ حور شمائل بیٹی کس کی ہے؟ شہریوں نے جواب دیا : ے

نے ماتے تواریت ء نے پدر	اس کی نہ ماں ہے نہ باپ
گڈ شو برپتہ ناگمان	ایک دن جب نفیس کپڑے دھونے
پچلیں گڈانی شودگ ء	کو دھوبی دریا کے کنارے گیا تو اس نے اچانک
سستوئی دلیتہ در مگوئرین	موتیوں کا ہار پہنے ہوئی اس سسی کو پایا
داپ ئت من سندوک پوتہ ء	جو ایک صندوق میں محوِ خواب تھی اور دریا کی موجیں جسے بہا
زرتہ دریاب ء اچھلاں	لئے جارہی تھیں : اور جو دودھ پینے کی خواہش
شیر مہتکی چہ مور دانگاں	میں اپنا انگوٹھا چوس رہی تھی

دھوبی اسے اپنے گھر اٹھالایا۔ اس کے ساتھ صندوق میں زروجواہر کا ایک ڈھیر بھی تھا۔ جس سے دھوبی مالامال ہوگیا۔ دھوبی کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے وہ اور اس کی بیوی اُسے خدا کی طرف سے فیضانِ رحمت سمجھ کر اپنی بیٹی کی طرح اس کی پرورش کرتے رہے۔ اور پیارے اس کا نام سسی رکھا۔

سسی جب بڑی ہوکر بلوغت کو پہنچی تو چندے آفتاب اور چندے ماھتاب بنی۔ ہر چند کہ بڑے بڑے لوگوں نے اس سے بیاہ کرنے کی خواہش

سسئی کسی سے ناطہ منظور نہ کرتی اور دھوبی اس کی مرضی کے خلاف نہ کرتا۔ چنانچہ اب تک یہ حسین و جمیل لڑکی بن بیاہی پھرتی ہے۔

بھنبور کے شہریوں سے سسئی کی داستان سن کر عالی کا وکیل دھوبی کے پاس گیا۔ اور اس سے کہا کہ :-

یک واجھے اسئیں، من ءُ	میرا ایک سردار ہے
مں باپچھیں کیچ ءُ بھر ءُ	جو کیچ کے سرسبز و شاداب ملک میں رہتا ہے۔
پنوں ئی ءُ نام پیدا اور انت	اس کا نام پنوں مشہور ہے جو تیری بیٹی کا ثانی
تئی جنکءِ مٹ دردور انت	اور اس کے لائق کا ہے۔

دھوبی وکیل کی باتیں سن کر سسئی کے پاس گیا اور اسے کیچ کے سردار زادے کے متعلق وہ تمام باتیں بتادیں جو وکیل نے اس سے کہی تھیں۔ سسئی بلا توقف رضامند ہوگئی چنانچہ :-

گڑتہ وکیل ءُ حیلہ باز	وکیل نے بہت سی دلیلیں دلائل دیں تو دھوبی نے کہا
گڈ شوئی ءُ گوکشت کار ءِ لباز	اب جاؤ اور جاکر کام کی تکمیل کرو!
تئی واجہ ءُ پہ نیت نا ز	تیرے سردار زادے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

یہاں پر قابل غور بات یہ ہے کہ اس سے پہلے سندھ کے کئی بڑے بڑے آدمیوں نے دھوبی سے سسئی کا ناطہ مانگا تھا۔ لیکن سسئی کے کہنے پر

اس نے انکار کیا تھا۔ لیکن اب ایک ایسے شخص کو جو سندھ سے بہت دور کیچ مکران میں رہتا تھا۔ نہ اُس کے ملک کا آدمی تھا اور نہ ہی اُس کی قوم سے تھا۔ یہاں تک کہ اس کی صورت بھی اب تک سسّی یا اس کے دھوبی باپ نے نہیں دیکھی تھی۔ محض ایک وکیل کے کہنے پر ناطہ منظور کر لینا ایک اچنبے کی بات ہے، لیکن راوی کہتا ہے کہ جس طرح زلیخا حضرت یوسف کو خواب میں دیکھ کر اس پر دل و جان سے نثار ہو چکی تھی۔ اِس طرح سسّی بھی پنّوں کو ایک رات خواب میں دیکھ کر اُسے دل دے بیٹھی تھی۔ اور اُسے خواب میں اس امر کی بشارت بھی ہوئی تھی کہ اُس کے خوابوں کا محبوب ایک دن کیچ سے آئے گا۔ اور اُسے بیاہ کر لے جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وُہ کسی اور سے بیاہ کرنے پر راضی نہیں ہوتی تھی اور جس دن اُسے معلوم ہوا کہ پنّوں کا وکیل کیچ سے آیا ہوا ہے۔ تو وُہ بلا توقف پنّوں سے ناطہ کرنے پر رضامند ہو گئی اور اپنے دھوبی باپ سے کہہ دیا کہ جا کر پنّوں کے وکیل سے ہاں کہہ دے

الغرض شاعر کہتا ہے کہ جب پنّوں کا وکیل کامیاب و کامران ہو کر واپس کیچ پہنچا تو اس نے پنّوں کو اطلاع دی کہ: ؎

بھمبور میں ایک لڑکی ہے۔
نام سسُوائِت ماہ پیکر ءُ — اس ماہ پیکر کا نام سسّی ہے
اور وُہ حسینہ ہے
لال تئی نکاح ءُ دُردُرِں — جو گراں قیمت لعل کی مانند ہے
تیرے نکاح کے لائق ہے

وکیل سے سسّی کی تعریف سُن کر پنّوں بھمبور جانے کو بیقرار ہو گیا۔ باپ

کی اجازت سے اُس نے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں اور بالآخر ایک دن: ۴

سد اُشتری مجھد دسیار	اُس نے سو دد کوہانوں والے اونٹ
اُش تھان و زراں کرتہ بار	ریشمی کپڑوں کے تھانوں اور سونے چاندی سے لاد لیے
سد گوری ٹرو نتہ دنیا دار	سو دولت مند مہند
سد مولدی زُرت مُبدہ دار	سو لونڈیاں کھانا پکانے والی
ے سد سواریا نیزہ دار	تین سو گھڑ سوار نیزے سنبھالے ہوئے
پیادہ سپاہی یک ھزار	اور پیدل فوج کے ایک ہزار سپاہیوں کو ساتھ لے کر
نیشتی پہ سانگ ءُ گتہ	وہ ہستی کے ساتھ منگنی کی رسم ادا کرنے کو
سُ باگچہیں سندھ ءُ گشتہ	سرسبز و شاداب سندھ کی طرف روانہ ہُوا۔

اس تزک و احتشام کے ساتھ کیچ سے روانہ ہو کر چٹیل میدانوں، کوہستانوں اور لس بیلہ کے جنگلوں سے ہوتا ہُوا پنوں بھمبور پہنچا۔ بھمبور کا شہر سیون کے جنوب کی طرف کوٹڑی کے گرد و نواح میں دریائے سندھ کے کنارے پر آباد تھا۔ جب پنوں اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ وہاں پہنچا تھا اس نے اے

مِن جمبورءِ اُرِدُو کتنت شہرءِ دپ ءَ تمبو جتنت	جمبو میں ڈیرہ ڈال دیا شہر کے دروازے کے عین سامنے اس نے اپنے خیمے گاڑ دیے (پھر انہوں نے اپنے اونٹوں کو کھلانے کے لئے)
مُسکءِ زباداں سرشتگنت دات اُشترانی مِن دپ ءَ	چو کر میں مشک و زباد ڈال کر گوندھا اور اپنے اونٹوں کو کھلا دیا رات کو
دپ چکتہ البتہ شپ ءَ شپ کہ کریم ءَ روچ کتہ دپ اُشترانی بوتکگنت	اونٹوں کے منہ کس کر باندھ دیئے خداوند کریم نے جب رات کو دن کر دیا انہوں نے علی الصبح اپنے اونٹوں کے منہ کھول دیئے ۔
زرتہ گلگانی اُشتران کمک وزباداں بو کُتہ ہرکس اَشئے راہ ءَ گُشتہ آئی ءَ ھمے بو ءَ جتہ	اونٹوں نے جگالی کرنا شروع کی مشک و زباد کی مہک اُٹھی اس راستے سے جو بھی گذرا اسے یہ خوشبو لگی ۔
بوئی تن آ شہرءَ گُشتہ	یہاں تک کہ رفتہ رفتہ تمام شہر میں خوشبو پھیل گئی ۔

شاعر کہتا ہے کہ مشک و زباد کی مہک پا کر ستی نے اپنی سہیلیوں
سے کہا ؛ ـــ

من ذھدگ دکتول ءَ کنان	میرا وعدہ ہے ۔ اور میں قول کرتی ہوں
کوّل انت ھمے مرد ءَ گران	میرا قول ہے کہ میں اس مرد سے ضرور شادی کروں گی ۔

دوسرے دن پنّوں دھوبی کے پاس گیا اور اس سے رسماً سسّی کا رشتہ مانگا۔ دھوبی سے رشتے کی بات چیت اگرچہ پہلے ہو چکی تھی لیکن کچھ باتیں ایسی تھیں جن کا فیصلہ خود کو پنّوں کو کرنا تھا۔ شاعر کہتا ہے ؎

پُنّوں رُشتہ رَبا لبیٔ	پُنّوں سسّی کا خواستگار بن کر گیا دھوبی نے اس سے کہا کہ
گد شودی گوں گشتہ: بی سئی	تجھے معلوم ہو کہ اپنی بیٹی تجھے دینے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ۔
پرتو من ءَ پچ نیست ناز	میں جانتا ہوں کہ تیرے پاس بڑی دولت ہے ۔ لیکن ،
زاناں کہ دُنیا دار ے باز	میری کچھ شرائط ہیں ۔
البہ منی شرتاں بزان	تو انہیں سن اور سمجھ لے
یکبر تُشود شہر ءِ گدان	(اوّل یہ کہ) ایک دفعہ تجھے تمام شہریوں کے کپڑے دھونے ہوں گے
گدءَ بکن جاگہ اِدان	(دوئم یہ کہ) تجھے یہاں پر مستقل رہائش اختیار کرنا ہوگی ۔

تب میں سسی کو تم سے بیاہ دوں گا۔ پنوں نے کہا مجھے منظور ہے۔ چنانچہ دوسرے دن ہی پنوں نے

شہرءِ گدی دُراہ بُڈ کُتہ	تمام شہریوں کے میلے کپڑوں کو جمع کرکے اپنی پیٹھ پر اُٹھایا
گدءُ دریاب کرہ بُرتہ	اور دریا کے کنارے گیا
دُرائیں گدانی شُشتگنت	ان کے تمام کپڑے دھوئے
گدشتنگ سرزوں کتنت	کپڑے دھوکر ان پر استری کی
ہریک سرءُ مہرے پلست	اور پھر ہر کپڑے کے ساتھ ایک اشرفی باندھ دی۔
دانی ھادند ءِ بہ دست	تب کپڑے مالکوں کو واپس پہنچا دیئے

بھمبور شہر کے لوگ پنوں کی سخاوت دیکھ کر بہت خوش ہوئے گھر گھر اس کی تعریف ہونے لگی بالآخر وہ دن بھی آیا جب دھوم دھام سے سسی کے ساتھ اس کی شادی ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد پنوں نے اپنے وکیل اور دوسرے ہمراہیوں کو واپس کیچ بھیج دیا۔ اور خود دھوبی کے گھر میں سسی کے ساتھ پیار و محبت سے رہنے لگا ایک سال بعد پنوں کے باپ کو بیٹے کی یاد ستانے لگی اور بہت بےچین اور پریشان ہوا کیونکہ اس کے بعد پنوں ہی اس کا جانشین بننے والا تھا جس کا کیچ میں موجود رہنا ضروری تھا۔ چنانچہ اُس نے پنوں کو ایک درد بھرا خط لکھا کہ اے

پنوں نہیاے نوجوان !	پنوں ! اے نوجوان
من نشتگاں درد گمان	تم یہاں واپس کیوں نہیں آتے ہو میں درد و غم سے نڈھال یہاں بیٹھا ہوا

تُو دشّےگوں ماہ کموتر ءَ	اور تم! اُدھر اس چاند جیسی کبوتری کے ساتھ لعل دیاقوت کے اس ثمر کے ساتھ
گوں لال دیاکوتی بَرَ ءَ	اُس آفتاب و مہتاب تمثیل کے ساتھ خوش ہو،
گوں روچ دماہ ءُ دروَر ءَ	اے نوجوان پُنّوں!
واز گردکن بیاکیچ ءُ پدا	اَب واپس پھر کر کیچ آجاؤ
نُچ ءُ تیارنت کہُنگران	یہاں نخل پر شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔
ءُ مُوسلی گر زیں بران	بڑے بڑے اور گول موصلی ترنج پکنے کو ہیں۔

باپ کا خط پاکر بھی پُنّوں واپس کیچ آنے کو آمادہ نہیں ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد جب اُس کے باپ کی پریشانیاں اور زیادہ بڑھ گئیں تو ایک دن اُس نے پُنّوں کے بھائیوں کو بُلایا اور ان کے سامنے اپنا دکھڑا بیان کیا۔ چنتر نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو ہم ابھی سندھ جاکر پُنّوں کو واپس لے آئیں گے۔ چنانچہ باپ کی اجازت پاکر؛ ؎

مہری نیں جلدی لوٹِت ئُنت	اُنھوں نے جلد اپنے مہاری طلب کیے
ھیتاں چِڑکیں بر کُت ئُنت	اُن پر ہلکے اور خوبصورت پاکھڑے ڈالے
لُنت دلزاہیں چتر ءَ	لُنت اور دِلزاہی شان والے چنتر
بُرزبیتگنت ءُ دو روال	رکابوں میں پاؤں ڈال کر اوپر کو اُٹھے
دِش نشتگنت ءُ کو پُرال سہیلا	اور مہاریوں کی پُشت پر خوبصورتی سے جم کر بیٹھ گئے۔

پہ پاگھیں سندھ ءُشتنت	اور اس طرح باغوں والے سندھ کو روانہ ہو گئے ۔

بھمبور پہنچ کر نت اور چنڑ نے پنوں کو بہت سمجھایا ۔ اس کی منت سماجت کی، باپ کے بڑھاپے کا واسطہ دیا لیکن پنوں واپس کیچ جانے کو راضی نہیں ہوا ۔ آخرکار بھائیوں نے اُسے زبردستی اٹھا کر لے جانے کا آپس میں فیصلہ کیا ۔ علی الاعلان دن دھاڑے تو وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے، اس لئے انہوں نے ایک دوسری تجویز سوچی اور ایک رات کو اُنہوں نے پنوں اور سسی کے لئے اپنے کیمپ میں ایک شاہانہ ضیافت کا انتظام کیا ۔

سسوٗ، پنوں اش لوٹنت	سسی اور پنوں کو ضیافت میں بُلایا گیا
بیلاں شراب واری کنت	سب ساتھی مل بیٹھ کر شراب پیتے رہے
کپتی شراباں کہری ءُ	پنوں کو شراب زیادہ چڑھ گئی (اور وہ بیہوش ہو کر گرا)
سستو اش ولیت بے ساری ءُ	تب اُس کے بھائیوں نے دیکھا کر سسی بے سُدھ پڑی سو رہی ہے
پنوں اش لبت پہ مہاری ءُ	انہوں نے پنوں کو اُٹھا کر مہاری پر باندھ دیا ۔
دُراھیں شپ ءُ تن تھاری ءُ	رات بھر جبکہ اندھیرا تھا
جلدی شتنت اِلکاری ءُ	وہ بہت تیز دوڑاتے ہوئے گئے

صبح جب سسی نیند سے بیدار ہوئی ۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ نہ وہ بلوچ ہیں اور نہ اُن کے خیموں کے نشان نظر آتے ہیں ۔ وہ پریشان ہو کر اٹھی

ادھر ہر طرف بھاگتی اور پنوں پنوں کی صدا لگاتی اُسے بلاتی پھری۔ لیکن پنوں اب وہاں کہاں تھا؟ سسی کے ماں باپ اور ہمجولیاں آئیں۔ انہوں نے ہر چند اسے نصیحت کی کہ صبر سے کام لے۔ ممکن ہے پنوں واپس آجائے مگر سسی روتی، پیٹتی اور کفِ افسوس ملتی رہی، ا سے

ارمان وافسوزاں وَران — ہائے حسرتا! ہائے افسوس!!
همو کنت مکرانیان — مکرانیوں نے مجھ سے ایسا سلوک کیا
بے پنوں مے دوست کہ آنت — پنوں کے بغیر میرا دوست اور کون ہے
چو پنوں کے سے نہ آنت — پنوں جیسا اور کوئی نہیں۔

اور جب دن چڑھا اور سسی کو پنوں کے لے جانے والے مہاریوں کے پاؤں کے نشان نظر آئے۔ تو وہ بے خودی کے عالم میں ان نشانوں کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔ ماں باپ نے سمجھایا۔ شہر کی عورتوں نے منتیں کیں۔ بوڑھوں نے منع کیا کہ کیچ یہاں سے بہت دور ہے۔ راستہ پُرخطر ہے جس میں جنگل۔ کوہستان۔ لق و دق صحرا اور بے آب و گیاہ میدان پڑتے ہیں۔ جہاں سے سلامت گذر کر جانا ایک اکیلی پائے پیادہ جان کے لئے دوبھر ہے۔ تنومند ساندڑنی سوار دستوں کے لئے بھی جانکاہ خطرات میں پھنسے بنا ممکن نہیں۔ لق بیابانوں میں چوروں۔ اچکوں۔ درندوں اور گزندوں کے غول کے غول منڈلاتے پھرتے ہیں۔ الغرض انہوں نے ہر چند سسی کو ڈرایا اور خوف دلایا کہ وہ اپنی منزل تک کبھی بھی زندہ نہیں پہنچ سکے گی۔ مگر شعلۂ عشق سے منور دل۔ اور دیدارِ محبوب کے لئے ترستی نگاہیں رکھنے

والی اس پیکر مہر ووفا پر ان پاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا ۔ اونٹوں کے پاؤں کے نشان لئے وہ برابر چلتی رہی ۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

گپت اشترانی راہ و رنڈ	اونٹوں کا راستہ اور ان کے پاؤں کا نشان لے کر وہ چلی ،
ھمچو رُشتہ سل گرہند	چلتی رہی ۔ رعد و برق کی طرح
سے منزلیں بُرتہ پہ پند	تین منزلیں اس نے پائے پیادہ طے کرلیں ۔
پاد آولہ دجاں بیتہ زند	اُس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے اور بدن درد سے ٹوٹنے لگا ۔

حب ندی سے گذر کر وہ لس بیلہ کی حدود میں جا داخل ہوئی شاہ بلاول اور اوتھل کے درمیان ایک جگہ اُس نے دیکھا کہ پہاڑوں کا ایک وحشی چرواہا بھاگم بھاگ اُس کی طرف آرہا ہے ۔ قریب پہنچ کر جب چرواہے نے پکڑنے کو دیوانہ وار آگے بڑھا تو شاعر کہتا ہے کہ : ؎

ہول ءَ بگوشت ! ادبے ہُشیار	اس گلگوں محبوبہ نے اس سے کہا
دیما مکیا ! پاداں بدار !	اے بے مروت ! آگے نہ بڑھ اپنے قدم روک لے
بے منزل اَت من گشنگاں	میں تین منزلوں سے بھوکی چلی آ رہی ہوں
ہیک تشکن و من تُشنگاں	پیاسی اس قدر ہوں کہ میرا تالو خشک

	ہوگیا ہے۔
نام کھُدا ونذی بچار	خدا کا نام دیکھ !
یک تاسے شیر پمن بیار	میرے لئے دودھ کا ایک پیالہ لے آ

لیکن چرواہے کی نیت خراب تھی، دشت و بیابان میں ایک ایسی حسین وجمیل عورت کو اکیلے دیکھ کر وہ بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ سسی نے جب دیکھا کہ وہ وحشی اس کی آبرو ریزی کے درپے ہے تو ہاتھ اُٹھا کر اس نے خدا سے دُعا مانگی : —

یارب امن عزّ وُت دے صبرَ	یارب! مجھے تو خود بچا تو ہی حفاظت کرنے والا
گھوریس تو سے مادر پدر	اور تو ہی میرا ماں باپ ہے۔
مار مدے بروست ایں	مجھے اس کے ہاتھ میں نہ دے۔
ناسر پدو جبش لعین	اس ناسمجھ جاہل اور لعین سے مجھے بچا کے رکھ

شاعر کہتاہے کہ اسے

پینگ دعائی مستجاب	سسی کی دُعا مستجاب ہوئی
یک گرنذ گے پینگتہ ناب	رعد کی طرح کا ایک زبردست دھماکا ہوا
گل گپتک آرسکیں ڈگھار	وُہ مشکیں زمین شق ہوگئی
سستو تہائی جیتہ گار	اور اس شگاف کے اندر سسی دھنس گئی

کپتنگ شیانگ بے ہوش و سار اور چرواہا، بیہوش ہو کر گر پڑا

جب چرواہے کو ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ اس کے سامنے زمین پھٹ گئی ہے اِس میں شگاف پڑ گیا ہے۔ جس کے اندر جا کر ستی چھپ گئی ہے۔ اس کی چنّی (دوپٹہ) کا ایک پلو شگاف کے کناروں سے باہر نظر آ رہا ہے۔ اب وہ پھر آگے بڑھا اور دوپٹے کے اس پلّو کو پکڑ کر اُدہر کھینچا تاکہ اس طرح ستی کو زمین کے اِس شگاف سے باہر نکال لائے چرواھے کی اس حرکت سے زمین میں پھر جنبش ہوئی اور وہ شگاف ہموار ہو گیا۔ لیکن دوپٹے کا وہ پلّو پھر بھی باہر رہا۔

اب پنّوں کا حال سنئے! دوسرے دن جب اُسے ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کے بھائی اُسے ایک تیز رفتار مہاری پہ باندھ کر بھگا کے لیے جا رہے ہیں۔ اپنی یہ حالت دیکھ کر پنّوں پر وحشت طاری ہو گئی بھائیوں سے لڑ جھگڑ کر اس نے اونٹ بٹھا دیئے اور دیوانوں کی طرح سسّی ان سسّی کرکے جہاں سے آیا تھا اُسی راستے پائے پیادہ بھنبور کی طرف واپس چل پڑا۔ چلتے چلتے آخر اسی مقام پہ پہنچا جہاں پہ وہ پہاڑی چرواھا اب تک بیٹھا سسّی کو باہر نکالنے کے لیے زمین کھود رہا تھا۔ پنّوں نے اسے

دلیتہ ھا کو ھی شیانک — اس پہاڑی چرواھے کو دیکھا
پٹیت زمین ءِ کشیت حاک — جو زمین کھود کر مٹی باہر نکال رہا تھا
جُستی کُت پنّو، او شوان — پنّوں نے اس سے پوچھا
اے چرواھے!
پچّیۓ ادا تئی بیتہ زیان — یہاں تمہاری کیا چیز کھو گئی ہے

چرواہے نے جواب دیا اسے

انگہ جینٹے مے گوئرا ءُ
چہ ماہ دروچ ءَ زروَر ءُ

نے پَرّ و بانزل کوتر ءُ
نے سوار براسپ ءُ سر ءُ
انگ پری بے نوکر ءُ
اُنکاں ، اَگراں نیلوپر ءُ
پرشتہ زمین لعل ایرشتہ

چنڈے وَدی انت چہ گُشتان

من کھنڈ ملچیاں - چنی نشان

وُردانگیں لعل ءِ کشان

ایک عورت یہاں میرے پاس آئی
جو آفتاب و مہتاب کی مانند تھی
ایک کبوتری تھی ۔
مگر اس کے نہ تو پر و بازو تھے
اور نہ ہی وہ گھوڑے پر سوار تھی
اس پری رو کے ساتھ کوئی نوکر بھی نہ تھا
میں چلا آیا کہ اس نیلوفر کو پکڑ لوں
مگر زمین شق ہو گئی
اور وہ لعل زمین میں دھنس گئی ۔
اُس کے دوپٹے کا ایک ٹکڑا
اب تک زمین سے باہر نظر آتا ہے
میں اُس کے دوپٹے کے نشان
پر کھود رہا ہوں ۔
تاکہ موتی کے اُس دانے کو
اس لعل کو باہر نکال لاؤں

پنوں نے جب چنی کے اس ٹکڑے کو دیکھا جو اب تک زمین سے باہر نظر آ رہا تھا۔ تو اس کے دل نے گواہی دی کہ یہ چنی کا دوپٹہ سسی کے بغیر اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ پنوں جب اُسے چومنے کو جھکا۔ تو اس سے ایک ایسی بھینی بھینی سی خوشبو اس کے مشام جاں میں سرایت کر گئی کہ اُس

پرکیف دبے خودی چھا گئی ۔ اس عالم کیف ومستی میں اس نے بارگاہِ خداوندی میں اپنے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی کہ اے

جاں دسرُنت پر توفدا	اے ربّ العالمین ! میرا سر اور میری جان تجھ پر قربان ہو
مارا مکن چہ لال ءَ جتا	مجھے میری محبوبہ سے جُدا نہ کر یارب !
یارب! توے دانا لصیر	تو جو دانا و بینا ہے
مرچی منی دست ءَ بگیر	آج میری دستگیری کر
پہ بیات دھرزاوَل پذیر	میری فریاد سُن ! اور میری عرض قبول کر
ماراگوں سسّی ءَ بذیر	سسّی کے ساتھ مجھے بھی (اس جہان) سے اُٹھا لے !

شاعر کہتا ہے کہ پنّوں کی دُعا بھی قبول ہوئی اور اسے

پُرُسْتہ زمیں ۔ پنّوں رُستہ	زمین (اُسی جگہ سے) پھر شق ہو گئی اور پنّوں اس شگاف کے اندر چلا گیا
سسّو ءَ انباز اں کُتہ	وہاں اس نے سسّی کو اپنی آغوش میں لے لیا ۔
رپت گوں گُل ءِ ھمرازی ءَ	اس پھول جیسی محبوبہ کا ہمراز اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے
دست من گورُدا انبازی ءَ	اور اُسے آغوش میں لئے

بینت ہردو رازی ہو گئے خوش خوش چلا گیا
اس جہان سے بے نیاز ہو کر
دل پہ دل ہو بے نیازی ہو گئے دو دل آپس میں مل گئے

پہاڑی چرواہا، حیران و ششدر وہاں کھڑے کھڑے یہ تماشا دیکھتا رہا جب اُس کے ہوش و حواس بحال ہوئے۔ تو اُس نے اسی جگہ پتھروں کا ایک ڈھیر لگا کر دو قبریں بنوا دیں۔ جو اب تک علاقہ لس بیلہ میں شاہ بلاول اور راڑ تھل کے درمیان جنگل میں موجود ہیں۔ دُور دُور سے لوگ ان کی زیارت کو آ کر اظہار عقیدت کرتے ہیں

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(۲) توکلی مست اور سمّو!

بلوچستان کے مشرقی کوہستانوں میں وہ کونسا بلوچ ہوگا جو توکلی مست اور سمّو کی داستان عشق سے واقف نہیں۔ اس علاقے کا وہ کونسا گویا ہے۔ جسے توکلی مست کے اشعار ازبر نہ ہوں اور وہ کس کا دل ہے جو ان درد بھرے شعار کو سُن کر توکلی مست کی بے چین روح کی طرح تڑپتا اور بے قرار نہ ہوتا ہو۔

توکلی جو بعد میں سمّو کے عشق میں کھو جانے کی وجہ سے مستؔ کی صفت سے موصوف ہوا مری بلوچ قبیلہ کے شیرانی طائفہ کے ڈیرکانی ٹکڑ سے تھا وہ ۱۸۲۸ء کے موسم بہار میں کاہان کے قریب پہاڑ کے دامن میں ایک جرگی گدان میں پیدا ہوا اس کے باپ کا نام ــــــــ تھا۔

توکلی کے پانچ بھائی تھے جن میں سے ایک دریا خان عرف دلبر ڈگیوں کے خلاف جھنبڑی کی لڑائی میں مارا گیا۔ اس لڑائی کے لئے مریوں کا جو لشکر نکلا توکلی بھی اس کے ساتھ تھا لیکن یہ نازک طبع انسان جسے قتل و غارت گری سے نفرت تھی زیادہ دیر تک لشکر کا ساتھ نہ دے سکا۔ راستے میں لشکر کو چھوڑ کر واپس ہوا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے خود کہتا ہے۔ اسے

ع۱ :۔ اس مقالہ میں دیگر ذرائع کے علاوہ محترمہ ذکیہ سردار کی کتاب "طوق ملی" سے بڑی حد تک استفادہ کیا گیا ہے۔ (نصیر)

چھنبڑی روچ ءَ گوں سری مرداں گوں اتاں — چھنبڑی (کی لڑائی) کے دن گو کہ میں پہلی صف کے جواں مردوں کے ساتھ تھا

دلنڑءِ اشتوا من پدی رنداں گرتگان — لیکن بعد میں دلنڑ کو چھوڑ کر میں واپس چلا آیا

توکلی بزدل نہ تھا۔ بلکہ اُس کی انسان دوست عظیم روح کو لڑائی جھگڑوں میں پڑنے اور انسانی خون بہانے سے نفرت تھی اسی لیے تو کہتا ہے، کہ

شرّ زانت جنگانی بدیں بولی — لڑائی بُری چیز ہے لڑائیوں کی باتیں بھی اچھی نہیں ہوتیں

کے وتی دوستیں مردماں رولی — کون اپنے پیاروں کو مصیبت میں ڈالنا پسند کرتا ہے۔

ماں کا سایہ تو بچپن میں ہی سر سے اُٹھ چکا تھا۔ جب چودہ سال کی عمر کو پہنچا تو باپ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔

ایک عام خانہ بدوش بلوچ کی طرح توکلی بچپن ہی سے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ چرایا کرتا تھا۔ بکریاں اسے پسند نہ تھیں۔ لیکن بھیڑوں سے اُسے محبت تھی اور انہیں چرانے میں اسے یک گونہ سکونِ قلب حاصل ہوتا تھا۔

توکلی بچپن ہی سے خاموش طبع واقع ہوا تھا۔ عموماً کھویا کھویا سا رہتا تھا ریوڑ چراتے کبھی کبھی گہری سوچ میں پڑ کر اس حد تک کھو جاتا کہ ریوڑ کا خیال کیا اپنے وجود کو بھول جاتا۔ ریوڑ منتشر ہو کر ادھر ادھر کی گھاٹیوں میں

پھیل جاتا تھا ۔ مگر توکلی اس سے بے نیاز، اپنے خیالوں میں مگن پڑا رہتا اور جب شام پڑ جاتی تو ساتھی چروا ہے اس کا ریوڑ جمع کر کے اس کے حوالے کر دیتے ۔

چھنبڑی کی لڑائی پر جانے والے مریوں کے لشکر کو چھوڑ کر واپس آنے کے بعد توکلی کہتا ہے ؛

میں دل میں خوش تھا

سن دِل ءُ دشتاں کہ پدا بار یئے کناں	کہ اب پھر امن وچین سے رہوں گا
	لیکن میں نے یہ نہ جانا کہ
چونہ زانتاں کہ زیاد ھیں ماھی کپیا	اس سے بھی بڑی ایک اور مصیبت میں گھر جاؤں گا ۔

ان ہی دنوں کا ذکر ہے کہ توکلی کہیں سفر پر جا رہا تھا ۔ برسات کا موسم اور شام کا سہانا وقت تھا ۔ جب وہ رستانی پہاڑ کی ندیوں سے گذر رہا تھا کہ آسمان پر گھٹا چھا گئی اور تیز ہوا بھی چلنے لگی ۔ یہ واقعہ اور اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے توکلی کہتا ہے

پیری شہ بیاداِنیں پٹے کایاں	پرسوں ایک اجاڑ میدان میں سے میں گذر رہا تھا ۔
شہ رستانی ءِ کوہ بُنی کموراں	رستانی پہاڑ کے دامن کی ندیوں میں جب میں پہنچا ۔
دُم دمے ترمپاں سہر گپتیں ادواں	تو بارش کی بوندیں وہاں وقفہ وقفہ پر مہربان ہونے لگیں
ساوَنی نگھا لبتگیں اِستیتن	اور پہاڑوں کے چھائے ہوئے سفید

	بادلوں نے
زر تگت گړ ندان ولوڑ، ژلیاں ئ	گرجنا اور موسلا دھار برسنا شروع کر دیا
من دی پہ اولواں نہ جبیتباں ئ	لیکن میں بھی ان کے اولوں سے گھبرانے
	والا نہ تھا ۔
بو لگے شہہ ابیت ھما پار ئ	اس طرف دُور مجھے ایک طائفہ کے خیمے نظر آ گئے
بردُں ھوداں کر جیوانت جیری	(میں نے اپنے دل سے کہا) چلو وہاں چلیں
	جہاں خوش نماؤں کے خیمے نصب ہیں
ھغیلہ ھوندی بنت منی ، میری	جہاں گھٹاؤں کی گھن گرج اور
	رقص شادمانی سے
ټکراں گاہ وگھمبراں سیری	میرے امیرانہ ہتھیار محفوظ رہ سکیں گے

الغرض تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا توکلی ایک خیمے کے سامنے پہنچا ۔ خیمے کا مالک اسے خوش آمدید کہنے کے لیے باہر آیا ۔ اور پھر اسے اپنے ساتھ خیمے کے اندر لے گیا ۔ اب تیز بارش ہونے لگی اور خیمے میں پانی ٹپکنے لگا ۔ گھر کی مالکن سمّو خیمے سے باہر نکلی ، تاکہ اپنے خاوند کے ساتھ مل کر خیمے کی طنابیں کس دے ۔ اتنے میں بجلی کڑکی ۔ بجلی کی چمک میں توکلی کی نگاہیں سمّو پر پڑیں جو بارش میں بھیگی ہوئی ننگے سر خیمے کے باہر کھڑی تھی ۔ اس کے لمبے لمبے گیسو ہوا سے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اس کے کپڑے بارش سے بھیگ کر بدن سے چمٹ گئے تھے اس لمحاتی کیفیت کو اپنی ایک نظم میں ایک مسحور کن اور دلفریب انداز میں پیش کرتے ہوئے توکلی کہتا ہے : ؎

واچڑاں کھلق ءِ بانزراں سستہ
گوات تہ بیابان ءَ شار سرءِ بُرتہ

جھکڑوں نے خیمے کی طنابیں توڑ ڈالیں
تیز ہوا اس کے سر پر سے دوپٹہ
اڑا لے گئی ۔

دلیستی متی دیہ گنداں کھلو کیناں

میری دوربین لگاہوں نے لُے دیکھا
اور کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔

ھرُ چتاں پہم گپت ءَ رلو کیناں

میں نے اپنے حواس پریشان کو
سمیٹ کر جمع کیا ۔

زُلپی چو سیاھاراں لڑو کیناں

اس کی زلفیں
بَل کھائی ہوئی کالی ناگنوں کی
طرح لگ رہی تھیں ۔

چمّی چو ڈِلیاءَ بلوکینا ن

اس کی آنکھیں !
جلتے دیئے کی مانند

بِرّنت چو آھُواں ترھو کینان

لیکن ، اُس ڈری ہوئی ہرنی کی
آنکھوں کی طرح گھبرائی ہوئی
جیسے (ہوا سے) شکاری کی بُو لگ گئی ہو ۔

گپتگنت گوات پنڈاں گنو کینان

اس وقت جب وُہ اپنی پُرخمار آنکھیں
مٹکاتی ۔

لانٹ کنت چمّاں پُرخماریناں

تو یوں لگتا رجیسے رتوڑیدار (شاھی
بندوق کی گولی ۔

چپلمہ دشاھیاں جنو کینان

ٹھیک نشانہ (دل) پر لگی ہو
اس کی آنکھیں :

ھاشکاں جاگینی کنو کیناں دیوانہ عاشقوں کو ھوش میں لاتی ہیں

اس لمحاتی دلنواز کیفیت نے توکلی کے دل و دماغ پر سمو کے حسن و جمال اور قد بالا کی رعنائی کے ایسے گہرے نقوش مرتب کیئے جن سے وہ زندگی بھر کیف و وجد کی حالت میں لطف اندوز ہوتا رہا۔ سمو کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو کر توکلی صبح تک اس کے خیمے میں بیہوش پڑا رہا۔ خود کہتا ہے: ے

دل منی مجنا بیت ھاروشی	اس دن سے میرا دل مجنوں کی طرح دیوانہ ہو گیا۔
بزو بیزارباں، مست و مدھوشی	اس دن سے مجھ پر وحشت و بیزاری اور مستی و مدھوشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔
چیلو شپ پہ پنڈگ و آزار	موسم سرما کی لمبی راتیں
گوں کھیالاں، رد پچ کنائیناں	مجھے غم جدائی میں بیٹھ کر اور اس کے خیالوں میں ڈوب کر کاٹنی پڑیں۔

سمو، مری قبیلہ کے بھرونی طائفہ سے تھی، وہ ایک شادی شدہ عورت اور کئی بچوں کی ماں تھی۔ اس کا خاوند بھی بھرونی طائفہ سے تھا۔

مست توکلی نے اپنے اشعار میں سمی اور سمل بھی کہا ہے۔ یہ ایک قدیم کلدانی نام ہے۔ جو غالباً اصل نام سمی رامیس سے مشتق ہے۔ سمی رامیس

قدیم کلدانی بادشاہ نمرود بلوُس کی ماں اور پھر اس کی بیٹی کا بھی نام رہا ہے۔ سومری بھی اسی نام سے نکلا ہے۔ یہ نام بلوچ عورتوں میں عام ہے۔

سمّو ایک خانہ بدوش بلوچ عورت تھی۔ جو دن کو تو پہاڑوں پر اپنے ریوڑ چرایا کرتی اور رات کو اپنے بچوں اور خاوند کی خدمت کیا کرتی تھی۔ توکلی اس کی حالت زار دیکھ کر تڑپ جاتا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے ؎

زیاں اِت اُو پھر دیاں، شُماگوں گُتہ سمّو گوں تُرّاں
غارت ہو جاؤ، اے پھڑیو! تم نے سمّو کو بکریاں چرانے بھیج دیا ہے

سمّو گوں مال اِن، رسترانی کوہ ءَ سرءَ
سمّو ریوڑوں کے ساتھ ہے۔ اور رسترانی پہاڑ کے اوپر رہتی ہے۔

روچ ءَ مال چارینی، آپ کاری سوریں پھاں
دن کو وہ ریوڑ چرانی ہے۔ اور پھر اسے کھاتے چشموں پر پانی پلانے کو لاتی ہے

پادشپادی ءَ ٹلّی مں مالانی رپدا
سمّو، اپنے ریوڑ کے پیچھے پیچھے ننگے پاؤں گھومتی رہتی ہے۔

کہتے ہیں کہ جب مسلسل کئی دنوں تک توکلی سمّو کے خیمے کے سامنے چپ سادھے خاموش پڑا رہا، تو سمّو کے خاوند اور پھر دلی طب لکہ کے دوسرے افراد کو یہ بات بہت ناگوار گذری اور انہوں نے مست کے بھائی سندوں کو اس بات کی اطلاع دیدی کہ وہ اگر اپنے اس دیوانے کو جو اُن کی بے عزتی اور بدنامی کا سبب بن رہا ہے سنبھالیں ورنہ مجبور ہو کر بلوچی میار میں اُسے قتل کر دیا جائے گا۔

توکلی کے بھائی اور رشتہ دار اطلاع پا کر جب وہاں آئے اور توکلی کو انہوں

نے اس حال میں دیکھا تو بہت حیران اور پریشان ہوئے ۔ اور آخر ھزار حیلوں بہانوں سے اُسے اپنے ساتھ چلنے پر رضامند کر کے لے گئے ۔

لیکن زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ توکلی پھر سمّو کے خیمے کے سامنے آ نمودار ہُوا ۔ مگر اس دفعہ سمّو کے خیمے سے کچھ دُور ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ۔ اور سمّو کے خیمے کی طرف رُخ کر کے ٹکٹکی باندھے رات دن دیوانوں کی طرح سمّو کو گھورتا رہا ۔

جب حالت یہاں تک پہنچ گئی تو سمّو کے خاوند نے ایک دن اپنے قبیلے کے سردار گزین خان مری کے پاس جا کر توکلی کی ان حرکتوں کا رونا رویا ۔ سردار نے توکلی کے طائفہ کے لوگوں کو بُلا بھیجا ۔ انہوں نے آکر سردار کو بتلایا کہ توکلی سمّو کے عشق میں پاگل ہو چکا ہے ۔ اُسے قابو میں رکھنا ممکن نہیں ۔ بالآخر طے پایا کہ توکلی کے عشق کا امتحان لیا جائے کہ آیا وہ واقعی دیوانہ ہے یا جان بوجھ کر دیوانہ پن کا سوانگ بھر رہا ہے ۔

سردار گزین خان مری خود موقع پر گئے وہاں انہوں نے گھروں سے دُور کسی پہاڑی کھوہ میں توکلی کو لے جا کر بٹھا دیا ۔ دو چار آدمی اور ایسی جگہ چھپے رہے جہاں سے وہ توکلی کو دیکھ سکیں مگر توکلی انہیں دیکھنے نہ پائے اب سمّو سے کہا گیا کہ وہ اکیلی وہاں جا کر توکلی سے ملے ۔ جونہی توکلی کی نظر سمّو پر پڑی ایک چیخ مار کر بیہوش ہو گیا ۔ سمّو نے قریب جا کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کی ۔ توکلی نے آنکھ کھولی اور سمّو کو اس قدر اپنے قریب دیکھ کر پھر چیخا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا ۔ اس طرح جب تک سمّو اس کے پاس بیٹھی رہی وہ آنکھ کھولتا ۔ سمّو کو دیکھتا اور پھر بے ہوش ہو جاتا آخر توکلی کو اس کے حال پر چھوڑ کر سمّو کو واپس بُلا لیا گیا ۔ گواہوں نے سردار

گزین خان کو آنکھوں دیکھا حال سُنایا تب سب کو یقین ہوگیا کہ توکلی واقعی سمّو کے عشق میں دیوانہ ہو چکا ہے۔ مریوں نے سمّو کے خاوند اور بھرولی طائفہ کے دوسرے لوگوں کو سمجھایا کہ وہ اب توکلی کی نیت پہ شک نہ کریں اور نہ اُسے کوئی گزند پہنچائیں۔ وہ عاشق صادق ہے۔ اس سے کوئی بُرا فعل سرزد نہیں ہوسکتا۔ اس دن سے توکلی کا نام مست پڑ گیا۔

اس آزمائش کے بعد سمّو کا خاوند اور اس کے طائفے کے لوگوں نے توکلی مست سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ چند دن وہ سمّو کے خیمے کے سامنے پڑا رہا۔ اور پھر ایک دن اُٹھ کر سر بجو پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ کئی مہینے پہاڑوں وادیوں۔ جنگلوں اور بیابانوں میں دیوانہ وار گھومنے پھرنے کے بعد اُس کی طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ خود کہتا ہے، ے

گو لُستگنت کرّڈے روچ مماہلان	جب کئی دن مجھ پر اس طرح وہاں گذر رہے۔
دست گران جان ءِ زیور دا ٹھلان	تب میں نے اپنے جسم کے زیور (ہتھیار) اور نمائش کے سامان اُٹھائے
ٹنگاں گوں سر لمباں کہیر یگان	میں ان کو کہیر کی ٹہنیوں میں
گوں کہیران دسبز تریں سوّلان	اور دوسرے سبز درختوں کی شاخوں میں
سمّو! تئی لوگانی گورُدگیگان	اے سمّو! جو تیرے گھر کے قرب وجوار میں ہیں لٹکاتا ہوں۔
دشمناں تیر دُوری دُرءِ ستان	اس طرح میں ان دشمنوں کو

دوست ءُ گوں تئی ئیں دل ءُ دارل	تیر کی مار کی حد تک اپنے سے دُور پھینکتا ہوں ۔
	صرف دوست (کی محبت) کو اپنے پیارے دل میں جگہ دیتا ہوں

جنونِ عشق میں جب کسی قدر اضافہ ہوا تو کلی نے سمّو کا نام لے لے کر اس کے عشق میں پُرسوز اشعار کہنا شروع کیے ۔ مست کے اشعار جو ایک دُکھے ہوئے دل سے سوز میں ڈوب کر نکل رہے تھے بہت جلد مشرقی کوہستان کے دُور و دراز علاقوں میں پھیل گئے ۔ ہر جگہ توکلی مست اور سمّو کے عشق کا چرچا ہوا ۔ گویّے گا گا کر اس کے اشعار سُنانے لگے ۔ ان اشعار میں برملا سمّو کا نام لے کر اُس کے حسن و رعنائی ، قد و قامت اور گفتار و رفتار کی والہانہ انداز میں تعریف و توصیف ہوتی تھی ۔ سمّو کے خاوند اور دوسرے رشتہ داروں کو یہ بات بہت بُری لگی اور انہوں نے اسے اپنی بدنامی اور سبکی سمجھا مگر چونکہ وہ قبیلے کے متفقہ فیصلے کے مطابق توکلی پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتے تھے ۔ اس لئے اُنہوں نے اسے ہلاک کرنے کی ایک خفیہ سازش کی ۔ ایک دن جب کہ توکلی ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ گدا نامی ایک شخص نے جو اس ارادے سے اس کے پیچھے پیچھے وہاں تک آیا تھا ۔ پہاڑ کی چوٹی سے اُسے نیچے دھکیل دیا ۔ لیکن یہ دیکھ کر گدا کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پہاڑ کی چوٹی سے توکلی ایسے نیچے آیا ۔ جیسے کوئی پرندہ اُڑ کر زمین پہ جا بیٹھے ۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرکے توکلی مست کہتا ہے : ــــ

یک گوگرسے ماد یک گورسے گدا	ایک طرف میں اور ایک طرف گدا
ماھر دو مرد جرائی ءُ نہوں سُتاءُ	ہم دونوں اچھی طرح ہوش میں نہیں ہیں۔

اس واقعے کے بعد پھر زندگی بھر کسی شخص نے توکلی مست کو نقصان پہنچانے کا خیال نہیں کیا۔

اس قسم کے کئی اور واقعات سے سادہ دل لوگ اس کے صاحب کرامات ہونے کے قائل ہوئے۔ اب سمو کا خاوند بھی اُس کی عزت کیا کرتا اور ہر طرح سے اُس کا خیال رکھتا تھا۔

توکلی مست کو اب کسی جگہ قرار نہ تھا۔ آج ادھر اور کل اُدھر بلوچستان کی وادیوں، کوھستانوں اور میدانوں میں گھومتا اور بلوچوں کی محفلوں میں اپنے اشعار سناتا پھرتا تھا۔ اس نے ڈیرہ غازی خان کے بھی کئی چکر کاٹے۔ ایک دفعہ جبکہ وہ سردار جمال خان لغاری کے ہاں مقیم تھا۔ سردار جمال خان کو ایک دن اُسے آزمائش میں ڈالنے کا خیال آیا۔ سردار یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا مست سمو کے عشق میں صادق ہے یا محض دکھاوے کے لئے اُس نے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ اُن دنوں ڈیرہ غازی خان میں موراں نامی ایک حسین و جمیل اور تیز و طرار کنجری رہتی تھی چنانچہ اس کنجری موراں سے یہ طے کیا گیا کہ رات کو جب اُسے بلایا جائے گا تو وہ ہر طرح کے ماہرانہ ناز و ادا اور غمزے دکھا دکھا کر مست کو اپنی طرف راغب کرے۔ رات کو جبکہ مست سردار جمال خان کی مجلس میں بیٹھا تھا۔ موراں کو اس کمرے میں جس میں توکلی

کو تماشا کر بٹھادیا گیا۔ جب مجلس ختم ہوئی اور توکلی اپنے کمرے میں آیا۔ جہاں موراں موسنگار کئے اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ تو سردار کے نوکروں نے جو اس تاک میں تھے باہر سے اُن پہ دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ اب کنجری موراں اپنے ناز و نخرے دکھانے لگی۔ غرضیکہ مست کا دل لبھانے کے لئے اس نے بیسیوں جتن کئے لیکن مست پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ گُم سُم بیٹھا رہا۔ سردار جمال خان کے نوکر خفیہ سوراخوں سے یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ مست جلال میں آگیا۔ مست بدمست ہو کر کف وردن سانڈ اونٹ کی طرح بڑبڑانے لگا۔ اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگا مست کا یہ حال دیکھ کر موراں کی چیخ نکل گئی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مست کہتا ہے: ۔

کنجریانی مہتریں موراں	کنجریوں کی مشہور ترین کنجری موراں
گیت گردان ءُ چو چاردھی ماہ ءَ	چودھویں کے چاند کی طرح بڑھتی ہوئی
گھُمبران ءُ چو تانپی نودان	ساون کی گھٹاؤں کی طرح جھومتی ہوئی
جاٹ دنت وشبوئیں کھتوریان	اپنی عنبریں زلفوں کی خوشبو بکھیرتی ہوئی
گرن انت گوں سہتائیں ہمالیان	سونے کے زیورات میں چلتی ہوئی
	میرے پاس آئی۔ اور کہنے لگی۔
مست امن تئی یاں، تئی نیاں کس ءِ	اے مست! میں تیری ہوں، کسی اور کی نہیں۔
نیم شپ ءَ پاسان ترا لوا رنیاں	آدھی رات کے وقت میں تیرا دل بہلایا کروں گی
گار بیت مست دلکھری گرندیت	مگر مست چیخ اٹھتا۔

اور بادلوں کی طرح گرجنے لگتا ہے۔

دوسرے دن جب سردار جمال خان کی مجلس میں مست آتا ہے۔ تو ناراض اور غصے سے بپھرا ہوا ہوتا ہے۔ اِس حالت میں سردار جمال خان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؛ ـــہ

اومنی سرداراں کوی ٹیناں	لے میرے طاقتور سردارو!
زورمن ءِ کوٹھی ءِ مہ تنکارت	مجھے زبردستی کمرے میں بند کرکے پریشان نہ کیا کرو۔
دل گریں بھنگالوں مہ پیارت	مجھے دل کو گرفت میں لینے والی بھنگ مت پلایا کرو۔
سمو ءِ ھاداں من نہ بوریناں	میں سمو کے ساتھ کیا ہوا اپنا عہد و پیماں
پہ ڈیرہ ءِ مہیبی ماگیں رنانی	ڈیرہ (غازی خان) کی ان بھینس جیسے تھنوں والی عورتوں کے لیے کبھی نہیں توڑوں گا۔
دوست ھانت کہ جاذی اَدا بنت	دوست وہی ہیں جن کی دوستی ابدی ہو
سوھری چار روچی نہ پادارنت	یہ چار دن کی حسیناؤں کی دوستی پائدار نہیں ہوتی۔
کنجریانی چارشپی روک ئنت	کنجریوں کی دوستی بس دو چار راتوں کی لطف اندوزی کا ہے۔
بہلاں لے مولد بنت مریانی	یہ قوم اس قابل ہیں کہ مرلیں کی

كنیزیں بنیں ۔

پرتل ہو مہستا گر نہ لنکھانی	میں تو انہیں سمو کی طرف سے خوشخبری لانے والے قاصد کو انعام میں دینا بھی پسند نہ کروں
سمل مے شیشائے شرابانی	میری سمو تو ایک مینائے شراب ہے
گورگیں سرو لائے ڈگھا رانی	میدانوں کی ایک گوری ہرنی ہے
کدہ میں چہانی گھٹلامانی	میں تو بس اُس کی کٹورے جیسی آنکھوں کا غلام ہوں ۔

اس نظم میں توکلی آگے چل کر سردار جمال خان سے کہتا ہے کہ اگر آپ کو واقعی مجھ سے ہمدردی ہے اور آپ میری بھلائی چاہتے ہیں ۔ تو مجھے ان کنجریوں سے بہلانے کی بجائے ا سے

دئے من ءَ جلیتی گھوڑوی ٹولے	تیز رفتار گھڑسواروں کا ایک دستہ مجھے دیدے
من سرءَ بنداں شُدھویں پولے	میں اپنے سر پر ایک ریشمی پگڑی باندھ لوں ۔
بانگو ءَ ریچانی ، سدیں سواران	سو گھڑسواروں کے ساتھ علی الصبح ان پہ لوٹ پڑوں
پھُردی من ارگونان جتیں یاران	میرے گھڑسوار ساتھی پھروئیوں کو گھاٹیوں کی طرف دھکیل دیں یہ سواروں کا کام ہے ۔

کارھے رنگیں زیبنت سرداران	اور ایسے کام ہی سرداروں کو زیب دیتے ہیں ۔
سمّل گوں سموران سیر کنائیننتیں	اے کاش ! آپ سمّو کو جی بھر کر سونے کے زیورات پہنا کر
توکلی مست ءَ را دیائیننتیں	توکلی مست سے بیاہ دیتے ۔

سردار جمال خان لغاری توکلی مست کی خواہش پوری نہ کر سکے ۔ مگر سردار مرتضیٰ خان بگٹی نے اسے پورا کرنے کو عملی قدم اٹھایا ۔ اس نے مست کے لئے شادی کا بہترین لباس تیار کروایا ۔ سمّو کے لئے سونے کے زیورات اور اطلس کے جوڑے بنوائے اور بالآخر ایک دن بگٹی گھڑ سواروں کا ایک مسلح دستہ ، مست کو ساتھ لے کر مری علاقے کی طرف روانہ ہوا ۔ مری قبیلہ کے علاقے کی حدود کے اندر پہنچ کر دستے نے ایک ایسے مقام پر ڈیرہ ڈالا جو علاقہ مری اور علاقہ بگٹی کے عین درمیان واقع ہے ۔ یہاں پر بلوچی رواج کے مطابق دنبے ذبح کئے گئے ۔ اور سمّو کی غیر موجودگی اور لاعلمی میں مست کے ساتھ اس کی شادی کی رسم ادا کی گئی ۔ تب توکلی مست نے بگٹی گھڑ سواروں سے کہا کہ اب وہ واپس چلے جائیں اور اپنے سردار کو اطلاع دیں کہ سمّو کے ساتھ توکلی مست کی شادی شایان شان طریقے سے کرا دی گئی ہے ۔

اب وہ وقت آیا جب توکلی مست ، سمّو کے عشق کی آگ میں کئی سال تپ کر کندن بن چکا تھا ۔ سمّو کی یاد کے سوا اس کا اور کوئی سرمایہ نہ تھا ۔ سمّو کے عشق میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز صحرا بہ صحرا کو بہ کو پھرنا اس کا واحد شغل رہ گیا تھا ۔ ڈیرہ غازی خان سے قلات تک اس وسیع و عریض کوہستان اور

بے آب و گیاہ میدان کا چپہ چپہ اس نے چھان مارا۔ لیکن سمو کا ثانی اُسے کہیں نظر نہ آیا۔ اور نہ ہی سمو کی یاد کو لمحہ بھر کے لیئے وُہ اپنے دِل سے بھلا سکا اسی عالم سرمستی و مدھوشی میں اکوھستان مری سے بہت دُور سمو کو یاد کر کے وُہ کہتا ہے۔

ے

بگواں ماؤ بگو انت بیلی	کہاں ہیں ہم اور کہاں ہے ہمارا دوست
گندنسیب ءَ کہ تا گو بُرّ ءُ ٹیلی	اب دیکھ کر نصیب کس طرف کو ہمارا رُخ پھیرتا ہے۔
ما پکیرانی وار تکاں گولی	ہم درویشوں کی طرح چکر میں ہیں
شاہ ءَ گرّ دیں سمّل ءَ میلی	خدا ہیں پھر گول چہرے والی سمو سے ملا دے۔
سمو! تئی لوڈانی بلا زیراں	سمو! میں تیری مستانی چال کی بلائیں لے لوں۔
مہری آش دیدہ کاں مہ روانت	میری محبت تیری آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔
آدلی بنداں مہ سِندانت	اور میرے دِل کے تاروں کو توڑ نہ دے

بولان سے ہوتا ہوا ایک دفعہ توکلی مست قلات پہنچا۔ قلات کے خان میر نصیر خان دوئم کے دربار میں گیا۔ نصیر خان کو نیک دُعائیں دیں اور پھر وہاں سے ناگاھو پہاڑ کی طرف نکل گیا۔ نصیر خان دوئم کے عہد میں قلات خوشحال تھا اسی کی طرف اشارہ کر کے مست کہتا ہے ؛

ے

شپکّرک سنگھر بنتی ءُ داماں ءُ شلنت
رات کی دُور کوندنے والی بجلیاں تڑپ تڑپ کر دامنِ کوہ پر مینہ برساتی ہیں ۔

میر نصیر خان ءِ پیشدر محل ءُ کنت
بادل، میر نصیر خاں کے اونچے محل کے در و بام پر سایہ کرتے ہیں ۔

گواراں سنّی ءُ مہشرب سیوی ءُ شلنت
اور پھر سنّی پر جا برستے ہیں ۔ سبی کے مشہور شہر پر مینہ کی جھڑی لگاتے ہیں ۔

اس طرح گھومتے پھرتے بلوچستان کے پہاڑوں اور وادیوں سے نکل کر توکلی مست سندھ جا پہنچا اور پھر وہاں سے ملتان اور لاہور سے ہوتا ہوا دہلی گیا دہلی میں اُسے ایک دیوانہ فقیر سمجھ کر جیل میں ڈال دیا گیا جیل جاکر اس کی بلوچیت کی رگ پھڑک اٹھی ۔ اُسے اپنے مری قبیلے کے جوانمرد یاد آگئے ۔ اس نے خیال کیا کہ اگر آج وہ مری اُس کے ساتھ ہوتے تو کون اُسے جیل میں ڈال سکتا تھا

کہتا ہے ؎

شہر دلّی انت چاش و واشانی
دلّی کے شہر میں مدام شور و غل رہتا ہے

پچ انت ھندی سیاہ نگیں کانی
وہاں کالے اور بیکار ہندوستانی جمع تھے ۔

ھکل و ھوڑانٹ یزیدانی[1]
یزیدیوں کی بھی چیخ و پکار تھی

۱؎ انگریز کے سپاہیوں کی

دھکہ دُ دھوڑاں اُٹ لگھوانی	بزدلوں کی ریل پیل تھی ۔
گوں نہ مُتاں گوں من نچہ مریانی	مگر افسوس کہ مریلیاں کے بیٹے میرے ساتھ نہ تھے ۔

ایک دفعہ جب توکلی مست سندھ سے واپس بلوچستان کی طرف آرہا تھا۔ اُسے کونجوں کا ایک جھنڈ آسمان پہ اُڑتا ہوا نظر آیا۔ جو موسم گذار کر اپنے وطن کی طرف واپس جارہا تھا۔ اس وقت مست کے دل پر جو کیفیت گذری وُہ خود اس کی زبانی سنیئے کہتا ہے : ـ

کونج اپا سندھ ءَ گردنت ولدائیں موسم ءَ	کونجیں دوسرے موسم میں سندھ سے واپس لوٹ رہی ہیں ۔
کونجاں کتا ریت ، من گوں نے کتار ءَ رُوان	کونجیں ایک قطار میں ہیں ۔ میں بھی ان کی قطار میں شامل ہونا چاہتا ہوں ۔
اَنگاں کونجی وَ کر ءِ سنگت بیتگان	میں بھی کونجوں کے جھنڈ کے ساتھ جا ملا
کونج پہ سیل ءَ ، من ونتی دوست ءِ گندگ ءَ	کونجیں سیر کرنے جا رہی ہیں ۔ اور میں اپنے دوست کا دیدار کرنے جارہا ہوں
کونج پہ بال ءَ ، من پہ پادگام ءَ رُوان	کونجیں اُڑ رہی ہیں ۔ لیکن میں پیدل جارہا ہوں ۔
کونج کراَنت مئے دل ءِ درمان نبنت	کونجیں خوشی سے کرلاتی ہیں لیکن اُن کی یہ کرلاہٹ میرے دل کا درمان ہرگز نہیں ہو سکتی ۔

مۓ دل ءِ درمان سمّل ءِ ۏشیں کھندگنت	میرے دل کا درمان تو صرف سمّو کی میٹھی ہنسی ہی میں ہے۔

کہتے ہیں کہ توکلی مست نے اپنا یہ دستور بنا رکھا تھا کہ ہر سفر یا چکر سے واپسی پر سمّو کے دیدار سے اپنی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور حاصل کرنے کو ایکدفعہ اس کے ہاں ضرور جاتا۔ سمّو ایک خانہ بدوش عورت تھی اس کا پھروی طائفہ بھی بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کی نسبت سے کافی مالدار تھا۔ خانہ بدوش کی زندگی کا دارومدار بھیڑوں اور بکریوں کی پرورش پہ ہوتا ہے۔ اور بھیڑیں سبز گھاس اور پانی کے بغیر رہ نہیں سکتیں اس لیے جہاں سبز گھاس اور پانی ہے وہاں خانہ بدوشوں کے خیمے لگتے اور ریوڑ چرتے رہتے ہیں اس لحاظ سے سمّو کا قیام بھی مست کی طرح ایک جگہ نہیں ہوتا تھا۔ کبھی اس وادی میں تو کبھی یہاں سے دس بیس میل دُور کسی اور اونچے پہاڑ کے دامن میں، لیکن جہاں بھی سمّو ہوتی مست ایک دفعہ وہاں ضرور پہنچ جاتا۔

ایک دفعہ مست کا گذر ایک ایسے مقام سے ہوا۔ جہاں کسی وقت کچھ دنوں کے لیے سمّو رہ چکی تھی۔ اس کے خیمے کے نشان اب تک وہاں پائے جاتے تھے مست کہتا ہے؛ ؎

موسم ءَ روچے تھدڑی کوہ ءَ اڈگران	موسم میں ایکدفعہ میں تھدڑی پہاڑ پر گیا۔
کایاں وکوشتاں۔ سمّوتی کوھیں ماندڑو ءَ	سمّو! وہاں میں تیرے چھپروں کے چبوترے پر جا کھڑا رہا۔
بنگ نزگالائنت ابیدی چِہ ڈیّیں بانک ءَ	گروہ پتھر تو اپنی موتیوں جیسی مالکن کے بغیر

مجھ سے بات نہیں کرتے

چاہو ءُ زیراں ہن دل ءِ بنداں برانزدیناں
سوچتا ہوں، کہ بندوق اٹھا کر لپٹے
دل سے چنگاریاں اڑا دوں

سواتئی کرعیں پانڈو ءُ عرناں سحو کناں
اور سمو! تیرے پتھروں کے چبوترے کو
اپنے خون سے سرخ کردوں

ایک دفعہ جب توکلی مست سمو سے ملنے گیا تو بھیڑیوں نے اسے اپنے خیمے کے قریب نہیں آنے دیا۔ مست خیموں سے دُور ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر بیٹھ گیا کہتا ہے کہ: ؎

گرنگاں سن گوں وتی وشئی میں دل ءَ
میں سفر سے خوشی خوشی واپس آیا

روح ءُ سوجانی ہمّل بوہیں گماں
میری روح سمو سے ملنے کے لئے
تڑپ رہی تھی

بیتگاں پدر، نہ اِشکنت پھروئی گگورڑواں
جب میں انہیں نظر آیا
تو بھیڑیوں نے مجھے سمو سے ملنے نہیں دیا

دیدگاں کوربنت، پہ شپاں سر شوں مبت
خدا کرے وہ بھیڑئیے اندھے ہوجائیں
راتوں کو انہیں راستہ دکھائی نہ دے

اندرہ وو دمتیاں سمو اتئی لہیں گماں
سمو! تیرے خون رلانے والے غموں سے
نڈھال میں واپس آیا۔

گرتنگاں سن کرنشتگاں بُرزیں کوہ سرءَ
اور ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ
کر بیٹھ گیا۔

یک دمانے من بانک ءِ چاری پینگاں	تھوڑی دیر میں اپنے دل کی مالکی کی راہ دیکھتا رہا۔
سموُئے ڈان ءِ پیہی من ارگموئیں گرءُ	پھر میں نے دیکھا کہ سمو جھومتی ہوئی آئی
دگ دیر بیتہ یا خُدائیں من چوں کناں	اور سبز چٹانوں میں جا داخل ہوئی اس تک پہنچنے کا راستہ مجھے دُور پڑتا تھا یا خدا! اب میں کیا کروں!
بادشاہ پیر دکوہ ءِ سوری ءِ گوانک جناں	میں نے پیروں کے بادشاہ[1] اور پیر سوری[2] کو مدد کے لئے پکارا (غیب سے ایک شخص میری مدد کو نمودار ہوا)
اے ھما مردانت کیت ئی سُوزیں بادن ءَ	یہ وہی شخص ہے جو ہمیشہ اپنی سبز گھوڑی دُلدُل پر سوار اور کندھے سے ذوالفقار
دُلدُل ءِ سوارانت، کوپگ ءَ گونی ذلفیکار	لٹکائے ہوئے آتا ہے۔ میں نے کلمہ پڑھا اور سبز چٹان سے نیچے
کلوءِ دات دستھوں ارگموئیں گرءُ	چھلانگ لگا دی کودتے وقت لمحہ بھر کے لئے
مادی لماں ءَ، داشتگنت جران گرشم ءُ	سبز چٹان نے میرا دامن پکڑ لیا

۱۔ غوث الاعظم دستگیر۔ ۲۔ مری بگٹی علاقہ کی ایک زیارت گاہ بھی ہے۔

لیکن ایک لمحہ بھر کے بعد جب زمین پر
میرا دھماکا ہوا ۔

دریباگے مالُت، ہمَل یُ "رکھ اللہ" کنتہ	تو سمّو نے "رکھ اللہ" کی صدا لگائی (اور پھر مجھ سے کہنے لگی)
شیلینۓ درنگاں روچے مارا بدنام کنے	چٹانوں سے اس طرح کود کر ایک دن تم مجھے بدنام کردو گے ۔
مچھانۓ بدنام مُ دتی جیڈی ہمسران	(اس نے جواب دیا) کبھی نہیں ! تم اپنی ہم عمر سہیلیوں میں کبھی بدنام نہیں ہوگی
مک ہو دوستی ہُ، وت خدا شرمندگ کنتہ	سچی محبت کرنے والوں کو خدا کبھی شرمندہ نہیں کرتا ۔

زندگی بھر کی جدائی اور دردِ فراق کے خونین صدموں سے نڈھال ہو کر توکلی مست کی بے چین روح ایک دفعہ پکار اٹھتی ہے :۔

جی تئی لوڈاں ھلیساں ءُ تئی دُشتیں کھندگاں	سمّو ! میں قربان تیری متوالی چال پر اور قربان تیری پیاری گفتگو اور میٹھی ہنسی پہ تیرے خرامِ ناز پر
گرہان پہ تئی لوڈاں اکھولو، کاھنا وبارکھم دنگا	کوہلو، بارکھان اور کاہان کے دیہات بھی قربان ہوں ۔
گرہان پہ تئی لوڈاں انو توکلی مست ہو دیدگان	توکلی مست کی آنکھیں بھی تیری سبک خرامی پر نثار ہوں
درحسن ءُ تہلیت سموا بیا مجھو ھالُ درکیلا	اے سمّو ! میری روح مجھے یہاں آرام سے رہنے نہیں دیتی ۔ آ کر ان پہاڑوں سے نکل چلیں ۔

بیا نی بیلی! من ترا راہے شوں دیاں

آ، اے میرے دوست! میں تجھے
بھلائی کا راستہ دکھا دوں۔

بلوچستان کے خشک پہاڑوں، بے آب وگیاہ میدانوں اور وادیوں میں اپنے ریوڑ کے پیچھے ننگے پاؤں پھرنے والی سانولی سلونی سمو کے خدو خال کیا تھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں البتہ توکلی مست کا پرسوز دل اُسے کیا سمجھتا تھا اور اس کی شاعرانہ نگاہیں اُسے کس روپ میں دیکھ رہی تھیں۔ وُہ قابلِ غور ہے مشہور کہاوت ہے کہ "لیلیٰ کو مجنوں کی نظر سے دیکھا جائے" تب ہی اُس پیکر خاکی کے ملکوتی حسن وجمال کا صحیح نظارہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگرچہ عام ظاہر بین نگاہیں سمو کو ایک ایسی خانہ بدوش عورت کے روپ میں دیکھتی رہیں جو صبح دم اُٹھ کر آٹا پیتی۔ پھر مشکیزہ کندھے پر ڈال کر پاس کے کسی پہاڑی چشمے سے پانی بھر لاتی آگ جلا کر روٹیاں پکاتی، بھیڑ بکریوں کا دودھ دوھتی، بلوتی اپنے خاوند اور بچوں کو کھانا کھلاتی اور پھر اپنا ریوڑ ہانک کر پہاڑوں میں چرانے لے جاتی لیکن اس سمو کو ایک عاشق صادق ایک شاعر رمز آشنا و باطن بین کی دُھانی نگاہیں جس روپ میں دیکھ رہی تھیں وُہ ایک اور چیز تھی، وُہ ریوڑ چرانے والی سمو نہ تھی بلکہ ایک حسن مجسم، ایک پیکر نور ایک مرقعِ رنگ و بو اور ایک ایسی مینائے کیف و سرور تھی جس کا صحیح نظارہ صرف ایک مستِ الست اور ایک شاعر باطن بین ہی کر سکتا ہے، سمو توکلی مست کی نگاہوں میں یہ سمو نہیں تھی جسے مادشما ایک خانہ بدوش عورت کے پیکر گوشت و پوست میں دیکھتے تھے بلکہ وُہ ایک ایسا پیکر نور تھی جسے ایک باکمال شاعر کے تخیل نے جنم دیا تھا۔ وُہ سمو کیا تھی! مست کی زبان سے سنیئے۔ وُہ کہتا ہے: ــــ

دوستءِ منی جانڈران ءُ لیموان یکے

رستہ من ءِ ارگھوَنی گرّی سایان

دروشم ءِ دنت چو تاہنی لودان

درشپی چو سرگوازان سمینیگان

شنبی شینگنت چو زامری جیرّان

پنّی گردنت چو شمل ءِ دیم ءَ

دارکھی زنتی، بارگیں سُرین ءَ
تُرندی ءُ گنت چو آمُرداتگیں تیگھ ءَ
واجہ پہ تو پیک ءَ دل ءَ زیرنت
پہ جزیدانی جنگ ءِ سامان ءَ

سبز انت چو توتیان رکائینان

میرا دوست (سمّو)

جانڈان پہاڑ کے لیموؤں میں سے
ایک لیموں ہے،
اُس نے سبز چٹانوں کے سائے میں
پرورش پائی ہے،
اُس کا کُشنرہ ساون کی گھٹاؤں سا ہے
وہ نسیم سحر کے لطیف جھونکوں کی طرح
اٹھلاتی ہے۔
اس کے گیسُو، زامر کی بیلوں کی طرح
پھیلے ہوئے نیچے کو لٹکتے ہیں۔
زامر جس کے پتّے سمّو کے چہرے
کی طرح گول ہیں۔
جس کی ٹہنیاں سمّو کی کمر کی طرح باریک
سان چڑھی ہوئی اس آبدار تلوار کی طرح
کڑکیلے ہیں۔
جسے، اس کا مالک
جبکہ وہ یزیدیوں کے خلاف جنگ
کی تیاری میں ہو،
ہتھے اور سیح ہاتھ سے جانے نہیں دیتا
میرا دوست، ان سبز طوطیوں
کی طرح خوبصورت ہے۔

ٹلیت مں پھلاں بادشاہیان	جو شاہانہ گلستانوں میں اڑتی پھرتی ہیں
دوست منی توکیں توک سراں ٹوک انت	میرا دوست ، نئے مہینے کے ھلال سے بھی نیا ہے ۔
دیدگان مستیگاں تل و توک انت	مست کی نگاہوں میں
توک انت مں شاہ ءِ چادر ءِ نیام ءَ	وہ خدا کی چادر میں لپٹی ہوئی ہے ۔

سمّو کی طرح توکلی خود بھی ایک خانہ بدوش چرواہا تھا ۔ وہ کوئی عالم یا لکھا پڑھا مُلا نہ تھا البتہ وہ ایک فطری شاعر ضرور تھا ۔ بلوچی اس کی مادری زبان تھی ۔ بلوچ اس کی قوم اور بلوچستان اس کا محبوب وطن اس کی محبوبہ بھی ایک بلوچ عورت تھی ۔ اس کی طرح بادیہ نشین اور بادیہ پیما یہی وجہ ہے کہ توکلی کے ہر شعر سے بلوچیت ٹپکتی ہے ۔ یہاں پر چونکہ ہمارا موضوع بیان توکلی کی شاعری نہیں بلکہ وہ داستان عشق ہے جو اس کے اور سمّو کے نام سے زبان زد عام ہے ، اس لئے ہم توکلی کی شاعری کو زیر بحث نہیں لاتے اس کے کلام سے صرف ان اشعار کو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو اس داستانِ عشق و محبت کی روئداد بیان کرنے میں ہمارا ساتھ دیتے ہوں ۔

توکلی کا دوست سمّو ، سر سے پاؤں تک ایک بلوچ عورت ہے ، اس کا چہرہ اس کے خدوخال اس کا قد و قامت اور سراپا ۔ اس کی رفتار و گفتار ۔ اس کا لباس اس کے زیورات غرضیکہ اس کی ہر ادا بلوچانہ ہے ۔ توکلی نے جن الفاظ میں سمّو کی تعریف و ستائش کی ہے اور اس کی شان میں جو نظمیں کہی ہیں ، ان کو سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے بلوچستان کے کوہ و صحرا پہاڑی ندیوں اور چشموں آب و ہوا اور موسم خانہ بدوشانہ زندگی اور بلوچانہ وقار و تمکین اور ذہنی جھکاؤ

ے آشنا ہونا ضروری ہے۔ جب تک ایسا نہ ہو، توکلی کے اشعار سے کماحقہٗ محظوظ ہونا مشکل ہے، مثلاً جب سمو کا سراپا بیان کرتے ہوئے توکلی کہتا ہے، کہ: ؎

	میرا دوست
دوست منی ڈُلی ئے شہد و شیرانی	شہد اور دودھ سے بھری ہوئی ایک پیالی ہے۔
ملگی بالادی سمارانی	اس کی قامت زیبا سرو کی سی ہے۔
	اس کے گلے میں ہزاروں روپے
مُن گوڑائی کنڈی اِن ہزارانی	کا قیمتی ہار ہے۔
	اس کی مستانی چال سے زمین ہلنے
پیہری لوڈو اِن ڈگھارانی	لگتی ہے۔
	میرا دوست ا
دوست منی روشنائی تہارانی	اندھیروں کی روشنی ہے۔
جیئڑی چو دا شینگ ئے چلوکیں ئے	وہ سانپ کی طرح لہراتی اور بل کھاتی ہے ڈری ہوئی ہرنی کی طرح اچھلتی ایسے جھوم جھوم کر چلتی ہے جیسے
مٹی اچو سرِ دان ئے ترھوکین ئے	کسی تیز رفتار سانڈنی پر سوار ہو،
سوار اِن امن مہری ئے ژروھوکین ئے	جب بولتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ
وڈجی چو شہنائی ئے دھوکین ئے	کوئی شہنائی بج رہی ہو۔
لانٹ کنت پیہرایاں گردِ کینان	اور جب اپنی مخمور اور مسحور کن آنکھیں گھماتی ہے۔
دُراہ کنت مئونیاں مردِ کینان	تو قریب المرگ بیماروں کو شفا دیتی ہے
دست کیرتہ بالیاں گو زرکیناں	پاس سے گذرنے والے پرندوں کو

وُہ اپنے ہاتھ سے پکڑتی ہے۔

ھوش کنت بےھوشاں گنوکیناں
بے ہوش دیوانوں کو ہوش میں لاتی ہے

چراگاہوں میں چرنے والی کرزدر
ترُندکنت ھُولیاں چروکیناں
اور سست گھوڑیوں کو
شوخیاں بخشتی ہے۔

نرم کنت آسیاں ترھوکیناں
اور ڈری ہوئی شوخ ہرنیوں کو
رام کرتی ہے۔

یا جیسا کہ ایک اور جگہ کبوتر کو خطاب کر کے مست کہتا ہے: ؎

اے سبز پرندے!
مُرگُکو سبزیں بہل زھیرانی زاریاں
فراقِ یار میں فریاد کرنا اب چھوڑ دے
اور چٹان سے نیچے اتر آ!

ایر کپ بیادرنگ ءِ من ترا ربالوکناں
کہ میں تجھے اپنا قاصد بناتا ہوں۔

میرے سلام لے
زیر سلاماں، شُل پرے ھیناریچاں
اور ان بے آب و گیاہ میدانوں
پر سے اڑتا ہوا
اس کے پاس جا؟

پارگُل ءُ الیشنت سھر ئتی چمّانی لوار
میرے اس دوست کی نشانیاں یہ ہیں
اس کی آنکھوں کے ڈورے سرخ ہیں

اس کی ناک سُتواں سُرمے کی
شیبگیں پوزبزن، جاڑمی یں بُرواناں اَدار
سلائی جیسی۔

اُس کے دونوں ابرو باہم پیوستہ ہیں

ءِ تلیں تھادیز نہ نگیں مں دوست پسینگ ءُ — میرے دوست کے سینے پر

تین تہوں کا تعویز آویزاں ہے

کٹکیں تئو کے مانءِ مں کونجیں گردن ءُ — اس کی کونج کی جیسی گردن میں

سفید چاندی کا طوق پڑا ہوا ہے

ھر دوئیں دستاں سنگی آبگینہ ءُ بلنت — اس کے دونوں ہاتھوں کے کنگن

آگ کی طرح روشن ہیں۔

جیگ کھرذئی ءُ داشتگنت دگانیں گوران — اس کی ابھری ابھری چھاتیوں نے

گلکار قمیص کو سینے سے اوپر اٹھا رکھا ہے

سینگ ءُ تھادیز نہ شپگردی تاٹیاں جنت — اس کے سینے پہ آویزاں تعویذ

رات کی بجلی کی طرح کوندتا ہے۔

وُل وُلیں پچیراں بولنی کمند کمیں وپ ءُ — اس کے گیسو بل کھائے ہوئے ہیں۔

اور اس کی ناک میں پڑا ہوا آویزہ

اس کے لب ہائے خنداں پہ لٹک رہا ہے

سبک کمی تہ کرمیں چابکاں جنت ، — سمو کی چاہت۔

مجھے زنجیری چابکوں سے مار رہی ہے

ترانہ شاعرانہ تشبیہات و استعارات کو سمجھنے کے لئے بلوچستان کے اسوقت کے ماحول اور شاعر کے ذہنی جھکاؤ کو ایک بلوچ کے نقطۂ نظر سے دیکھنا اور سمجھنا ضروری ہوجاتا ہے ، توکلی کو اپنی محبوبہ جیسا کہ ہونا چاہیئے بہت ہی پیاری ہے جب وہ سوچتا ہے کہ اسکی محبوبہ دن کو بھیڑ بکریاں چراتی اور ایک عام خانہ بدوش عورت کی

طرح گھر کے دوسرے تمام کام کاج کرتی ہے. تو اُسے دکھ ہوتا ہے ۔ وُہ اپنی محبوبہ کو آرام و آسائش کی اُن تمام نعمتوں سے ہمکنار کرنا چاہتا ہے جو اُس وقت اس کے تصور میں آسکتی ہے ، اس لحاظ سے وُہ ترقی پسند ہے لیکن وُہ نعمتیں کیا ہو سکتی ہیں اور آرام و آسائش کی وُہ صورت کونسی ہے ، جس کی توکلی مست لپنے دوست کے لئے تمنا رکھتا ہے وُہ اُس کی اپنی زبانی سنئے ۔ کہتا ہے ؛ ـ

میری محبوبہ

دوست نی سکیں ھزمستاں لوٹیت	بہت زیادہ خدمت گذاری چاہتی ہے
	نوزائیدہ طفل کی طرح اُسے دیکھ بھال
چیبٹ لوٹیت چونچگی نجکت ءُ	چاہیئے اُ بھیڑی کی طرح اسے پرورش چاہیئے
سائنبد لوٹیت چو کُرتیں بہان ءُ	میری محبوبہ
جوان نجانت درست گوں نُزگل مزان	بکریاں چرانے والوں کے ساتھ
	اچھی نہیں لگتی ۔
بینیں گوں دُرگوشیں مہیر یال	کاش ! وُہ کانوں میں سونے کی بالیاں
	ڈالنے والی
لرزتیں استارءُ سوئیلیگ ءُ	مہیریوں کے ساتھ ہوتی
	(تاکہ اس کے بھی کانوں میں سونے کی بالیاں)
	زھرہ ستارے کی مانند لرزتی رہتیں ۔
بُلکتیں دوست من گزدری بھیٹاں !	میری محبوبہ
	پہاڑی ندیوں کے کئی کے جنگلوں کے

ما جتنیاں ۔ اونٹ چرانے والوں کی عورتیں ۔

ھنذی بیتیں سں کھور دپی کچّان

اں دو گنگاتی بزیں سایاں

بگہ ءَ تراچپولی کنتیں ھیڑّان

وھنز تیں زردواں سہاگیناں

ھُڑکتیں شیرداریں لکوریان !
شیرکتیں ماودھا کتیں ملکان
بیگھاں استیاں مچ ءَ بندان
باگہ ءَ ھرشی کہکراں گرنداں

پاڈکتیں دُرداں نگ اَسلانی !

بروُتیں گوئر سوگہاراں سمینگاں

درمیان کی بلندیوں پر ٹہلتی رہتی
پہاڑی ندیوں کے دہانے کی آبادیوں
میں سکونت پذیر ہوتی ۔
(اور دوپہر کو) ہم دونوں
چٹانوں کے گھرے اور ٹھنڈے سایوں
میں بیٹھ کر سستاتے
اور شام کو جب
زرد رنگ کی دودھیل اونٹنیاں
بلبلاتی ہوئی آتیں
اور اونٹنیوں کے بچے اچھلتے کودتے تو
ہماری دودھ پینے کی لکڑی کی پیالیاں
دودھ سے لبالب بھری جاتیں
پھر ہم مل کر گانا گاتے
اور فرشتے ہماری آواز سے آواز ملاتے
رات کو جب بادل چھا جاتے
اور صبح کی گھٹائیں گرجتی ہوئی
بلندیوں پر سے نیچے آکر مینہ برساتیں
تو میری موتی جیسی محبوبہ اُٹھ کھڑی ہوتی
بادلوں کے برسائے ہوئے
میٹھے پانی سے بھرے ہوئے
تالاب پر جاتی ۔

زیارت کنیتں لال ءِ لیلوئیں دستاں — میرے دوست کے خوبصورت ہاتھ
پہلے اس پانی کو چھو کر زیارت کرتے

پیالہے نوش کنت کاگھدیں رکان — پھر وُہ ایک پیالی بھر کر
اپنے کاغذی ہونٹوں سے لگا کر پیتی

یکے پہ نیت ءَ خدائی ءَ — ایک پیالی خداؔ کے نام پر
یکے پہ نیت ءَ گنوگنیگ ءَ — اور ایک اس دیوانے کے لئے نکالتی

بیت منی تنی ئیں دِل ءَ ہچیت — وُہ پانی، میرے پیاسے دل تک پہنچ کر
میری پیاس بجھاتا۔

اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ سمّو کے دل میں بھی مست کے لئے محبت کا جذبہ پیدا ہوُا اور وُہ بھی مست کے لئے پریشان اور اُداس رہنے لگی۔ مستؔ کو بھی غالباً سمّوؔ کی اس وارفتگی عشق کا احساس ہوُا تھا۔ اسی لئے تو کہتا ہے ؎

ما بلوچوں میں یہ رواج ہے کہ جب موسم میں پہلی بار بارش کا تازہ پانی اُن کو پینے کو ملتا ہے تو وُہ پہلا گلاس یا چُلّو بھر کر خدا کے نام پہ زمین پر انڈیلتے ہیں۔ جیسا کہ کسی زمانے میں ایران میں بھی یہ رواج تھا کہ شراب پیتے وقت پہلے جام میں سے کچھ شراب خاک پہ گرا دی جاتی تھی۔ حافظ شیرازی کا اس ضمن میں کہتے ہیں :- ؎

اگر شراب خوری جرعۂ فشاں بر خاک
ازاں گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک (الخ)

وزدیوتّای جڑاں سندنت بیگہاں

بادل ، ساون کی گھٹاؤں کی طرح
شام کو چھا جاتے ہیں

بیائنت ہیثران ءَ گوارنت سمّو ءِ پگہاں

اور جب وہ اُمنڈتے اور سمّو کے
علاقہ پر برس پڑتے ہیں ۔

جلتو گندیت آجڑ پاتی جیہر ان

تو سمّو اپنے خیمے سے باہر کھڑی ہو کر
بادلوں سے مینہ کی دھار گرتے
دیکھتی ہے ۔

پول کنت سمّو مست ءِ شہ نود ءِ جیہراں

سمّو ، مینہ کی ان جھڑیوں سے
مست کا حال پوچھتی ہے ۔

شما گنوک مست ءَ رانزلیت سندھ چرگان

باولو !
کیا تم نے اس دیوانہ مست کو
سندھ میں گھومتے پھرتے کہیں نہیں دیکھا؟

دِل گنوک انت کہ مست ءَ سمّوءِ ناشی ئا ارگمان

میرا دل دیوانہ ہے ۔
جو مست کی یاد کو ابتک اپنی آغوش
میں لئے ہوئے ہے "

پے جواب چرینیت ہماؤ شبوئیں ھُلان

ہماری طرف سے
مینہ کی وہ پر مہک جھڑیاں اسے جواب
دیتی ہیں ۔

نیمو سنبھلے کشتہ اش دیریں جلکہاں

"سمّو ! کیا تجھے اب اس کا خیال آیا ہے
جب کہ اُسے یہاں سے بہت دُور کے
علاقوں میں نکال دیا گیا ہے ۔

مان شُشتہ پھوڈاں شہ پھوادانی پنگھراں	جہاں وُہ کرہ پھواد کی طینڈیوں پر سے گذر کر چلا گیا ہے!"
دستی لبستنت دو اتنی ھبنویں سلام	تب سمّو، بادلوں کے ساتھ اپنا دلنواز سلام ہاتھ باندھ کر ہیں بھیجتی ہے۔

سمّو نے ۱۸۸۰ء کو رمضان کے مہینے میں وفات پائی۔ اس کی وفات کی خبر مست کو کیسے ملی یہ راویوں سے سنئیے جو اسے توکلی مست کی جذب و وجدان کی تیز بینی و دُور رسی کی ایک نادر مثال سمجھتے ہیں:۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جب توکلی مست اپنے کچھ اور شیدائیوں کے ساتھ کاہان سے ممبار ٹکی کی طرف جارہا تھا کہ اچانک اس پر ایک بیقراری کی سی کیفیت طاری ہوگئی پھر اُس نے مڑکر اپنے ساتھیوں سے کہا "میں جارہا ہوں، تم سب لوگ سمّو کے گھر آجاؤ۔" یہ کہہ کر تیز تیز قدم بڑھاکر مست چل پڑا۔ وُہ ایسا تیز جارہا تھا کہ تھوڑی دیر میں اپنے ساتھیوں کی نظروں سے غائب ہوگیا۔

مست کے ساتھی جب سمّو کے خیمے کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ وہاں ایک کہرام مچا ہُوا ہے۔ پھروئی طائفہ کے لوگ جمع ہیں۔ سمّو مرچکی ہے اور مست کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی اُسے دفن بھی کر دیا گیا ہے۔ مست سمّو کی قبر کے پاس کھڑا ہے اور اس کے خاوند اور دوسرے خویش واقارب سے تقاضا کر رہا ہے کہ انہوں نے اس کی اجازت کے بغیر سمّو کو یہاں دفن کیوں کیا۔ بالآخر جب مست کی حالت غیر ہونے لگی تو سمّو کے خاوند نے دست بستہ ہو کر اس سے کہا کہ مست سائیں! ہم سے

غلطی ہوئی۔ اب جہاں آپ کہیں ہم اسے یہاں سے نکال کر دوبارہ وہاں لے جاکر دفن کردیں گے۔ توکلی مست خاموش ہوگیا۔ کافی دیر تک ایک عالم محویت میں دُنیاو مافیہا سے بے خبر وہاں کھڑا رہا۔ لوگ حیران و پریشان اس کے آس پاس کھڑے اس کی یہ کیفیت دیکھتے رہے، تاآنکہ اس نے سر اُٹھا کر کہا کہ ہم نے سمّو کی مرضی دریافت کرلی۔ اس کی خواہش ہے کہ اب اسے یہاں پہ رہنے دیا جائے اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ہر جمعہ کی رات کو وُہ مجھ سے ملاقات کیا کرے گی۔ اس لئے اب سمّو کی قبر کے سامنے میرے لئے ایک حجرہ تعمیر کرادو تاکہ ہر جمعہ کی رات کو میں یہاں آکر سمّو سے مل سکوں۔"

پھر قبائلی طائفہ کے لوگوں نے مست کے حکم کی تعمیل کی اور سمّو کی قبر کے پاس توکلی کے لئے مٹی کی دیواروں کا ایک حجرہ تعمیر کردیا۔ جواب تک موجود ہے۔ ممارٹر کے میدان میں وُہ جگہ جہاں توکلی مست کا دوست سمّو دفن ہے اب "سمّو پٹی" یعنی سمّو کا میدان کہلاتی ہے۔

لکھتے ہیں کہ سمّو کی موت کے بعد مست کی زندگی بے کیف ہوکر رہ گئی۔ اس کا تڑپتا ہوا دل مرجھا گیا۔ اب اس میں کوئی تڑپ باقی نہیں رہی۔ وُہ خاموش اور حالت استغراق میں کئی کئی دن سمّو کی قبر پر اس حجرے میں پڑا رہتا۔ اس کا وہ شوق صحرانوردی وُہ جنون آبلہ پائی کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اگر حجرے سے کبھی باہر نکلتا تو پہاڑوں پر سے چھوٹے چھوٹے رنگین اور گول پتھر جمع کرلاتا۔ اور انہیں قرینے سے سمّو کی قبر پہ سجا دیتا۔ وُہ مملکت ہندوستان کے شاہجہان تو نہ تھے کہ اپنے دوست کی قبر پہ دوسرا تاج محل تعمیر کرا دیتے ایک درویش تھے جس کے پاس بلوچستان کے اس بے آب و گیاہ اور جھلسے ہوئے کوہستان میں ان پتھروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ پتھر اُسے بہت عزیز تھے، اسی لئے تو وُہ انہیں چُن چُن کر اپنے دوست

کی قبر پہ رکھتا، سجاتا اور کیف و مستی میں ڈوب کر انہیں بوسہ دیتا۔ اس لوح پر قلندر کا بس یہی ایک انمول تحفہ تھا۔ سرزمینِ وطن کے یہی رنگیلے پتھر تھے جو سمّو کے بعد اُسے عزیز تھے، جن کو وہ اپنے دوست سے والہانہ اظہارِ محبت کے ثبوت میں پیش کر سکتا تھا۔ یا پھر بلوچی زبان کے وہ پُرسوز اشعار کے گراں بہا موتی تھے جو سمّو کے دردِ فراق میں دن رات اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر زبان پہ آتے اور پھر سمّو کی قبر پہ بکھر جاتے تھے، اور جنہیں زائرین چن چن کر بلوچستان کے طول و عرض میں پھیلا دیتے تھے، اپنے ان ہی اشعار میں ایک جگہ سمّو کی یاد میں کہتا ہے ؎

کہکراں لاکڑ ئبگ دلشتامی جڑان	ساون کی گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں گرج بھی ان کے ساتھ ہے۔ اس لیئے تو
گون بنت گرندہ ئیشرنت چادرئی گدگان	وہ بگولے کی طرح اُمنڈ رہے ہیں خدا کرے کہ میرا دوست
دوست ءُ پہریزیت کنت سارسیری مُتہان	اپنے ٹھنڈے سائبان عروسی میں ان سے محفوظ ہو۔
حالورے ملکان داتگ عرشی پرشتگاں	ان بادلوں کے ذریعے، عرش کے فرشتوں
سمّو گوں حیران نشتہ مں طوبا ءِ بُن ءَ	اور ملائکہ نے مجھے خبر دی ہے کہ سمّو درخت طوبیٰ کے سائے میں
کوثر ءِ آپاں نوش کنت میر ءِ پیالہ ءَ	

پیالے پیرُا ایرت پہ مست ءُ نیت ءَ — آب کوثر نوش کرتی ہے ،
اس کے پاس نور کا ایک پیالہ
مست کے لئے بھی رکھا ہُوا ہے

کچھ عرصہ بعد توکلی کی حالت پھر سدھر گئی۔ سمّو کی موت کا سانحہ گذر گیا اور اب پھر اُسے گھومنے پھرنے کا شوق پیدا ہُوا الذت صحرا نوردی نے پھر اُس کے دامن دل کو کھینچا، پھر وہی مست اور وہی بلوچستان کے پہاڑ اور وادیاں آتش بجان اور نوحہ کناں ہوئیں اس طرح گھومتے پھرتے مست سندھ جا پہنچا اور پھر کئی سال وہاں بھٹکتا رہا۔ مگر اُسے سمّو کا ثانی نہیں ملا۔ چنانچہ کہتا ہے ؛ ؎

مست مروچی گو لگنت سندھ ءِ حلکان — مست آج سندھ کے علاقوں میں
تجھے ڈھونڈتا پھرتا ہے ،
گوگلی سندھ ءَ — سندھ میں تجھے ڈھونڈتا ہے مگر
بلے ، سمّو اتئی بدل پیداک نہ بیت — سمّو تیرا بدل اُسے نہیں ملتا۔

کہتے ہیں کہ اب توکلی کے سر پر پگڑی نہیں ہوتی تھی۔ ننگے سر پھرا کرتا تھا ایک دفعہ کسی شناسا نے اس سے پوچھا کہ وہ پگڑی کیوں نہیں پہنتا۔ بلوچ ننگے سر نہیں پھرا کرتے تو مست نے اسے جواب دیا : ؎

سمّو ءِ بیلی چون کنت پاگ ءَ — سمّو کا ساتھی بھلا پگڑی کو کیا کریگا
پاگی من پراّئی سر ءَ رنیزہ بیت — پگڑی وحشی کے سر پر رسّی بن جائے گی
اور پھندا بن کر اس کی گردن میں پڑیگی
جسی من ریشاں دل گرنت سیاہیں — پگڑی کا میل اس کی کالی ڈاڑھی کو

میلا کرے گا۔

ایک مدت تک سندھ میں گھومنے پھرنے کے بعد مست اپنے علاقے میں جب واپس آیا۔ تو سیدھا سمو کی قیامگاہ پر گیا۔ لیکن سمو اب وہاں کہاں تھی چنانچہ سندھ کی طرف اپنے سفر کا ذکر کرتے ہوئے ارمان بھرے دل سے کہتا ہے:-

	میں نے چاہا
اُوڑ گھمیاں پیچے سمو پدرو خم ئے	کہ وہاں سے سمو کی شکل وشباہت
اُوڑ ھوکلان	والی۔ ایک حسینہ منتخب کروں
	میں ہر چند وہاں ڈھونڈتا رہا
بے سمو ہدل پیدا کہ نہ بیت	مگر سمو کا ثانی مجھے نہ مل سکا
	سمو ایسی اچھی تھی
سمو چو شرت چو سمینانی کھلان	جیسے نسیم سحر کے جھونکے
	سمو کی خوشبو ایسی تھی
سمو دشبوت چو گوز نگھیں نورانی ہزان	جیسے بارش کے بعد زمین کی مہک
	میں وہاں (سندھ) سے واپس آتا ہوں
من پدا گرداں کہ سمو ءِ احوال ئے گراں	کہ سمو کا حال معلوم کروں
	اور سمو کے پتھروں کے چبوترے کو
سمو ءِ کوھیں باندھو ءِ جاتیے کہناں	جھانک کر دیکھوں
	مگر، ہائے افسوس!
گارانت سمو وایرنتھا دستانی نشان	سمو تو غائب ہو چکی ہے۔
	صرف اس کے

ہاتھوں کے چھوڑے ہوئے نشان
باقی ہیں ۔

اب مست کا دل بھر آتا ہے ۔ سمو کی قبر پر بیٹھ کر وہ فریاد کرتا ہے کہ :-

زار ہاں منی تو رسے بَرَانی مُرید !

ھنچشاں من چو، تو پہ ھانی ءِ زھیر

چون ءِ تُنیگاں من ھپت دریا سیر آزمایاں

چا ھتاں گوں گمان، شگلان گور ءِ الار یریں

لے بیابانوں میں گھومنے والا مُرید[1] !
میری فریاد سُن
اور میری مدد کو پہنچ جا
میں بھی (سمو کے لئے) ایسا ہی تڑپ رہا ہوں
جیسے تم پانی کے لئے ترستے اور تڑپتے ہو ۔
میں ایسا پیاسا ہوں کہ
اگر سات سمندروں کا تمام پانی مجھے پلا دیا جائے
تو بھی، میری پیاس بجھ نہیں سکے گی
کنوؤں کو گھونٹ گھونٹ کرکے
اور مشکیزوں کو سالم پیٹ میں ڈال کر بھی

۱؎ مرید ھانی کا عاشق ۔

سمّی بودستاں ہن یک چلوئے سیرآبیان

میری پیاس نہیں بجھے گی ۔
ہاں ، اگر سمّو کے ہاتھ سے
مجھے چلّو بھر پانی بھی مل جائے
تو میں سیراب ہو جاؤں گا ۔

سمّو کی موت کے بعد اگرچہ توکلی مست پندرہ سال اور بھی زندہ رہا ۔ لیکن اب اس میں وہ ولولہ اور تڑپ باقی نہیں رہی تھی جو سمّو کی زندگی میں تھی کچھ عرصہ تو اس نے اپنے علاقے سے باہر جانا چھوڑ دیا ۔ کئی کئی دن سمّو کی قبر پر حجرے میں پڑا رہتا ۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی بلوچ گویا ادھر سے نکل جاتا اور تھوڑی دیر کے لئے مست کی زیارت کو رُک جاتا ، سمّو کے فراق میں اس کے کہے ہوئے اشعار سناتا ۔ تو مست مسکرا کر کہتا کہ ہاں ! ہاں ! میرے یہ دکھ بھرے اشعار ایک دفعہ پھر سناؤ ! سمّو انہیں سن رہی ہے ۔ اسطرح گویوں سے اپنے اشعار ترنم سے سن کر مست اپنی یادوں کی دنیا میں کھو جاتا ۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی لگ جاتی ۔

روایت ہے کہ ایکدفعہ نواب جمال خان لغاری نے اپنے آدمی بھیج کر مست کو ڈیرہ غازیخان آنے کی دعوت دی ۔ اس کی سواری کے لئے ایک اصیل گھوڑی بھی بھیج دی ۔ مست نے نواب کی دعوت تو قبول کر لی لیکن گھوڑی پر چڑھنے سے انکار کر دیا ۔ آخر جب نواب کے آدمیوں نے اُس سے وجہ پوچھی تو مست نے کہا کہ سمّو بیلی ، گھوڑی پر سوار نہیں ہو گا ۔ کیونکہ سمّو نے اپنی زندگی میں اُسے ہمیشہ پیدل چلتے دیکھا ہے ۔ اس کے نقش قدم اُسے نظر آتے رہے ہیں اس لئے اب بھی وہ سمّو کی قبر سے پیدل ہی روانہ ہو گا ۔ تاکہ سمّو اس کے نقش قدم

دیکھ سکے ۔

۱۸۹۵ء میں ایک دفعہ جب توکلی مست کنوٹ منڈائی سے پھٹرہ پہنچا ۔ تو اچانک اس کی طبیعت خراب ہوگئی ۔ اس نے ڈیوا خان سے جس کے ہاں وہ مہمان ٹھہرا ہوا تھا کہا کہ اس کے شیرانی طائفہ کو اطلاع دے کر آکر اسے اپنے ہاں لے جائیں ۔ شیرانیوں کو اطلاع ہوئی تو ان کے کئی آدمی پھٹرہ پہنچے ۔ انہوں نے مست کو بیمار حالت میں پایا ۔ مست کو بھی اپنی شمع زیست کے جلد گل ہو جانے کا احساس تھا ۔ اس نے اپنے طائفہ والوں سے کہا کہ اُسے اُٹھا کر اپنے ہاں لے جائیں ۔ اس سے لوگوں کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ اُسے چارپائی پر ڈال کر کندھوں پر اُٹھا لیا ۔ جب وہ مغرب کی طرف سے کوھلو سے چودہ میل کے فاصلے پر ایک ندی میں پہنچے تو مست نے انہیں چارپائی زمین پر رکھ دینے کو کہا جب چارپائی زمین پر رکھ دی گئی تو مست نے کہا کہ اب اسے چارپائی سے اٹھا کر زمین پر رکھ دیں ۔ زمین پر بستر بچھا کر جب اُسے لٹا دیا گیا تو اُس نے اُن لوگوں سے کہا کہ اب جا کر اپنے لئے کھانا پکائیں ۔ اور جب تک وہ نہ بلائے کوئی اس کے پاس نہ آئے ۔

غرضیکہ مری کھانا پکانے میں لگ گئے ۔ جب کھا پی کر فارغ ہوئے اور چلنے کی تیاری کر کے مست کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ اسی طرح پرسکون حالت میں لیٹے ٹانگ پر ٹانگ لگائے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکا ہے ۔ اس وقت توکلی مست کی عمر ستر برس کی تھی ۔

مریوں نے اپنے قبیلے کے سردار مہراللہ خان کو اسی دن توکلی مست کی وفات کی اطلاع دیدی دوسرے دن سینکڑوں گھڑ سواروں کے ساتھ سردار مہراللہ خان خود وہاں پہنچا ۔ توکلی مست کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور وہیں

انہی ندی سے کچھ فاصلے پر گری کے میدان میں اسے سپردِ خاک کیا گیا ۔ اسطرح بلوچستان کا یہ مایہ ناز فرزند، دربیابان شاعر، سمو کا عاشق زار ۔ جامِ عشق سے مست والست درویش اور باطنی قوت سے سرشار فقیر اپنے لافانی اشعار کا ایک بیش بہا سرمایہ ، بلوچ قوم کے لیے چھوڑ کر راہئ ملک عدم ہوا ۔

توکلی مست کی قبر آج زیارتگاہ خلائق ہے ۔ ہر سال ہزاروں زائرین بلوچستان کے دور و دراز گوشوں سے اس کی قبر پر حاضری دیتے اور اپنے خلوص و عقیدت کا والہانہ اظہار کرتے اور مست کی زبان میں چاہتے ہیں کہ

دے منی کیپاں بیوان ءِ ھر گوشیں پکیر	اے بیابان میں رہنے والے لمبے کانوں والے درویش مجھے بھی مہی جام پلا دے جسے پی کر میں بھی کیف و مستی سے سرشار ہو کر سمو کی یادوں سے غافل ہو جاؤں
نوش کناں کیپاں ۔ ایر کناں سمو ءِ زہیر	